﴿حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ علی ندوی﴾

(حصہ اول)

مرتب

محمد کاظم ندوی

ملنے کا پتہ

۲۲۱۰۷

﴿اگست ۲۰۰۱ء﴾

نام کتاب ——— مقالاتِ مفکرِ اسلام

کمپیوٹر کمپوزنگ ——— مسرور احمد ندوی

طباعت ——— شاذیہ آفسیٹ لکھنؤ

قیمت ———

باہتمام

مکتبہ ندویہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکتبہ الفرقان نظیر آباد لکھنؤ

مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ

مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ

مکتبہ البدر کاکوری لکھنؤ

مکتبہ حرمین کچہری روڈ لکھنؤ

دارالاشاعت اسلامیہ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

مکتبہ نعیمیہ دیوبند ضلع سہارن پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر ۵
عرضِ مؤلف ۹
پیش لفظ (حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی) ۱۳
صاحبِ مقالات ایک نظر میں ۱۷
نبوت کا کارنامہ ۲۵
اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب ۴۳
تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ ۷۳
علم کا مقام اور اہلِ علم کی ذمہ داریاں ۱۳۱
بصائر ۱۴۵
پندرہویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں
ایک تبصرہ، ایک جائزہ، ایک پیغام ۱۹۵
قادیانیت کا ظہور، اس کا دعویٰ اور دعوت
اور اس کے مؤید و سرپرست ۲۴۷
طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں ۲۷۳
انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار ۳۱۱
مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں ۳۲۹

کچھ کفر نے فتنے پھیلائے کچھ ظلم نے شعلے بھڑکائے
سینوں میں عداوت جاگ اٹھی انسان سے انساں ٹکرائے
پامال کیا برباد کیا کمزور کو طاقت والوں نے
جب ظلم و ستم حد سے گزرے تشریف محمدؐ لے آئے
رحمت کی گھٹائیں لہرائیں ، دنیا کی امیدیں بر آئیں
اکرام و عطا کی بارش کی ، اخلاق کے موتی برسائے
تہذیب کی شمعیں روشن کیں، اونٹوں کے چرانے والوں نے
کانٹوں کو گلوں کی قیمت دی ذرّوں کے مقدر چمکائے
اللہ سے رشتہ کو جوڑا، باطل کے طلسموں کو توڑا
خود وقت کے دھارے کو موڑا طوفاں میں سفینے تیرائے
تلوار بھی دی، قرآں بھی دیا ، دنیا بھی عطا کی عقبیٰ بھی
مرنے کو شہادت فرمایا جینے کے طریقے سمجھائے
مکہ کی زمیں اور عرش کہاں دم بھر میں کہاں پل بھر میں کہاں
پتھر کو عطا کی گویائی اور چاند کے ٹکڑے فرمائے
عورت کو حیا کی چادر دی غیرت کا غازہ بھی بخشا
شیشوں میں نزاکت پیدا کی کردار کے جوہر چمکائے
اے نام محمدؐ صلِّ علیٰ ماہرؔ کے لئے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے
(ماہرؔ القادری)

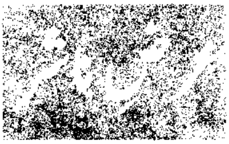

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں ہے، حضرت کی ذات گرامی اپنی حیات ہی میں عوام وخواص کے لئے مینارۂ نور اور رشد وہدایت کا ایک بلند ترین ستون تھا۔ حضرت نے خود ہی اپنی خودنوشت سوانح متعدد حصوں میں لکھ کر اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو اجاگر کر دیا تھا، حضرت کی زندگی کے جو گوشے عوام وخواص کے لئے پردۂ خفا میں رہ گئے تھے، بس مرگ ان کو آپ کے جانشینوں، معاصرین، احباب، معاونین، شاگردوں اور آپ سے تعلق رکھنے والوں نے طشت ازبام کر دیا۔ خصوصیت کے ساتھ آپ کی ذات عالی مرتبت پر لکھی گئی کتاب "میر کارواں" از قلم حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی دام مجدہ ناظم تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تو ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں خود بقول مصنف، مفکرؒ اسلام حضرت مولانا کی زندگی کے ان واقعات واحوال وکوائف کو نوکِ قلم سے آشنا کیا گیا ہے، جن کو حضرت نے اپنی منکسر المزاجی یا

فروتنی کے باعث لکھنا مناسب نہ سمجھا۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا علیؒ میاں ندوی کے نام نامی واسمِ گرامی پر مختلف علمی، تحقیقی، تکنیکی ادارے، مدرسے، دار العلوم، لائبریریاں اور ہاسپٹل وغیرہ قائم ہورہے ہیں، جو اس بات پر شاہد ہیں کہ حضرت کی ذات گرامی اپنے تشخص علمی وعمل کی وجہ سے ممتاز ہے۔

مولانا [illegible] کاکوری، لکھنؤ کا قیام بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے۔ انشاء اللہ اس ادارہ سے خود مفکرؒ اسلام کے بعض تبرکات، ہندوبیرون ہند کے انشا پردازوں، علماء، فضلاء، ادباء اور مشاہیر کی ادبی وفکری شاہکار تحریریں وتقریریں اور مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے عوام وخواص کی خدمت میں پیش کئے جاتے رہیں گے، تاکہ ایک طرف دین حنیف کی خدمت ہو تو دوسری طرف اپنے بڑوں اور اہل علم کی قیمتی تحقیقات وتبرکات دوسروں تک پہنچ سکیں۔

مولانا [illegible] کی مطبوعات کی اشاعت کا آغاز مفکرؒ اسلام ہی کے گراں قدر اور بیش بہا مقالات کے مجموعہ "[illegible]" حضرت مولانا سید ابوالحسن علیؒ میاں ندوی سے کیا جارہا ہے۔ خدام ادارہ کی کوشش یہی ہے کہ یہ کتاب کتابت وطباعت کے اعتبار سے معیاری اور خوب سے خوب تر ہو۔ پھر بھی کتابت کی غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے، اگر اس کتاب میں کسی قسم کی کوئی خامی نظر آئے تو قارئین سے التماس ہے کہ وہ ادارہ کے خدام کو مطلع فرمائیں گے، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی صحت کی جانب توجہ کی جاسکے۔

مولانا "علی میاں اکادمی" کے خدام کا مطمحِ نظر یہ بھی ہے کہ یہ ادارہ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے میدان میں ایک سنگ میل ثابت ہو۔ تاکہ اس کی مطبوعات انفرادیت کا مظہر ہوں۔

خدا کرے یہ کتاب علمی حلقوں میں قبولیت حاصل کرے۔ اور مصنف و مؤلف کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔

مورخہ — والسلام

۲۷/جون ۲۰۰۱ء

مطابق

۶/ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ — منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خالق کائنات کا بے حد کرم واحسان ہے کہ اس نے علم وادب کے اس ادنیٰ طالب علم کو مفکر اسلام، استاذالاساتذہ مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نصف صدی پر پھیلے ہوئے خطبات ومقالات کو جمع کرنے اور اسکو ترتیب دے کر زیور طبع سے آراستہ کرنے کی توفیق وسعادت عطا کی۔ اس کے لئے خلاقِ ازل کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے۔

جہاں تک حضرتؒ کے [illegible] کا تعلق ہے، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ناچیز مرتب اسکی چار جلدیں مرتب کر کے قارئین کی نذر کر چکا ہے۔ مزید جلدیں اپنے وقت پر زیور طبع سے آراستہ وپیراستہ ہو کر منصۂ وجود پر جلوہ گر ہوتی رہیں گی، اس جگہ یہ بات ذکر کر دینے کے قابل ہے کہ "خطبات مفکر اسلام" کی جلد اول حضرتؒ کی زندگی ہی میں چھپ کر منظر عام پر آگئی تھی اور حضرت نے جلد اول کی رسم اجرا کی خدمت اپنے

ہاتھوں انجام دیکر ناچیز مؤلف کو ممنون کیا تھا۔ ان سب باتوں کی تفصیلات خطبات کی مختلف جلدوں کے ابتدائی صفحات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس وقت اسکی تفصیلات پیش کرنے کا موقع نہیں۔

جہاں تک مفکر اسلام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے
کا تعلق ہے تو حسب وعدہ

کی جلد اول علم وادب کے قدردانوں کی خدمت میں اس توقع پر پیش کی جارہی ہے کہ قدرداں احباب حضرت کی قیمتی تحریروں سے بقدر ظرف استفادہ کریں گے، اور دوسروں کو اس سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت کے اس تحریری پیغام سے دوسروں کو فیض پہنچانے کی بھر پور سعی اور جدوجہد کریں گے، تاکہ حضرت کا پیغام عام ہو سکے۔ اور اس سے دعوت و تبلیغ کی راہیں کھل سکیں۔ اس سے مسلمانوں اور انسانیت کا درد رکھنے والے انسانوں میں انسانیت کی خدمت کی صفات پیدا ہوں گی۔ اور وہ اس طرح سے انسانیت کی بھر پور خدمت کر سکیں گے۔ اس کتاب کی اگلی جلدیں بھی وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتی رہیں گی۔ انشاء اللہ۔

ممنون و مشکور ہوں مفکر اسلام حضرتؒ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سفر و حضر کے پچاس سالہ دیرینہ رفیق و خادم اور محبوب شاگرد رشید استاذ گرامی حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی دام مجدہ مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و ایڈیٹر ماہنامہ "البعث الاسلامی" ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کہ انہوں نے میری خواہش و اصرار پر اس گراں قدر کتاب کے لئے ایک بیش بہا "تحریر" عنایت فرمائی جو "پیش لفظ" کے عنوان سے اس کتاب کی

زینت وزیبائش میں اضافہ کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سایہ کو ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے تاکہ ہم آپکی صلاحیتوں، قابلیتوں اور لیاقتوں سے اخیر دم تک استفادہ کرتے رہیں۔

اس جگہ اس حقیقت کا اظہار کردینا بھی مناسب ہے کہ اس کتاب کی ترتیب وجمع اور اسکی اشاعت سے دنیاوی منافع میں سے کسی نفع کا حصول مقصود ومطلوب نہیں ہے۔ بلکہ مفکرِ اسلام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پیغام محبت کو عام کرنا اور اسکو دنیائے انسانیت تک پہنچانا ہے۔ دلوں کے بھید اور راز کو خدا ہی جانتا ہے جو علیم وخبیر ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت کی دولت سے مالامال کرے اور صاحب مقالات نیز مؤلف کو اس کا اجر جزیل عنایت کرے۔ اور بس!

خادم علم وادب

[illegible]

ناظم

[illegible]

۱۵/ جولائی ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

﴿از قلم۔ حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب الاعظمی الندوی﴾
(مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات جو مُر تجلاً مختلف مواقع پر ارشاد فرمایا کرتے تھے، اور موقع کی مناسبت سے ان میں ایسے مواد جمع فرما دیتے تھے، کہ ان کو سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، یعنی دل آویزی میں بے مثال جب یہ تقریریں چھپ کر لوگوں کے سامنے آتی تھیں، تو ان میں مزید تاثیر کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، برجستہ تقریروں کو ریکارڈ کرنے والے ہر جگہ موجود رہتے تھے، اور وہ نقل ہو کر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہونچتی تھیں، تو وہ نقل کرنے کی خامیوں کو دور کر دیتے اور بعض اوقات ان میں خفیف اصلاح و ترمیم بھی فرمایا کرتے تھے۔

ان تقریروں کا مجموعہ محب عزیز و مکرم جناب مولانا محمد کاظم ندوی صاحب

نے اب تک چار جلدوں میں شائع کیا ہے، اور وہ ہر طبقے میں بے حد مقبول ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انہوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے "[illegible]" کو جو انہوں نے نہایت اہم مواقع پر سپرد قلم فرمائے تھے، اور جن کی ایک عظیم تاریخ اور دستاویزی حیثیت ہے، شائع کر رہے ہیں، ان [illegible] میں بھی [illegible] ہی کی طرح روحِ علم اور سوزِ دروں کا حسین امتزاج موجود ہے، اور ان میں ان کے بے چین دِل اور ان کی فکر ارجمند اور ان کے تعلق باللہ، ان کے اخلاص اور بے لوثی کا ایک صاف شفاف آئینہ موجود ہے، جس میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے، اور اپنے چہرے کو خوبصورت بنانے کے طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ ان کے ہر جملے کے تمام حرف موتیوں سے تولنے کے قابل ہیں، ان کی وسعتِ معلومات، گہرائی وگیرائی اور سوچنے کا وہ صحیح انداز اس قدر ان مضامین پر چھایا ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر کس قدر انعام تھا، اور کتنی سچی اسلامی فکر، انتہائی توازن اور اعتدال کے ساتھ پیش کرنے کا ملکہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، کوئی بات اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے سرچشمۂ ہدایت کتاب وسنت سے ہٹ کر نہیں ہوتی، اسلامی تاریخ کے ایسے ایسے موثر اور مستند واقعات تحریر فرمائے جن تک بہت سے مورخینِ عظام کی نظر بھی نہیں گئی تھی، اور ان واقعات سے عبرت وموعظت کے وہ دریچے کھلے جو علماءِ حق اور داعیانِ اسلام کے لئے ایک مستند مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ایمان ویقین، علم وعشق اور اسلامی زندگی سے نوازا تھا، ان پر ہمیشہ اس فکر کا غلبہ رہا اور وہ فکر ان کو بے چین رکھتی تھی، کہ اللہ کے بندوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا یقین کس طرح اتار اجائے، محمد عربی ﷺ کے امتیوں کو اور ان کی عرب اولاد کو کس طرح ان کے احسانات سے روشناس

کرلیا جائے، تاکہ وہ ان کے پیغام کو سینے سے لگا کر دنیا کی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں، اور عالم کے اندر پھیلے ہوئے بگاڑ اور انسانیت کو سر بازار رُسوا کرنے والے حالات سے مصالحت کرنے والے انسانوں کو اپنے صحیح مقام پر واپس لائیں، اور انسانوں کو انسان بنانے والے کام کریں۔

علم وعمل اور اخلاق وایمان کی جامعیت اور ان میں انتہائی توازن کی صفت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر تھی، ان کا ہر لمحہ، ہر عمل، ہر بات اور ہر سانس اللہ کی رَضا اور ان کے دین کی سربلندی اور امت کی سُرخروئی کے لئے وقف تھا، حالات خواہ جیسے بھی ہوں، اظہارِ حق میں کبھی بھی پس وپیش نہیں کیا اور وہی بات کہی، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عین منشاء کے مطابق ہو۔

یہ اور اس طرح کے جملہ افکار وارشادات اور معلومات وحقائق ان میں پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

محب مکرم مولانا محمد کاظم صاحب ندوی استاذ وناظم کاکوری لکھنؤ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے ایک اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین، خطبات ومقالات کو یکجا کر کے شائع کرنے کی ذمہ داری لی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو توفیقِ کامل اور اس عمل پر اجرِ عظیم عطا فرمائیں، آمین۔

۵ / جمادی الأولیٰ ۱۴۲۲ء

۲۷/ جولائی ۲۰۰۱ء ایڈیٹر

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

”میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتادینا چاہتا ہوں، کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں، جو دین اور سیاست کی تفریق کے قائل ہیں، نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچے میں (خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو) فِٹ ہو جائے، اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے، اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے، جو سیاست کو قرآن کے شجرۂ ملعونہ ــ الشَّجَرَةُ الملْعونَةُ فِيْ القُرآنِ ــ کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں، جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں، اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں، میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں۔ اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا۔

صاحبِ مقالات

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن ؒ علی ندوی

ایک نظر میں

ولادت:

☆ ۶/ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) بمقام تکیہ کلاں رائے بریلی۔

تعلیم:

☆ تعلیم کا آغاز والدہ محترمہ سے قرآن مجید سے ہوا، پھر اردو اور عربی کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۳۱۴ھ (۱۹۲۳ء) میں والد صاحب حکیم سید عبدالحیٔ صاحب کا انتقال ہوا، اس وقت آپ کی عمر نو سال سے کچھ اوپر تھی تو تعلیم وتربیت کی ذمہ داری آپ کی والدہ محترمہ اور برادر بزرگ مولانا حکیم سید عبدالعلی حسنیؒ پر آپڑی جو خود بھی اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے۔

☆ ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۴ء) میں علامہ خلیل عرب سے باقاعدہ عربی تعلیم کا

آغاز کیا اور اصلاً انہیں کی تربیت میں عربی تعلیم مکمل کی۔

☆ ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۶ء منعقدہ کانپور میں شرکت کی اور اپنی عربی بول چال سے شرکاء کو محظوظ کیا، جس کی وجہ سے بعض عرب مہمانوں نے اپنے گھومنے پھرنے میں بطور رہبر مولانا کو ساتھ رکھا۔

☆ ۱۹۲۷ء میں لکھنو یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اس وقت مولانا یونیورسٹی کے سب سے کم بن طالب علم تھے۔ یونیورسٹی سے فاضل ادب کی سَنَد حاصل کی۔

☆ عربی زبان کی تعلیم کے دنوں میں اردو کے ادب عالی کی چوٹی کی کتابوں کا مطالعہ کیا جس سے مولانا کو دعوت کے کام کی انجام دہی اور عصری زبان و تعبیر میں صحیح اسلامی فکر و عقیدہ کی تشریح میں مدد ملی۔

☆ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان انگریزی زبان کے سیکھنے کی بھی مشغولیت رہی، جس کی وجہ سے اسلامی موضوعات اور عربی تہذیب و تاریخ وغیرہ پر انگریزی کی کتب سے مولانا کے لئے براہِ راست استفادہ ممکن و آسان ہوا۔

☆ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور علامہ محدث حیدر حسنؒ خاں صاحب کے درسِ حدیث میں شریک ہوئے اور ان سے "صحیحین" اور "سنن ابی داوٗد" اور "سنن ترمذی" حرفاً حرفاً پڑھی۔

☆ اپنے شیخ خلیلؒ انصاری سے منتخب سورتوں کی تفسیر کا درس لیا اور مولانا احمد علیؒ صاحب لاہوری سے ان کے ترتیب دادہ نظام کے مطابق ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں لاہور میں مقیم رہ کر پورے قرآن کریم کی

تفسیر پڑھی۔

☆ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کے لئے ۱۹۳۲ء میں چند ماہ دار العلوم دیوبند میں قیام کیا اور صحیح بخاری و سنن ترمذی کے اسباق میں شریک ہوئے اور ان سے تفسیر و علوم قرآن میں بھی استفادہ کیا، نیز شیخ مولانا اعزاز علیؒ صاحب سے فقہ کا اور قاری اصغر علیؒ صاحب سے روایت حفص کے مطابق تجوید کا درس لیا۔

علمی ودعوتی زندگی

☆ ۱۹۳۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس بنائے گئے اور تفسیر وحدیث اور ادب عربی و تاریخ و منطق کا درس دیا۔

☆ ۱۹۳۹ء میں دینی مراکز سے واقفیت کیلئے ایک سفر کیا جس میں شیخ عبد القادرؒ رائے پوری اور مصلح کبیر مولانا محمد الیاسؒ صاحب کاندھلوی سے واقفیت حاصل ہوئی اور پھر ان سے مستقل ربط و تعلق رہا، چنانچہ اول سے روحانی تربیت حاصل تھی اور دوسرے کی اتباع واقتداء میں فریضۂ دعوت اور معاشرہ کی اصلاح کی انجام دہی کا کام کیا، چنانچہ دعوت وتربیت اور اصلاح کے لئے مسلسل سفر کئے اور ان اسفار کا سلسلہ ایک زمانہ تک جاری رہا۔

☆ انجمن تعلیماتِ دین کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ایک انجمن قائم کی اور اس میں قرآن کریم اور سنت نبویہ کے درس کا سلسلہ جاری کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ خاص طور سے تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ طبقہ بڑی تعداد میں متوجہ ہوا۔

☆ ندوۃ العلماء مجلس انتظامی کے رکن کی حیثیت سے ۱۹۴۵ء میں منتخب کئے گئے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تجویز پر ۱۹۵۱ء میں نائب معتمد تعلیم کی حیثیت سے متعین کئے گئے اور ۱۹۵۴ء میں علامہ کی وفات کے بعد بحیثیت معتمد قرار پائے اور ۱۹۶۱ء میں برادر بزرگ ڈاکٹر عبد العلیؒ حسنی صاحب کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ بنائے گئے۔

☆ ۱۹۵۱ء میں تحریکِ پیامِ انسانیت کی بنیاد ڈالی۔

☆ ۱۹۵۹ء میں مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام قائم کی۔

☆ عربی میں سب سے پہلا مقالہ سید رشید رضاؒ مصری کے مجلّہ "**المنار**" میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا جو سید احمدؒ شہید کی تحریک کے موضوع پر تھا۔

☆ اردو میں اولین کتاب و تالیف ۱۹۳۸ء میں بعنوان سیرت سید احمد شہید شائع ہوئی جو دینی ودعوتی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

☆ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اسلامیات کے نام سے بی۔اے۔ کے طلباء کے لیے نصاب وکورس مرتب کرنے کے لئے متعین کیا۔

☆ اور جامعہ ملیہ دہلی کی دعوت پر ۱۹۴۲ء میں جامعہ کے اندر ایک لکچر دیا جو بعد میں "دین ومذہب" کے نام سے طبع ہوا۔

☆ ۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں کئی لکچرس دیئے جو "النبوۃ والأنبیاء فی ضوء القرآن" کے نام سے شائع ہوئے۔

☆ ۱۹۶۸ء میں سعودی وزیر تعلیم کی دعوت پر ریاض تشریف لے گئے تاکہ کلیۃ الشریعۃ کے نصاب ونظام کے جائزہ کے کام میں شریک ہوں اور اس موقع سے وہاں "**جامعة الرياض**" اور "**كلية المعلمين**"

میں کئی لکچرس ہوئے۔

☆ ندوۃ العلماء سے عربی میں نکلنے والے پرچے "**الضیاء**" کی ادارت میں ۱۹۳۲ء میں اور اُردو پرچے "**الندوۃ**" کی ادارت میں ۱۹۴۰ء میں شریک رہے اور ۱۹۴۸ء میں "**تعمیر**" کے نام سے بزبان اردو ایک پرچہ نکالنا شروع کیا۔ اور دمشق سے نکلنے والے پرچے "**المسلمون**" کے اداریے کی ذمہ داری ۵۸۔ ۱۹۵۹ء میں متعلق رہی، پہلا اداریہ بعد میں "ردة ولا ابا بكر لها" کے نام سے شائع ہوا، استاذ محبّ الدین خطیب کے پرچے "**الفتح**" میں بہت سے مقالات شائع ہوئے۔

۱۹۶۳ء سے لکھنو سے "**ندائے ملت**" اردو میں نکلنا شروع ہوا تو اس کے شعبۂ ادارت کی نگرانی متعلق رہی اور ندوہ سے ۱۹۵۵ء سے نکلنے والے عربی پرچے "**البعث الاسلامی**" اور ۱۹۵۹ء سے نکلنے والے عربی پرچے "**الرائد**" نیز ۱۹۶۳ء سے نکلنے والے اردو پرچے "**تعمیرِ حیات**" ان تینوں کے نگرانِ عام رہے۔

اسفار

☆ ۱۹۳۹ء میں لاہور کا سفر کیا جو دور دراز کے مقام کا سب سے پہلا سفر تھا وہاں شہر کے علماء وخواص سے ملاقاتیں کیں اور شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبالؒ سے بھی ملے، اس سے پہلے مولانا ان کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کر چکے تھے۔

☆ ۱۹۳۵ء میں بمبئی کا سفر اس غرض سے کیا کہ دلتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دی جا سکے۔

☆ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان کے دینی مراکز سے واقفیت کے لئے ایک سفر کیا۔

☆ ۱۹۴۷ء میں حج کا سفر کیا اور چند ماہ حجاز میں قیام رہا۔ یہ بیرون ملک سب سے پہلا سفر تھا۔

☆ مصر کا پہلا سفر ۱۹۵۱ء میں کیا جبکہ مولانا کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" مولانا سے پہلے ہی وہاں کے تمام علمی حلقوں میں پہونچ کر متعارف ہو چکی تھی، اس لئے وہ خود مولانا کے لئے تعارف کا بہترین ذریعہ بنی۔

☆ فلسطین کا بھی سفر کیا تو بیت المقدس کی زیارت کی اور مسجد اقصیٰ کی بھی اور رمضان کے آخری دن وہیں گذارے۔ اور "مدینۃ الخلیل وبیت اللحم" کی زیارت کی، واپسی میں اردن کے شاہ عبداللہ سے ملاقات کی۔

☆ ۱۹۵۶ء میں ترکی کا سفر کیا اس موقع سے دو ہفتے کا قیام رہا اس کے بعد کئی سفر ہوئے۔

☆ کویت اور دولِ خلیج کا بار بار سفر ہوا۔

رابطۃ العالم الاسلامی کے وفد کی سربراہی میں افغانستان وایران ولبنان

☆ وعراق کا سفر کیا۔

☆ ۱۹۷۶ء میں مغرب اقصیٰ کا سفر ہوا اور برما کا ۱۹۷۰ء میں، جبکہ پاکستان کے اسفار بار بار ہوئے۔

☆ یورپ کا پہلا سفر ۱۹۶۳ء میں ہوا جس میں جنیوا، لندن، پیرس، کیمبرج وآکسفورڈ وغیرہ جانا ہوا اور اسپین کے اہم شہروں میں بھی اس سفر میں

بہت سے عرب اور مغربی فضلاء سے ملاقاتیں رہیں اور کئی لکچرس ہوئے۔ اس سفر کے علاوہ بھی یوروپ کے سفر ہوئے بالخصوص ادھر آکسفورڈ کے اسلامک سنٹر کی وجہ سے بار بار سفر ہوتا رہا۔

☆ ۱۹۷۷ء میں امریکا کا پہلا سفر کیا، اور دوسرا سفر ۱۹۹۳ء میں۔

☆ ۱۹۸۵ء میں بلجیم کا اور ۱۹۸۷ء میں ملیشیا کا سفر ہوا اور ۱۹۹۳ء میں تاشقند و سمرقند وغیرہ کا سفر ہوا۔

اعزازات

☆ دمشق کی "مجمع اللغة العربية" کے مراسلاتی ممبر ۱۹۵۶ء میں قرار پائے۔

☆ رابطة العالم الاسلامی کی تاسیس و قیام کا پہلا اجلاس جو ۱۹۶۲ء میں مکہ مکرمہ میں ہوا جس پر جلالة الملک سعودؒ بن عبد العزیزؒ اور لیبیا کے حاکم ادریسؒ سنوسی بھی شریک تھے، اس اجلاس میں نظامت کے فرائض مولانا نے انجام دیئے۔

☆ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی تاسیس و قیام کے وقت ۱۹۶۳ء سے اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر طے پائے اور اس کا نظام بدلنے تک برابر یہ منصب برقرار رہا۔

☆ رابطة الجامعات الاسلامیہ کے ممبر ابتداء سے رہے۔

☆ اردن کی مجمع اللغة العربیہ کے ۱۹۸۰ء میں رُکن بنائے گئے۔

☆ ۱۹۸۰ء میں اسلام کی خدمات پر فیصل ایوارڈ سے نوازے گئے۔

☆ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۸۱ء میں ادب میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازے گئے۔

☆ آکسفورڈ کے مرکز دراسات اسلامیہ کے ۱۹۸۳ء میں صدر بنائے گئے۔

☆ ۱۹۸۴ء میں رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ کے قیام کے ساتھ اس کے صدر قرار پائے۔

☆ رمضان ۱۴۱۹ھ (جنوری ۱۹۹۹ء) میں دبئی عالمی حسن قرأت کے مقابلہ کے موقع پر سال کی عظیم اسلامی شخصیت کے وقیع ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے جس کی قیمت سوا کروڑ ہندوستانی روپئے کے قریب تھی۔

☆ ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء) میں آکسفورڈ اسلامک سنٹر کی طرف سے تاریخ

☆ دعوت وعزیمت کے سلسلے میں سلطان برونائی ایوارڈ سے نوازے گئے۔

۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء بروز جمعہ بوقت پونے بارہ بجے مفکر اسلام نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

؎ رَب کرے اُن پر نچھاور ہر گھڑی رحمت کے پھول

☆ ۲۰۰۰ء میں پس مرگ مفکر اسلام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی کے ایک موقر علمی ادارہ نے "**شاہ ولی اللہ محدث دہلوی**" ایوارڈ سے سرفراز فرماکر حضرت کی ذاتِ گرامی کو خراج عقیدت اور آپ کی علمی خدمت کو دادِ تحسین دی ہے۔

نبوت کا کارنامہ

یہ مقالہ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۵۹ء کو مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین ہال میں شعبہ
دینیات کی دعوت پر پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نبوت کا کارنامہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی و نبوت کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو انسانوں کی اصلاح و تکمیل پر مامور فرمایا اور ان حضرات نے اپنی دعوت و محنت کا موضوع انسان کو بنایا، انبیاء علیہم السلام کی بصیرت پر اللہ تعالیٰ نے یہ نکتہ فاش کیا کہ اس دنیا کی قسمت اور اس کی آبادی و ویرانی کا فیصلہ انسان پر معلق ہے، اگر حقیقی انسان موجود ہے تو یہ دنیا اپنی سب ویرانیوں اور بے سر و سامانیوں کے ساتھ آباد و معمور ہے اور اگر حقیقی انسان موجود نہیں تو یہ دنیا اپنی ساری رونقوں اور اپنے ساز و سامان کے ساتھ ایک ویرانہ اور خرابہ سے بہتر نہیں، اس دنیا کی بدقسمتی آلات و وسائل کی کمی اور فقدان سے نہیں، بلکہ ان کے غلط استعمال سے ہے، دنیا کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس کو انسان کی غلط اندیشی اور بے راہ روی نے تباہ کیا، آلات و سائل نے اس تباہی اور ہلاکت خیزی میں صرف اضافہ کیا۔

پھر انسان اپنی عظمت، اپنی وسعت، اپنی مرکزیت اور اپنی حکیمانہ صفت کے اعتبار سے کہیں زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو سعی و محنت اور توجہ و خدمت کا موضوع بنایا جائے، یہ کائنات بڑی پر اسرار پر از عجائبات، بڑی حسین و جمیل، بڑی

طویل و عریض ہے لیکن انسان کی فطرت کے اسرار و عجائبات اس کے مخفی خزانوں اور دفینوں، اس کے قلب کی وسعتوں، اس کے دماغ کی بلند پروازیوں، اس کی روح کی بے تابیوں اور گرم جوشیوں، اس کی غیر مختتم تمناؤں اور نا آسودہ حوصلوں، اور اس کی غیر محدود صلاحیتوں کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں، ایسی کئی دنیائیں اس کے قلب کی وسعتوں میں، اور یہ سارے سمندر اس کے دل کی گہرائیوں میں گم ہو جائیں، پہاڑ اس کے یقین کا، آگ اس کی محبت کے سوز کا، سمندر اس کے قطرۂ اشک کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس کی حسن سیرت کے سامنے دنیا کا ہر حسن ماند ہے، اس کے عزم وارادہ کے آگے ہر طاقت سرنگوں ہے، اس انسان میں صحیح یقین، صحیح خواہش اور صحیح ملکات اور اخلاق کا پیدا کرنا اور اس سے خلافت الٰہی کا کام لینا نبوت کا اصل کارنامہ ہے۔

ہر نبوت نے اپنے دور میں یہ کارنامہ انجام دیا اور ایسے افراد تیار کئے، جنھوں نے اس دنیا کو نئی زندگی بخشی اور زندگی کو (جو انسان کی خود فراموشی اور غلط اندیشی سے) بے معنی ہو گئی تھی، بامعنی بنایا، نبوت کے ان کارناموں مین جو زندگی کی پیشانی پر درخشاں و تاباں ہیں سب سے روشن کارنامہ محمد رسول اللہ ﷺ کا کارنامہ ہے جس کی سب سے زیادہ تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، مردم سازی و آدم گری کے اس کام میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کامیابی عطا فرمائی، وہ آج تک کسی انسان کو حاصل نہیں ہوئی، آپ نے جس سطح سے تعمیر انسانیت کا کام شروع کیا، اس سطح سے کسی پیغمبر اور کسی مصلح اور کسی مربی کو شروع کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی، یہ وہ سطح تھی جہاں حیوانیت کی سرحد ختم ہوتی تھی اور انسانیت کی سرحد شروع ہوتی تھی، اور جس سطح پر آپؐ نے اس کام کو پہنچایا اس سطح تک بھی

کبھی تعمیر انسانیت کا م نہیں پہونچا تھا، جس طرح آپ نے انسانیت کی انتہائی پستی کام شروع کیا اسی طرح انسانیت کی آخری بلندی تک اس کام کو پہونچایا، آپ کے تیار کئے ہوئے افراد میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار ہے اور نوع انسانی کے شرف وافتخار کا باعث، انسانیت کے مرقع میں بلکہ اس پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین وجمیل، اس سے زیادہ دلکش ودل آویز تصویر نہیں ملتی جو ان کی زندگی میں نظر آتی ہے، ان کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کا سچا دل، ان کی بے تکلف زندگی، ان کی بے نفسی وخدا ترسی، ان کی پاک بازی وپاکیزہ گی، ان کی شفقت ورافت اور ان کی شجاعت وجلادت، ان کا ذوق عبادت اور ان کا شوق شہادت، ان کی شہسواری اور ان کی شب زندہ داری، ان کی سیم وزر سے بے پرواہی اور انکی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل اور ان کا حسن انتظام، دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، نبوت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانی افراد تیار کئے، ان میں سے ایک ایک فرد ایسا تھا، جو اگر تاریخ شہادت پیش نہ کرتی اور دنیا اس کی تصدیق نہ کرتی تو ایک شاعرانہ تخیل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا لیکن وہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے، وہ ایک ایسا انسانی وجود تھا، جس میں نبوت کے اعجاز نے متضاد اوصاف وکمالات پیدا کر دئے تھے۔

خاکی ونوری نہاد، بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل وپاک باز

اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل

ساقیٔ ارباب ذوق، فارس میدان شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

یہ فرد جب تیار ہو گیا تو بندگی اور زندگی کے ہر محاذ پر کار آمد، مستعد اور قیمتی ثابت ہوا اور جو خدمت اس کے سپرد کی گئی اس نے اپنی اہلیت و صلاحیت اور اپنی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری اور اپنے ذوق عمل اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیا، اس کو اگر فیصلہ اور ثالثی کا کام سپرد کیا گیا تو وہ بہترین قاضی اور لائق ترین جج ثابت ہوا، جس نے ترازو کے تول فیصلہ کیا، وہ اگر فوجوں کا سپہ سالار اور قائد مقرر ہوا تو اس نے اپنی جنگی قابلیت، بیدار مغزی اور شجاعت اور مرحمت کا ثبوت دیا، اگر فوجوں کی کمان اس کے حوالہ کردی گئی تو ایک مستعد اور کارگزار اور ایک جری اور جانباز سپاہی ثابت ہوا، اگر اس کو فوجوں کی قیادت کے منصب علیا سے معزول کر دیا گیا تو اس کی پیشانی پر ناراضگی کی ایک شکن اور اس کی زبان پر شکایت کا ایک حرف نہیں آیا اور لوگوں نے اس کی مستعدی اور جوش و نشاط میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا، اگر وہ نوکروں کا آقا اور محکمہ کا افسر تھا تو ایک فراخ دل اور شفیق آقا اور ایک خیر خواہ اور محبت کرنے والا بزرگ خاندان، اور اگر وہ مزدور و اجیر تھا تو وہ ایک فرض شناس و مستعد مزدور تھا، جس کو اپنی مزدوری کے اضافہ سے زیادہ کام کے اضافہ کی فکر تھی، وہ فرد اگر فقیر تھا تو فقیر صابر و قانع اور اگر غنی تھا تو غنی شاکر اور محسن، وہ اگر عالم تھا تو علم کو عام کرنے اور لوگوں کو خدا کا راستہ بتلانے کا حریص اور اپنے علم کی تقسیم میں فیاض، اور اگر طالب علم تھا تو علم صحیح کے حصول کا شائق اور اس کو اعلیٰ درجہ کی عبادت سمجھ کر اس کی طلب میں منہمک اور اس کے لئے بڑی سے بڑی محنت اور بڑی سے بڑی خدمت کرنے والا تھا، اور اگر وہ کسی شہر کا حاکم تھا تو راتوں کو پہرہ دینے والا اور دن کو انصاف کرنے والا تھا، غرض یہ فرد انسانی معاشرہ کے جس مقام اور جس محاذ پر تھا، نگینہ کی طرح جڑا ہوا تھا۔

دنیا کی سب سے نازک اور خطرناک ذمہ داری (حکومت) جب اس کے سپرد ہوئی تو اس نے زہد و فقر اور ایثار و قربانی اور جفاکشی و سادگی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ دنیا محو حیرت رہ گئی اور ابھی تک اس کے تحیر میں کوئی کمی نہیں آئی، آیئے ہمارے ساتھ خلافت راشدہ کے ان واقعات کو پڑھ لیجئے، عہد صدیقی کا مؤرخ لکھتا ہے:۔

"ایک روز حضرت ابو بکرؓ کی بیوی نے، شیرینی کی فرمائش کی، جواب دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں، انھوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں خرچ روزمرہ میں سے کچھ دام بچا کر جمع کرلوں، فرمایا کرو، کچھ روز میں چند پیسے جمع ہو گئے، تو حضرت ابو بکرؓ کو دیئے کہ شیرینی لادو، پیسے لے کر کہا معلوم ہوا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں، لہذا بیت المال کا حق ہے، چنانچہ وہ پیسے خزانے میں جمع کر دیئے اور اسی قدر اپنا وظیفہ کم کر دیا"۔(۱)

آپ نے بہت سی مملکتوں کے بادشاہوں اور بہت سی جمہوریتوں کے سربراہوں کے سرکاری دوروں کی روداد سنی ہو گی اور ان کے شاہانہ تزک و احتشام اور کروفر کا تماشا دیکھا ہو گا، ساتویں صدی مسیحی کے سب سے بڑے طاقت ور فرماں روا حضرت عمرؓ کے سرکاری دورہ (سفر شام) کی روداد مورخ کی زبان سے سنئے، مولانا شبلی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الفاروق" میں ۱۶ھ کے سفر بیت المقدس کا حال بیان کرتے ہوئے مستند عربی تاریخوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

"ناظرین کو انتظار ہو گا کہ فاروق اعظم کا سفر اور سفر بھی وہ جس سے دشمنوں پر اسلامی جلال کا رعب بٹھانا مقصود تھا

کس سر و سامان سے ہوگا؟ لیکن یہاں نقارہ و نوبت، خدم و حشم ،لاؤ لشکر ایک طرف، معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا، سواری میں گھوڑا تھا اور چند مہاجرین وانصار ساتھ تھے، تاہم جہاں یہ آواز پہونچتی تھی کہ فاروق اعظم نے مدینہ سے شام کا ارادہ کیا ہے زمین دہل جاتی تھی۔

جابیہ میں دیر تک قیام رہا اور بیت المقدس کا معاہدہ بھی یہیں لکھا گیا، معاہدہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا ارادہ کیا، گھوڑا جو سواری میں تھا، اس کے سُم گھس کر تمام ہو گئے تھے اور رُک رُک کر قدم رکھتا تھا، حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر اتر پڑے، لوگوں نے ترکی نسل کا ایک عمدہ گھوڑا حاضر کیا، گھوڑا شوخ اور چالاک تھا، حضرت عمرؓ سوار ہوئے تو اُلیل کرنے لگا فرمایا کمبخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سیکھی؟ یہ کہہ کر اتر پڑے اور پیادہ پا چلے، بیت المقدس قریب آیا تو حضرت ابو عبیدہ اور سرداران فوج استقبال کو آئے، حضرت عمرؓ کا لباس اور سر و سامان جس معمولی حیثیت کا تھا اسکو دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے، چنانچہ لوگوں نے ترکی گھوڑا اور عمدہ قیمتی پوشاک حاضر کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے یہی بس ہے"۔(۲)

دوسرے سفر شام ۱۸ھ کا حال سن لیجئے:۔

"حضرت عمرؓ نے شام کا قصد کیا، حضرت علیؓ کو مدینہ کی حکومت دی اور خود ایلہ کو روانہ ہوئے، یرفاان کا غلام اور بہت سے صحابہ ساتھ تھے، ایلہ کے قریب پہونچے، کسی مصلحت سے اپنی سواری غلام کو دی اور خود اس کے اونٹ پر سوار ہوئے، راہ میں جو لوگ دیکھتے تھے پوچھتے تھے کہ امیر المومنین کہاں ہیں؟ فرماتے کہ تمہارے آگے، اسی حیثیت سے ایلہ میں آئے اور یہاں دوایک روز قیام کیا، گزی کا کرتہ جو زیب بدن تھا، کجاوے کی رگڑ کھا کر پیچھے سے پھٹ گیا تھا، مرمت کے لئے ایلہ کے پادری کے حوالہ کیا، اس نے خود اپنے ہاتھ سے پیوند لگائے اور اس کے ساتھ ایک نیا کرتہ تیار کر کے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے اپنا کرتہ پہن لیا اور کہا اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے"۔(۳)

خلفائے راشدین اور صحابۂ کرامؓ کی سیرت کے مختلف پہلو اور ان کے محاسن اخلاق کتابوں میں متفرق و منتشر موجود ہیں، ان سب کو جمع کر کے آپ اپنے ذہن میں ایک فرد کی مکمل زندگی اور پوری تصویر تیار کر سکتے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے ان میں سے ایک (سیدنا علیؓ ابن ابی طالب) کا پورا اخلاقی سراپا اور انکی زندگی کی تصویر ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، اس کو پڑھئے اور دیکھئے کہ ایک انسان کی سیرت واخلاق کی اس سے زیادہ حسین ودلکش تصویر کیا ہو سکتی ہے، اور نبوت نے اپنی تعلیم وتربیت اور اپنی مردم سازی وکیمیاگری کے کیسے یادگار نمونے چھوڑے ہیں، ان کی خدمت میں شب وروز رہنے والے ایک رفیق ضرار بن ضمرہ اس طرح ان کی تصویر

کھینچتے ہیں :۔

بڑے بلند نظر، بڑے عالی ہمت، بڑے طاقت ور، جچی تلی گفتگو فرماتے، حق وانصاف کے مطابق فیصلہ فرماتے، زبان ودہن سے علم کا چشمہ اُبلتا، ہر ہر ادا سے حکمت ٹپکتی، دنیا اور بہارِ دنیا سے وحشت تھی، رات اور رات کی تاریکی میں خوش رہتے، آنکھیں پُر آب، ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے ہوئے، رفتارِ زمانہ پر متعجب، نفس سے ہر وقت مخاطب، کپڑا وہ مرغوب جو موٹا جھوٹا ہو، غذا وہ مرغوب جو غریبانہ اور سادہ ہو، کوئی امتیازی شان پسند نہیں کرتے تھے، جماعت کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے، ہم سوال کرتے تو یہ جواب دیتے، ہم حاضر خدمت ہوتے تو سلام ومزاج پرسی میں پہل کرتے، ہم مدعو کرتے تو دعوت قبول فرماتے، لیکن اس قرب ومساوات کے باوجود رعب کا یہ عالم تھا کہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور سلسلۂ سخن کا آغاز کرنا مشکل ہوتا، اگر کبھی مسکراتے تو دانت موتی کی لڑی معلوم ہوتے، دینداروں کی عزت اور مساکین سے محبت کرتے تھے، لیکن اس تواضع ومسکنت کے باوجود کسی طاقت ور اور دولت مند کی مجال نہ تھی کہ ان سے کوئی غلط فیصلہ کروالے یا ان سے کوئی رعایت حاصل کرلے اور کمزور کو ہر وقت ان کے عدل وانصاف کا بھروسہ تھا۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کو ایک شب

ایسی حالت میں دیکھا کہ رات نے اپنی ظلمت کے پردے ڈال دیئے تھے، اور ستارے ڈھل چلے تھے۔ آپ اپنی مسجد کی محراب میں کھڑے تھے داڑھی مٹھی میں تھی، اس طرح تڑپ رہے تھے، جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو، اس طرح رو رہے تھے، جیسے دل پر چوٹ لگی ہو، اس وقت میرے کانوں میں ان کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں۔ "اے دنیا! اے دنیا! کیا تو میرا امتحان لینے چلی ہے اور مجھے بہکانے کی ہمت کی ہے، مایوس ہو جا کسی اور کو فریب دے، میں نے تجھے ایسی تین طلاقیں دی ہیں جن کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیرا عیش بے حقیقت، تیرا خطرہ زبردست، ہائے زادِ راہ کس قدر کم ہے، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ہے"۔ (۴)

نبوت کا یہ کارنامہ زمانۂ بعثت اور پہلی صدی ہجری کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ کی تعلیمات نے اور آپ کے صحابۂ کرام نے زندگی کے جو نمونے چھوڑے تھے، وہ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں اور وسیع عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ہر شعبۂ زندگی اور صنف کمال میں عظیم انسان پیدا کرتے رہے جن کی انسانی بلندی شک وشبہ اور اختلافات سے بالاتر ہے، اس لازوال **"مدرسۂ نبوت"** کے فضلاء اور تربیت یافتہ (جنہوں نے صرف اسی مدرسہ سے انسانیت واخلاق اور خداشناسی اور انسان دوستی کا سبق لیا تھا) اپنے اپنے زمانہ کی زیب وزینت اور انسانیت کے شرف وعزت کا باعث ہیں، کسی مورخ اور کسی بڑے سے بڑے مصنف اور محقق کی یہ طاقت نہیں کہ ان لاکھوں اہلِ یقین اور اہلِ معرفت کے ناموں کی صرف

فہرست بھی پیش کر سکے، جو اس تعلیم کے اثر سے مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر پیدا ہوتے رہے، پھر ان کے مکارمِ اخلاق، ان کی بلند انسانیت، ان کے روحانی کمالات کا احاطہ تو کسی طرح ممکن نہیں، ان کے حالات کو (جو کچھ بھی تاریخ محفوظ کر سکی ہے) پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ خاکی انسان روحانی ترقی، نفس کی پاکیزگی، حوصلہ کی بلندی، انسان کی ہمدردی، طبیعت کی فیاضی، ایثار و قربانی، دولتِ دنیا سے بے نیازی، سلاطین وقت سے بے خوفی، خداشناسی و خدادانی اور غیبی حقیقتوں پر ایمان و یقین کے ان حدود اور بلندیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے ان کے یقین نے لاکھوں انسانوں کے دلوں کو یقین سے بھر دیا، ان کے عشق نے لاکھوں انسانوں کے سینوں کو عشق کی حرارت اور سوز سے گرم و روشن کر دیا، ان کے اخلاق نے خونخوار دشمنوں کو جاں نثار اور لاکھوں حیوان صفت انسانوں کو حقیقی انسان بنادیا، ان کی صحبت اور ان کے فیض و تاثیر نے خدا طلبی اور خداترسی اور انسان دوستی کا عام ذوق پیدا کر دیا، ہمارا ملک ہندوستان اس بارے میں بڑا خوش نصیب ہے کہ وہ اپنے آغوش میں بکثرت ایسے مردان خدا کو لئے ہوئے ہے جنھوں نے اپنے عہد میں انسانیت کو بلند اور انسان کا نام روشن کیا تھا۔

بادشاہوں کی صف میں بھی جو کشور ستانی اور ملک گیری اور عیش کوشی کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے، اس تعلیم نے ایسے درویش صفت اور زاہد سیرت بادشاہ پیدا کئے، جنھوں نے زہد و ایثار کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی نظیر تارک الدنیا اور درویشوں اور گوشہ نشین فقیروں کے یہاں بھی مشکل ہے، تاریخ اسلام کے ہر دور اور عالمِ اسلام کے ہر گوشے میں ایسی شخصیتیں ملتی ہیں کہ بقول اقبالؔ ؎

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب

سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

"**مدرسہ نبوت کے**" ان فیض یافتہ سلاطین میں جن کی فہرست طویل ہے آپ صرف سلطان صلاح الدین ایوبی کا حال پڑھیں، چھٹی صدی ہجری میں مشرق وسطیٰ کے اس سب سے بڑے حکمراں (جو کردستان کے پہاڑوں سے لیکر صحرائے نوبہ تک حکومت کرتا تھا) کے متعلق اس کا سکریٹری قاضی ابن شداد شہادت دیتا ہے :۔

"زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت نہیں آئی، اس لئے کہ انہوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقات وخیرات میں خرچ ہوئی صرف سیتالیس درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد وملکیت، کوئی مکان، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز وتدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھاس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر وکاتب قاضی فاضل نے کسی جائز وحلال ذریعہ سے کیا۔" (۵)

انسانی بلندی، شرافتِ نفس، عالی حوصلگی کے اعتبار سے بھی سلطان تاریخ کے عظیم ترین انسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر عیسائی فاتحین کے برخلاف (جنہوں نے ظلم وسفاکی کی ایک نظیر قائم کردی تھی) سلطان نے جس شفقت ومرحمت اور احسان وفیاضی کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر کرتے

ہوئے ان کا مغربی سوانح نگار اسٹنلی لین پول (STANELEY LANE POOL) لکھتا ہے :۔

"اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل شخص تھا"۔(۶)

آپ نے جہاں مشرق وسطیٰ کے ایک عظیم الشان حکمراں کے احسان و فیاضی کا واقعہ سنا، خود اپنے ملک کے ایک مسلمان بادشاہ کا واقعہ بھی سنتے چلئے جو خلوص و فیاضی، ایثار اور بلند حوصلگی کا ایک اور نمونہ ہے، یہ دسویں صدی ہجری کے ایک طاقت ور فرماں روا مظفر علیم سلطان گجرات م ۹۳۲ھ کا واقعہ ہے کہ جس نے محمود شاہ خلجی کی مدد کے لئے (جو غاصبوں کے ہاتھوں تخت و تاج سے محروم ہو گیا تھا، اور اس کی سلطنت پر اس کے نمک خواروں نے قبضہ کر لیا تھا) مانڈو پر حملہ کیا تھا اور اس کو فتح کر لیا تھا، واقعہ مؤرخ گجرات کی زبان سے سنئے :۔

"تسخیر قلعہ کے بعد جس وقت مظفر حلیم اندر داخل ہوا اور امرائے ہمرکاب نے شاہانِ مالوہ کے سامانِ تجمل اور خزائن و دفائن کو ملاحظہ کیا اور اس ملک کی سرسبزی و شادابی پر اطلاع پائی تو انھوں نے جسارت کر کے مظفر شاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار سوار جرار درجۂ

شہادت کو پہنچ چکے ہیں، یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک کو اسی بادشاہ کے حوالہ کردیا جائے جس کی سوء تدبیری سے مندلی رائے نے اس پر قابو پالیا تھا، بادشاہ نے یہ سنتے ہی سیر موقوف کی اور قلعہ سے باہر نکل کر محمود شاہ کو ہدایت فرمائی کہ اس کے ہمرکاب لوگوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر نہ جانے دے، محمود نے باصرار تمام اس بات کی التجا کی کہ بادشا چند روز قلعہ کے اندر آرام فرمائیں، مگر مظفر شاہ نے اس التجا کو قبول نہ فرمایا اور بعد کو خود ظاہر کیا کہ میں نے یہ جہاد وغزا محض خداوندِ برحق کی رضامندی حاصل کرنے کو کیا تھا، مجھ کو امراء کی تقریر سے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ مبادا کوئی خطرہ فاسد میرے دل میں پیدا ہو اور میرا خلوص نیت برباد ہوجائے، میں نے محمود پر کچھ احسان نہیں کیا، بلکہ خود محمود کا مجھ پر احسان ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی"۔(۷)

میں یہ نہیں کہتا کہ سارے سلاطین وفرماں روا جو اسلامی عہد میں گزرے وہ نورالدین وصلاح الدین، ناصرالدین محمود اور سلطان مظفر حلیم کا نمونہ تھے، لیکن آپ کو جن فرماں رواؤں میں انسانی بلندی، خداترسی، فقروزہد، ایثار وقربانی اور شفقت ومرحمت کی یہ شان نظر آتی ہے اور ان میں سے جو اپنے زمانہ کی سطح سے بلند، بادشاہوں کی روایات سے الگ اور زمانے سے نرالے دکھائی دیتے ہیں، وہ صرف نبوت کے فیض اور دینی جذبہ کا نتیجہ ہیں، آپ اگر ان کی زندگی اور سوانح

حیات کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو سراغ لگانے میں دقت نہیں ہوگی کہ ان سب کا تعلق واتصال (تعلیم وتربیت، تعلق ومحبت، اتباع واطاعت کے ذریعہ سے) اسی ایک سرچشمۂ ہدایت سے تھا، جس نے ہر دور میں عظیم ترین انسان پیدا کئے خواہ ان کا زمانہ کتنا ہی دور ہو، دراصل یہ سب اسی درسگاہِ نبوت کے فیض یافتہ ہیں جس نے تعمیر انسانیت کا کام سب سے وسیع پیمانہ اور سب سے اعلیٰ سطح پر انجام دیا اور جس کا فیض اب بھی انسانیت کے چراغ کو روشن کئے ہوئے ہے، اور جہاں کہیں روشنی ہے، اسی ایک چراغ کا پرتو ہے۔ ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجامی نگرم انجمنے ساختہ اند

ہماری جدید تہذیب اور موجودہ فکری قیادت، معاشرۂ انسانی کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افراد تیار کرنے اور انسان کی سیرت سازی میں بری طرح ناکام رہی ہے، وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرسکتی ہے، وہ خلا میں سفر کرنے کے لئے محفوظ وسریع الیسر آلات تیار کرسکتی ہے، وہ انسان کو چاند اور سیاروں پر پہنچا سکتی ہے، وہ ذراتی طاقت سے بڑے بڑے کام لے سکتی ہے، وہ ملک سے غریبی دور کرسکتی ہے، وہ علم وہنر کو آخری نقطۂ عروج پر پہنچا سکتی ہے، وہ پوری کی پوری قوم اور ایک ملک کی آبادی کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے، اسکی ان کامیابیوں اور فتوحات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں، لیکن وہ صالح اور صاحب یقین افراد پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہے اور یہی اسکی سب سے بڑی ناکامی اور بدقسمتی ہے، اور اسی وجہ سے صدیوں کی محنتیں ضائع وبرباد ہو رہی ہیں، اور ساری دنیا مایوسی اور انتشار کا شکار ہے، اور اب اس کا سائنس اور علم پر سے بھی اعتقاد اٹھ رہا ہے، اندیشہ ہے کہ

دنیامیں ایک شدید رد عمل کی تحریک اور علم وتمدن کے خلاف بغاوت کے دور کا آغاز نہ ہو جائے، فاسد افراد نے معصوم اور صالح وسائل وذرائع کو بھی فاسد بلکہ آلۂ فسادو تخریب بنا دیا ہے، فاسد کمزور تختوں سے کوئی صالح اور مضبوط سفینہ تیار نہیں ہو سکتا، یہ بالکل مغالطہ اور خام خیالی ہے کہ فاسد تختے علیحدہ علیحدہ فاسد کمزور اور نا قابل اعتماد ہیں، لیکن جب ان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے، اور ان سے کوئی سفینہ تیار کیا جائے تو ان کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے، اور وہ صالح بن جاتے ہیں، رہزن اور چور علیٰحدہ علیٰحدہ تو رہزن اور چور ہیں، لیکن جب وہ اپنی جماعت بنالیں تو وہ پاسبانوں اور ذمہ دار انسانوں کی ایک مقدس جماعت ہے، نئی فکری قیادت نے جو افراد دنیا کو عطا کئے ہیں وہ ایمان ویقین سے خالی، ضمیر انسانی سے عاری، حاسۂ اخلاقی سے محروم، محبت وخلوص کے مفہوم سے نا آشنا، انسانیت کے شرف واحترام سے غافل ہیں، وہ تو لذت وعزت کے فلسفہ سے واقف ہیں یا صرف قوم پرستی اور وطن دوستی کے مفہوم سے آشنا ہیں، اس نوعیت اور صلاحیت کے افراد خواہ جمہوری نظام کے سربراہ ہوں یا اشتراکی نظام کے ذمہ دار کبھی کوئی صالح معاشرہ، پر امن ماحول اور خداترس وپاکباز سوسائٹی قائم نہیں کر سکتے اور ان پر خدا کی مخلوق اور انسانی کنبہ کی قسمت کے بارے میں کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

اس دنیامیں صالح ترین افراد اور صالح ترین معاشرہ صرف نبوت نے تیار کیا ہے، اور اسی کے پاس قلب کو بدلنے اور گرمانے، نفس کو جھکانے اور جمانے، نیکی وپاکبازی کی محبت اور گناہ اور بدی سے نفرت پیدا کرنے، مال وزر، ملک وسلطنت، عزت ووجاہت اور ریاست وتفوق کی سحر انگیز ترغیبات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور وہی افراد جو ان صلاحیتوں کے مالک ہوں، دنیا کو

ہلاکت سے اور تہذیب جدید کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔

نبوت نے دنیا کو سائنس نہیں دی، ایجادیں نہیں عطا کیں، اس کو نہ اس کا دعویٰ ہے، نہ ایسا نہ کرنے پر شرمندگی اور معذرت، اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کو وہ افراد عطا کیے جو خود صحیح راستے پر چل سکتے ہیں، اور دنیا کو چلا سکتے ہیں اور ہر اچھی چیز سے خود نفع اٹھا سکتے ہیں، اور دوسروں کو پہونچا سکتے ہیں، اور جو ہر قوت اور نعمت کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں، جو اپنی زندگی کے مقصد سے واقف اور اپنے پیدا کرنے والے سے آشنا ہیں، اور اس کی ذات سے استفادہ کرنے اور اس سے مزید نعمتیں حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، انہیں کا وجود اصل انسانیت کا سرمایہ اور انہیں کی تربیت نبوت کا اصل کارنامہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

☆☆☆

حواشی:۔

(۱) سیرۃ الصدیق صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

(۲) الفاروق ص ۱۰۵، ۱۰۶

(۳) ایضاً ص ۱۱۳

(۴) صفوۃ الصفوۃ ابن جوزیؒ ج ۱

(۵) النوادر السلطانیہ

(۶) سلطان صلاح الدین ص ۲۰۵

(۷) "یاد ایام" بحوالہ مرآۃ سکندری۔

اسلام
مکمل دین، مستقل تہذیب

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وقیع اور تاثیر میں ڈوبا ہوا مقالہ جس کا ایک ایک لفظ قاری کے لئے آب حیات ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام
مکمل دین، مستقل تہذیب

دو نظام عقائد اور دو تہذیبیں

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لئے اور اپنی ذات کی معرفت عطا کرنے اور اس کا صحیح تعارف کرانے کے لئے، جو عقل وقیاس سے ماوراء ہے اور جس کی کوئی مثال اور نظیر اس دنیامین موجود نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کے گروہ کو منتخب فرمایا، اپنے کلام اور پیغام کے ذریعہ پہلے ان کو، پھر ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنی ذات وصفات کا صحیح اور مستند علم عطا فرمایا اور اپنے منشاء اور احکام اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقہ سے آشنا کیا، اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے :۔

وماکان الله لیطلعکم علی الغیب ولکن الله یجتبی من رسله من یشاء(آل عمران. ۱۷۹)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کردے، غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے، منتخب کرلیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی بندگی کے صحیح قاعدے اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقے کو معلوم کرنے کا ان پیغمبروں کی اطلاعات اور تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں، یہ عقل وذہانت، قیاس آرائی وطبع آزمائی، خواہشات اور قومی رسم ورواج کا میدان نہیں، اس کے لئے اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا خود اس کی خبر دے، اور وہ اس کی خبر پیغمبروں ہی کے ذریعہ دیتا ہے، اس لئے اس علم وہدایت کا ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت، طریقۂ زندگی کی صحت، اعمال کی قبولیت، اور انسانوں کی مقبولیت، اسی گروہ انبیاء کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے، انھیں کے تعلیم کئے ہوئے عقائد، انھیں کی عطا کی ہوئی معرفتِ الٰہی، انھیں کے لائے ہوئے حقائق اور علوم، اور انھیں کا طریقۂ زندگی، انھیں کی معاشرت اور اخلاق، اللہ تعالیٰ کو محبوب اور مقبول ہیں، اور سارے انسانوں کو ان کی اقتدا اور تقلید کرنے، اور ان کو اپنے لئے نمونہ اور امام بنانے کی ہدایت اور تاکید ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ اپنے ان محبوب بندوں اور عالی مرتبہ پیغمبروں میں سے ایک بڑے گروہ کا نام بنام ذکر کرتا اور ان پر اپنے انعاماتِ گناتا ہے :۔

وتلك حجتنا اٰتینھا ابرھیم علی قومه نرفع درجٰت من نشاء ان ربك حکیم علیم ووھبنا له اسحٰق ویعقوب کلا ھدینا ونوحا ھدینا من قبل ومن ذریته داؤد وسلیمن وایوب ویوسف وموسی وھارون وکذالك نجزی المحسنین وزکریا ویحیٰ وعیسی والیاس کل من الصلحلین واسمعیل والیسع ویونس ولوطا وکُلاً فضلنا علی العلمین ومن آبائھم وذریٰتھم واخوانھم واجتبینٰھم وھدینٰھم الی صراط مستقیم ذلك ھدی

الله يهدى به من يشاء من عباده ولواشركوا لَحَبطَ عنهم ما كانوا يعملون اولئك الذين آتينٰهم الكتب والحكم والنبوة فان يكفر بها هؤلاء فقد وكلنا بها قوما ليسوا بها بكٰفرين (الانعام . ٨٤ تا . ٩٠)

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی، ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں، حق یہ ہے کہ تمہارا رب نہایت دانا اور علیم ہے، پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی، اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی (وہی راہ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی، اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی) اس طرح ہم نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں، (اسی کی اولاد سے) زکریا، یحیٰ، عیسیٰ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا) ہر ایک ان میں سے صالح تھا، (اسی کے خاندان سے) اسمٰعیلؑ، الیسعؑ، اور یونسؑ اور لوطؑ کو (راستہ دکھایا) ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی، نیز ان کے آباء واجداد اور ان کی اولاد، اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انھیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا، اور سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی، یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے، رہنمائی کرتا ہے، لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی، اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، تو (پروا نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے، جو اس سے منکر نہیں ہیں۔

اس شیریں اور دل آویز تذکرہ کے بعد جس کے لفظ لفظ سے محبت اور

حلاوت ٹپکتی ہے، اپنے رسول کو مخاطب بناتے ہوئے دنیا کے ہر انسان کو خطاب ہے :۔

أولئك الذين هدى الله فبهدٰهم اقتده ، قل لا أسئلكم عليه أجراً ، إن هو إلا ذكرىٰ للعلمين ،(الانعام . ۹۱)اے محمدؐ ! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انھیں کے راستہ پر تم چلو، اور کہدو کہ میں (اس تبلیغ وہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کیلئے۔

یہ اللہ تعالی کے بندوں کا وہ محبوب گروہ ہے، جس کی ہر بات اللہ تعالی کو محبوب ہے، عقائد والٰہیات سے لے کر عادات ومرغوبات، اخلاق ومعاشرت، اور ان کو حمیت اسلامی کے جوہر سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور اللہ نے ان کو ایک بے چین روح، اور ایک مضطرب دل عطا فرمایا تھا، وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان جس پر ہمارے اسلاف کی بہترین صلاحتیں صرف ہوئی ہیں، اور جس نے اسلام کی خدمت اور دینی علوم کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے، جن کی نظیر بڑے بڑے اسلامی ملک نہیں پیش کر سکتے، تاریخ کے پچھلے دور میں وہ مسلمانوں کی ذہانت، ان کی قوتِ اجتہادی، ان کی اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے اظہار کا سب سے بڑا میدان رہا ہے، اس نے علوم اسلامیہ کی خدمت میں حصہ ہی نہیں لیا، بلکہ ان میں اضافہ کیا ہے، اس نے اسلامی کتب خانوں کو بعض وہ کتابیں دیں، جن کی مثال اسلام کی پوری علمی تاریخ میں نہیں ملتی، کیا اس وسیع ملک کو اس آسانی کے ساتھ مغربی تہذیب کی تحویل اور اس کے علم برداروں کے چارج میں دے دیا جائے، ؟ کیا ہم اپنی ان آنکھوں سے دیکھیں کہ مسلمان خاندانوں کے نونہال،

صدیقی، علوی، فاروقی، عثمانی اور سادات و شیوخ کے گھرانوں کے چشم و چراغ، جن کے اسلاف کرام کی کوششوں کی بدولت لاکھوں انسانوں کو اسلام کی ہدایت اور علم کی دولت نصیب ہوئی، جنھوں نے اسلام کے چراغ کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اور بڑی بڑی آندھیوں اور طوفانوں میں بھی اس کو گل ہونے نہ دیا، اسلامی تہذیب و معاشرت، اور سنت و شریعت سے رشتہ توڑ کر خالص مادہ پرست انگریزوں کے قبضے میں چلے جائیں، اور وہ ان کو اپنی نئی تہذیب و تعلیم کے سانچہ میں ڈھال کر مسلمانوں، یا صحیح الفاظ میں دنیاداروں کی ایک نئی نسل تیار کر دیں، جس کو نام اور قومیت کے سوا کسی چیز میں سابق نسل سے مناسبت اور مشابہت نہ ہو؟

یہ سوال تھا جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتویؒ کے سامنے ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو گیا، یہ مسئلہ محض ایک مدرسہ اور تعلیم گاہ کے قیام کا نہیں تھا، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے حق میں "**ازالۂ حیثیتِ عرفی**" کا جرم ہوگا، اگر کہا جائے کہ دارالعلوم چند مخصوص کتابوں کے پڑھنے پڑھانے اور درس تدریس کے ایک مرکز کی حیثیت سے قائم ہوا تھا، اس سے بڑھ کر اس کے بانیوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو سکتی، ایسا کہنے والوں کو ان بزرگوں کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا، جس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ محض ایک مدرسہ ہے، تو حضرت شیخ الہندؒ تڑپ اٹھتے تھے، ان کے نزدیک یہ اسلام کا ایک قلعہ، اس کے داعیوں اور مجاہدوں کی تربیت کی ایک چھاؤنی، اور سلطنت مغلیہ کے گل ہونے والے چراغ کا بدل، بلکہ نعم البدل تھا۔

بس مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے سامنے اصل مسئلہ یہی تھا کہ کیا ہندوستان کو ان مغربی غارتگروں کے ہاتھ میں دے دیا جائے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں

سے دیکھتے رہیں کہ ہمارے جگر کے ٹکڑے، جنھوں نے ہمارے خون جگر سے پرورش پائی، جن کی رگوں میں علماء اور اولیاء کا خون دوڑرہا ہے، ان کالجوں اور یونیورسیٹیوں کے قبضے میں چلے جائیں، اور مغربی تہذیب اور تعلیم کے سائے میں پروان چڑھ کر، ہم سے مکمل طور پر بیگانہ، ونا آشنا ہو کر نکلیں؟ انھوں نے انگریزی حکومت کے اس چیلنج کو قبول کیا، اور بالکل اپنے جد امجد صدیق اکبر کی زبان میں یہ کہا کہ:۔أینقص الدین و أنا حي، کیا خدا کے دین میں میرے جیتے جی کتر بیونت کی جاسکتی ہے۔

ان کی صحیح ترجمانی یہی فقرہ کرتا ہے، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے نکلا تھا، اس فقرہ نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، اور زمانہ کی کلائی موڑدی تھی، یہ ایک مختصر سا فقرہ نہیں، ایک دور کا عنوان، اور ایک تاریخ کا خلاصہ ہے، اگر صدیق اکبر کی کوئی سیرت وسوانح نہ لکھی جاتی، تو یہی ایک فقرہ ان کی مکمل سیرت وسوانح بن سکتا تھا، یہ ایک الہامی فقرہ تھا، جو ان کی زبان سے نکلا، ایک شیر تڑپ کر، جست لگا کر دھاڑتا ہے، جس سے سارا جنگل کانپ جاتا ہے، اس سے زیادہ جلال وصولت اور اس سے زیادہ شجاعت وغیرت اس فقرہ میں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بانیوں کی جو چیز رہنمائی کررہی تھی، وہ یہی احساس تھا، ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ صرف ونحو کی تعلیم اور علوم عالیہ وآلیہ کی مجرد تدریس کے لئے مرکز قائم کریں، اس کے لئے مصر کا جامع ازہر، تیونس کا جامع زیتونہ، مراکش کا جامع القرویین اور ہندوستان کے کئی بڑے بڑے مدارس موجود تھے، ان کی ٹکر کا کوئی مدرسہ قائم کرنا اس بے سروسامانی کی حالت میں محض تعلیم وتعلم کے لئے کوئی دانشمندانہ فعل اور کوئی جرأت

مندانہ اقدام نہ تھا۔

غیر منقطع رشتہ اور نا قابل شکست عہد

یہی دینی حمیت تھی، جس نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بے چین بنا رکھا تھا، اور انھوں نے مدرسہ قائم کیا، اس مدرسہ نے ایک بہت محدود اور غیر محسوس طریقہ پر کام کا آغاز کیا، جس کا احساس اس زمانہ کے اچھے اچھے صاحب نظر لوگوں کو بھی شاید نہ ہوا ہو، لیکن اس کا مقصد بہت عظیم تھا، وہ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت، علوم دینیہ اور شریعت اسلامیہ کے لئے ایک قلعہ تعمیر کریں اور اس دعوت کو متعدی بنائیں :۔

وجعلها کلمة با قیة فی عقبه لعلهم یر جعون(از خرف ۲۸)اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے تا کہ (خدا کی طرف) رجوع کریں۔

ان کی تمام کوششوں کا ماحصل اور مطمح نظر صرف یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمان جب تک زندہ رہیں، ان کا رشتہ ملت ابرہیمی، اور شریعت محمدی سے استوار رہے، وہ اسی دین و آئین کے پابند ہوں جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ان کو ملا ہے، اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوں تو وہ اسی دین کے وفادار اور حلقہ بگوش ہوں، یہ گویا اسی وصیت اور عہد نامہ کی تعمیل تھی، جس کا قرآن شریف میں تذکرہ ہے :۔

ووصیٰ بها ابراهم بنیه و یعقوب ، یٰبنیّ إن الله اصطفٰی لکم الدّین فلا تمو تنّ إلا و أنتم مسلمون،(سورۃالبقرہ . ۱۳۲)اور ابرہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بچو! خدا نے تمہارے لئے اسی دین کو پسند فرمایا ہے تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔

نیا زمانہ، نئے فتنے

عزیزانِ گرامی!

آپ کی درسگاہ کی بنیاد ہی حمیتِ اسلامی پر پڑی، آپ کی درسگاہ کی بنیاد زمانہ کے چلینج کے قبول کر لینے پر پڑی، اب زمانہ کے نئے چیلینج کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے، کم از کم دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے لئے اس چیلینج کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز نہیں، اس لئے کہ ان کی بنیاد ہی زمانہ کے چیلینج کو قبول کرنے پر پڑی تھی، مغربی تہذیب اور معاشرت اور انگریزی تعلیم جس کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی رہنمائی، اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں تھا، اس زمانہ کا فتنہ تھا لیکن فتنے کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، اور ایک ہی فتنہ ہمیشہ نہیں ہوتا، نئے نئے فتنے سر اٹھاتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے نئے نئے خطرے سامنے آتے ہیں، جاہلیت نئے نئے روپ میں سامنے آتی ہے، اور بڑے دَم خم کے ساتھ میدان میں اترتی ہے، اقبالؔ نے غلط نہیں کہا تھا ؎

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات و منات

بڑی خطرناک بات یہ ہے کہ لات و منات یعنی باطل طاقتیں، اور جاہلیت قدیم تو زندگی اور جوش و خروش سے بھرپور ہوں، اور مومن میں جو سیدنا ابراہیمؑ کا وارث اور نائب ہے کہنگی اور فرسودگی، پستی اور افسردگی، کنارہ کشی اور پسپائی کی ذہنیت پیدا ہو جائے، لات و منات نئے دم خم کے ساتھ، نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ، نئی تیاریوں اور نئے طریقوں کے ساتھ، نئے نعروں اور نئی للکاروں کے ساتھ میدان میں آئیں اور مومن پر موت کی نیند طاری ہو جائے، اس کے قویٰ میں افسردگی، اور اضمحلال پیدا ہو جائے، وہ زندگی کے میدان سے فرار اختیار کر کے

یا کنارہ کش ہو کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کر لے، جہاں وہ اپنی زندگی کے دن گذار سکے اور لات و منات خم ٹھونک کر میدان میں کھڑے ہوں، اور دعوت مبارزت دے رہے ہوں۔

عہد جدید کا فتنۂ کبریٰ

حضرات!

اس زمانہ کا فتنہ اور چیلنج کیا ہے؟ اس زمانہ کا چیلنج یہ ہے کہ اسلام کو اس کی جداگانہ تہذیب، اسکی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون، اس کے نظام تعلیم، اس کے زبان و ادب، اور رسم الخط، اور اس کے پورے ورثہ سے الگ کر دیا جائے، اور اسلام چند عبادات، اور چند رسوم و تقریبات کا (جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے) مثلاً شادی اور غمی میں کیا ہونا چاہئے، مردے کو کس طرح آخری مرحلہ سے گذارا جائے، وغیرہ وغیرہ، بس اسلام انھیں مذہبی و معاشرتی رسوم (RITES) کا مجموعہ بن کر رہ جائے، میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہو، لیکن پھر بھی اندازہ ہے، کہ شاید ابھی یہ مرحلہ دور ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا جائے کہ آپ کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، آپ کو کوئی خاص عقیدہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں، آپ روزہ نہیں رکھ سکتے، آپ زکوٰۃ نہیں دے سکتے، لیکن وہ مرحلہ ضرور آگیا ہے کہ مسلمانوں سے اشارہ اور کنایہ سے، اور کبھی صاف کہا جاتا ہے، کہ مسلمان اپنی رضا و رغبت سے اپنی جداگانہ تہذیب، اور ہر اس چیز سے بے تعلقی اختیار کرلیں جو ان میں ایک الگ ملت، اور ایک مستقل تہذیب کا وارث ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے، وہ خود ہی اعلان کر دیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے حامل نہیں ہیں، وہ خود اپنے عائلی قانون (پرسنل

لاء) میں اصلاح وترمیم کا مطالبہ کریں، اور اپنے لئے وہی یکساں قانون پسند کریں جو سارے ملک کے لئے نافذ ہو، وہ اپنے تمام تعلیمی مرکزوں کو جوانھوں نے اپنی پسند و ضرورت کے مطابق قائم کئے تھے، حکومت کی تحویل اور انتظام میں دے دیں، اور ان کے نظم و نسق سے خود دست بردار ہو جائیں، تاکہ ان سے ایک ہی طرح کے ماڈل تیار کئے جائیں، جو اس سیکولر اور اشتمالیت پسند ملک سے ہم آہنگ ہو، حکومت اسلام کی مخالف نہیں، اور اس کو اسلام کے ختم کرنے کے کام سے دلچسپی نہیں، اس کو تو اس پر فخر ہے کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی مسلم برادری یہاں آباد ہے، اس کو آباد رہنا، اور پھلنا پھولنا چاہئے، اس سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں، اور بین الاقوامی اور سیاسی موقعوں پر اس کو ایک دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، آج صاف صاف کہا جارہا ہے کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں رہنا ہے، تو ان کو قومی دھارے میں بہنا چاہئے، اور قومی دھارے کے معنی یہ ہیں کہ آپ تمام تشخصات سے دست بردار ہو جائیں، آج کا مطالبہ یہ کہ مسلمان رہو، تمہیں کوئی نہیں ٹوکتا، یہ فرقہ وارانہ فسادات تو ایک مریض کی ہذیانی کیفیت، اور ہسٹریا کا ایک دورہ ہے، جو ہمیشہ نہیں رہے گا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ بہت کم ہو گئے ہیں، اور میں پیشینگوئی کرتا ہوں کہ وہ اور بھی کم ہو جائیں گے، میرے نزدیک یہ اصل خطرہ نہیں، اصل خطرہ نسل کشی کا نہیں، معنوی ارتداد کا ہے، ذہنی و تہذیبی ارتداد کا ہے، اس خطرہ کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے کسی بڑی فراست، اور دور بینی کی ضرورت نہیں، یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے، جس کو ہر ایک پڑھ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جن کو آنکھیں دی ہیں وہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ آج علی گڑھ کا معاملہ ہے، کل دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی باری آسکتی ہے، وقت اور حالات کا مسئلہ ہے، اور اس کا انحصار اس پر

ہے کہ ہم علیگڑھ کے مسئلہ پر کتنی زندگی، اور بیداری، اور کتنی غیرت، اور خودداری کا ثبوت دیتے ہیں۔

دینی بدعات، اور منکرات سے نبرد آزما ہونے والوں کے اخلاف کی ذمداری

عزیز طلبہ! آپ کے اسلاف وہ تھے جنھوں نے بدعات کے ساتھ ادنیٰ مصالحت گوارہ نہیں کی، آپ کے اسلاف نے آج تک مولود کے قیام کی اجازت نہیں دی، کتنے رسوم اور طریقے ہیں، جو مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں، اور انھوں نے مذہبی فرائض، اور دینی شعائر کی حیثیت اختیار کرلی ہے، لیکن آپ کا جس مکتب خیال اور مسلک سے تعلق ہے، اس کے علماء نے ان کی ہمیشہ مخالفت کی، اور ان کو بدعت اور بے اصل بتایا، اس کی ان کو معاشرتی اور اجتاعی زندگی میں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، ان کا مقاطعہ کیا گیا، ان کو مسجدوں سے نکالا گیا، ان پر کفر و ضلالت کے فتوے لگائے گئے، وہ بہت سے دنیوی مفادات، اور لذتوں سے محروم رہے، لیکن انہوں نے ان چیزوں کے ساتھ ذرا بھی رواداری نہیں برتی، اور کسی مداہنت اور مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا، میرا خود اسی کیمپ سے تعلق ہے، جو شرک وبدعات کے مقابلہ میں سربکف رہا ہے، بلکہ میرا تعلق اس خاندان سے ہے، جو اس سلسلہ میں بہت آگے رہا ہے اور جو شرک وبدعت کے معاملہ میں زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے، میرا نسبی و روحانی اور ذہنی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید سے ہے،، جنھوں نے اس ملک میں احیائے توحید اور سنت کی دعوت کا علم بلند کیا، اور اس کے لئے جان کی بازی لگادی، اگر میری جرأت معاف کی جائے تو میں کہوں کہ آپ کے کیمپ میں بھی یہ خیال، اور یہ دعوت

وحمیت اسی کیمپ سے آئی ہے، اس لئے مجھے یہ پوری تاریخ عزیز ہے، میں اس پورے ورثہ کو سینہ سے، بلکہ آنکھوں سے لگاتا ہوں، نہ اس پر شرمسار ہوں، اور نہ اس سے دست بردار، میری تمام تحریریں، میری حقیر کاوشیں اور کوششیں سب اسی ورثہ کی حفاظت، اس کی تبلیغ واشاعت، اور اس کی بازیافت میں صرف ہوئی ہیں ؎

میں کہ میری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

میرے کوتاہ قلم نے "**دعوت و عزیمت**" کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے، اور اس موضوع پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں، مجھ پر ان کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے بھی ذمہ داری ہے کہ میں آپ کا احتساب کروں۔

آپ ان اسلاف کے نام لیوا ہیں، جنھوں نے دین میں ادنیٰ تحریف اور مسلمانوں کے ادنیٰ انحراف کو برداشت نہیں کیا، آج معاملہ بدعات کا نہیں، آج معاملہ انگریزی تعلیم کا نہیں ہے، آج معاملہ ایک طرف شرک جلی، اصنام پرستی، اور دیومالائی عقائد (میتھالوجی) کا ہے، آج معاملہ برہمنی تہذیب اور ہندو معاشرت کے قبول کرنے کا ہے، دوسری طرف آج معاملہ مکمل لادینیت اور کمیونزم کے قبول یا رد کرنے کا ہے، آج معاملہ ایک ایسی قوم کی حیثیت اختیار کرنے کا ہے، جس کی ساری وفاداریاں ووابستگیاں اس خاک کے ساتھ ہوں، جن سے ہمارے ظاہری جسم کا خمیر اٹھا ہے، اسی کے لئے جینا اور مرنا ہو، آج کا چیلنج اور آج کا خطرہ پچھلے تمام چیلنجوں، اور خطرات سے زیادہ سنگین ہے، اور اس کے قبول کرنے کے لئے کہیں زیادہ جرأت، کہیں زیادہ ایمان اور استقامت، اور کہیں زیادہ ایثار و قربانی کی

ضرورت ہے۔

موجودہ انقلاب کی برق رفتاری وہمہ گیری

پہلے انقلاب بڑی سُست رفتاری، اور آہستہ خرامی کے ساتھ آتا تھا، جیسا زمانہ تھا۔ ویسا ہی انقلاب بھی، وہ بیل گاڑیوں، ہاتھیوں اور اونٹوں، اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار گھوڑوں کا زمانہ تھا، اس وقت انقلاب انھیں سواریوں کی رفتار سے آتا تھا، پھر ریل چلی، انقلاب ریل پر سفر کر کے آنے لگا، ہوائی جہاز چلے، انقلاب کی رفتار تیز ہوئی، اب انقلاب ایٹمی انرجی استعمال کرتا ہے آواز سے زیادہ تیز جہازوں، اور ریڈیو، اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ دم کے دم میں گھر گھر پہونچ جاتا ہے۔

جمہوریت وحکومت کے دائرے کی وسعت

آج "**سلطانئی جمہور**" کا زمانہ ہے، ہمارے اوپر پارلیمنٹ کی حکومت ہے، اور اس کو آئین سازی کا پورا اختیار، پھر حکومت کا دائرہ پہلے کی طرح دفاع، امن قائم کرنے اور ٹیکس وصول کرنے تک محدود نہیں، وہ زندگی کے تمام شعبوں اور تعلیم وتربیت کے تمام ذرائع پر حاوی ہے، اور گھر اور باہر کی کوئی چیز اس کے دائرۂ اختیار سے خارج نہیں، رات میں پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہو جاتا ہے، اور دن میں سارے ملک میں اس کا نفاذ، اس وقت ہم اور آپ یہاں جمع ہیں، ممکن ہے، اس وقت پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس ہو رہا ہو، وہاں ایک قانون بن جائے، اور ہماری زندگی میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہو، آپ کو معلوم ہے کہ پرانی حکومتیں پرائیویٹ معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں، ذاتی ملکیتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، آزاد درسگاہوں سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا، آپ جسے پرسنل لاء کہتے ہیں یعنی شادی بیاہ اور ترکے وغیرہ کا قانون، اس سے ان کا کوئی علاقہ نہیں تھا، تعلیم

میں کسی خاص عقیدے، کسی خاص فکر و مقصد پر ان کو اصرار نہ تھا، اب دنیا بدل چکی ہے، آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ آپ کس جگہ بیٹھے ہیں، زمانہ کے انقلاب نے آپ کو اس جگہ پر اچانک لا کھڑا کیا ہے؟ آج آپ اس محدود ماحول میں بہت خوش ہیں، آج آپ کو ہر طرف نورانی شکلیں نظر آتی ہیں، آپ کے کانوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے سواء کوئی صدا نہیں پڑتی، یہ آپ کا دار الحدیث ہے وہ دار التفسیر، یہ مسجد کا روحانی ماحول ہے، اور یہ مدرسہ کی علمی فضا، لیکن کل جب آپ یہاں سے جائیں گے، اور کل سے میری مراد یہ نہیں کہ جب آپ فارغ التحصیل ہو کر جائیں گے، بلکہ جب آپ چھٹیوں میں اپنے گھر جائیں گے، تو وہاں آپکوکو بہت کچھ دنیا بدلی ہوئی نظر آئیگی، میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی چھٹیوں تک اس ملک میں کیا تغیرات ہو جائیں گے، اگر آپ نے اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ نہ لیا تو آپ اس دنیامیں خود بیگانہ بن جائیں گے۔

اندرونی خطرہ

بڑے خطرے کی بات یہ ہے کہ خود مسلمان کے اندر ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے، جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں "**مدّعی سست گواہ چست**" کی مصداق ہے، وہ اگر کوئی بات ادھ کٹی، اور دبی زبان سے کہتے ہیں تو یہ اس کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کیلئے تیار ہیں، وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہاں کی مشترک تہذیب میں ضم ہو جانا چاہیئے، اور تمام امتیازات یہاں تک کہ عربی، اسلامی ناموں سے بھی چینی مسلمانوں کی طرح دست بردار ہو جانا چاہیئے، وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو ہر اس چیز سے دست بردار ہونا پڑے گا، جس میں "**من و تو**" کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور جو مسجد و کلیسا میں امتیاز

کرتی ہے، اس وقت جو ذہن ہندوستان کی قیادت کر رہا ہے، وہ ہر اس چیز سے بھڑکتا ہے، جو کسی قسم کا امتیاز اور تشخص پیدا کرتی ہے۔

تعین و وضاحت اسلام کا امتیاز

لیکن ہمارے دین کے حدود معین ہیں، ہمارے دین کے اس ""اکال **الامم**"" سرزمین میں اپنی جداگانہ شکل و صورت کے ساتھ باقی رہنے کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس میں آریائی مذاہب کی طرح اطلاقیت، یا تعینات سے گریز، اور رقت و سیالیت نہیں ہے، جس نے ہمہ اوست کے عقیدہ، یا وحدتِ ادیان کے فلسفہ کو جنم دیا، ہمارے یہاں کفر و ایمان، شرک و توحید، ضلالت و ہدایت، اور حلال و حرام کے درمیان واضح طریقہ پر خط کھینچا ہوا ہے۔

فمن یکفر بالطاغوت و یؤمن باللہ فقد إستمسك بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا(البقرہ۔۲۵۶) ترجمہ: توجو شخص سرکش سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑلی ہے، جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

وحدتِ ادیان نہیں، وحدتِ حق

وہ وحدت ادیان کا نہیں، بلکہ وحدت حق کا قائل ہے، یعنی سب دین ایک نہیں، بلکہ حق ایک ہے، وہ صاف اعلان کرتا ہے کہ :۔

فما ذا بعد الحق الا الضلٰل فانیٰ تصرفون،(سورۃ یونس، ۳۲) ترجمہ: اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سواہے ہی کیا، تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

اس کا ایک واضح اور معین نظام عقائد ہے، اس کی ایک مستقل تہذیب

ہے مکمل قانون ، اور نظام معاشرت ہے ، اس کے لئے اس کے صحیفہ میں صاف اعلان موجود ہے کہ :۔

الیوم اکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً(سورئہ مائدة . ۳) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔ یہاں نہ کوئی اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے ، نہ دوسرے کو ، یہاں دن کی روشنی ہے جس میں سپید و سیاہ صاف نظر آتے ہیں۔

دو حقیقت بیں آنکھیں

عزیزو! مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم ، اور مولانا محمد علی صاحب مونگیری بانی ندوۃ العلماء کو کس چیز نے تڑپایا؟ ایک کو یہاں ، اور دوسرے کو وہاں ، میں ان دونوں میں کچھ فرق نہیں سمجھتا ، میں ان کو ایک ہی چہرۂ زیبا کی دو آنکھوں کی طرح سمجھتا ہوں ، دونوں روشن ، دونوں پاکباز اور حقیقت بیں ، ایک ہی نور باطن اور ایک ہی فراست ایمانی دونوں میں کام کر رہی تھی ، دونوں ہی "**اتقوا فراسة المؤمن فإنه ینظر بنور الله**" کا مصداق تھے ، دونوں تعلیمی مرکزوں میں نصاب ایک وسیلہ تھا ، مقصد نہیں ، اس کے اختلافات بنیادی حیثیت نہیں رکھتے ، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور ان کے رفقاء کی تحریریں پڑھئے ، ان کی نگاہ ان جزئیات سے بہت بلند تھی ، اگر کوئی یہ سمجھے کہ انھوں نے عربی ادب کو غالب کرنے کے لئے یا تاریخ اسلام اور علوم عصریہ کو جگہ دینے کے لئے ندوۃ العلماء کی تحریک شروع کی تھی ، تو اس سے بڑھ کر کوئی حق تلفی ان کے ساتھ نہیں ہو سکتی ، دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے فتنے کا مقابلہ کیا ، ایک نے یہاں قلعہ تعمیر کیا ، دوسرے نے وہاں ،

دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے چیلنج کو قبول کیا، اور بدلے ہوئے زمانہ کے مطابق دین کے محافظ، حق کے داعی اور شریعت کے ترجمان پیدا کرنے کی کوشش کی، خدا ان دونوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے، اور ان کے تمام رفقاء اور معاونین کو جزائے خیر دے، اور ہمیں ان کے صحیح مقاصد کے سمجھنے، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اصلاح وتجدید کی تاریخ میں افراد کا مقام اور کام

میرے عزیزو! اسلام میں تجدید و اصلاح کی پوری تاریخ، افراد کی اولوالعزمی کی تاریخ ہے، کہنے کو یہ ملی اور اجتماعی تاریخ ہے، اور بیشک ہے لیکن عملاً یہ از اول تا آخر افراد کی صلاحیتوں، ان کے عزم وہمت کی نمود ہے، جب کبھی اسلام کے لئے موت وحیات کی کوئی کشمکش پیش آئی، جب کسی طرف سے دین اسلام کو للکارا گیا تو کوئی فرد کامل، کوئی صاحب عزم ہستی سامنے آگئی، ایسے موقع پر نہ کوئی کونسل بیٹھتی تھی، نہ کوئی مشورہ ہوتا تھا، کوئی صاحب یقین سامنے آجاتا تھا، اور حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیتا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، اور سیدنا حضرت حسن بصری سے لے کر خاندان ولی اللّٰہی اور ان دینی مرکزوں کے بانیوں، اور موجودہ دینی دعوتوں اور کوششوں کے علمبرداروں تک سب کا معاملہ یہی ہے کہ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

مجدد صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ

اقبال نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق بالکل صحیح کہا تھا کہ ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبر دار

انھیں کی کوششیں تھیں کہ ہندوستان کا رشتہ دین حجازی، اور محمد عربی ﷺ سے کٹنے نہیں پایا، اور وہ تہذیبی لحاظ سے برہمنیت، اور فکری واعتقادی لحاظ سے ویدانت کے آغوش میں جانے کے بجائے اسلام وشریعت محمدیؐ کی تحویل اور امانت میں رہا، انھیں کا مخفی ہاتھ تھا، جس نے اکبر کے تخت پر بالآخر محی الدین اورنگ زیب جیسے غیور اور فقیہ بادشاہ کو بٹھایا، پھر اس ملک میں تجدید واحیاء دین کا جو کچھ کام ہوا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان کا کارنامہ ہے، کیا دیوبند یا سہارن پور، کیا دہلی، کیا لکھنو، ہم سب انھیں کے خوان نعمت کے ریزہ چیں ہیں، دارالعلوم، مظاہر العلوم، اور ندوۃ اور کتاب وسنت کی تعلیم کی سب درسگاہیں(۱)، اسی ایک چراغ سے روشن کئے ہوئے ہیں، ان سب کا سلسلۂ نسب شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اخلاف نامدار، اور ان کے تلامذہ باکمال پر ختم ہوتا ہے،

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

دیوبند کے طلبہ کی ذمہ داری

آپ اس مدرسہ میں تعلیم پارہے ہیں، اس مدرسہ کا آپ سے مطالبہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے مسلمان، پاکستان کے مسلمان، ملایا کے مسلمان، اور افغانستان کے پٹھان کا بھی حق ہے، یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔

ایک ہاشمی قریشی کے مقابلہ میں جس نے اپنی بدقسمتی سے حضرت ابراہیم

(۱) مثلاً جماعت اہل حدیث کے مدارس، دربھنگہ، مئو وغیرہ میں قائم ہیں۔

اور حضور اکرم ﷺ سے اپنا رشتہ کاٹ دیا ہو وہ برہمن زادہ ہزار ہا درجہ افضل ہے، جس نے اپنا روحانی، ایمانی، اخلاقی، عقلی اور تہذیبی رشتہ سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا حضرت محمد ﷺ سے قائم کرلیا۔

کیا خوب کہا سنوسی نے ایک روز شریف مکہ سے
تو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اگر ایک ہندوستانی کا دل حجازی ہے، تو اس ہاشمی سے ہزار درجہ اچھا ہے جو اپنے خاندان اور نسب پر، یا جاہلیتِ عرب پر فخر کرتا ہے، جو ابو جہل اور ابو لہب کی اولاد ہونے پر فخر کرتا ہے، اور ملتِ ابراہیمؑ کی تہذیب اور خصوصیات سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اسی بنا پر علامہ اقبال نے جو ایک نو مسلم خاندان کے چشم و چراغ تھے، ایک سید زادہ کو خطاب کرتے ہوئے دین و شریعت کی پیروی کی اس طرح تلقین کی۔

میں اصل کا خاص سومناتی آباء میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد میرے کفِ خاک برہمن زاد
دیں مسلک زندگی کی تقویم دیں سر محمدؐ و ابراہیمؑ
دل در سخن محمدیؐ بند اے پور علیؓ زبو علی چند؟

فانی رشتے

دنیا کے سب رشتے فانی ہیں، یہ تمام مادی رشتے باقی رہنے والے نہیں، نہ ہاشمی رہے گا نہ عربی، نہ ہندوستانی رہے نہ ملائی، نہ انڈونیشی رہیگا نہ جاوی، بس اللہ کا نام باقی رہے گا، اور اللہ کے لئے خلوص باقی رہیگا، نام و نسب کے اختلاف، اور خاندانوں کی کمتری اور برتری سب فانی اور ہیچ ہیں، اللہ تعالیٰ کو دین عزیز ہے،

اخلاص اور للّٰہیت عزیز ہے، ابراہیمیت و محمدیت عزیز ہے، اور اس کے باقی رہنے کا اللہ نے فیصلہ کیا ہے ؎

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

ہمارے دو فیصلے

ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت بدل نہیں سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری یا بے چارگی پر مبنی نہیں، ہم نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، اور اپنی پوری مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت، اور دستور و آئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی خصوصیات، اپنے عقائد و شعائر، اپنی زبان و تہذیب، اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں، اس ملک میں رہیں، اس لئے کہ اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں، بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں، اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک کی خاک سے تیار ہوا ہے،

اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے، اور مسلمان جس ملک میں بھی رہے گا، اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر و ترقی میں شریک، اور اس کی دستور سازی میں دخیل ہیں، اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے، اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

زندگی اور موت اسلام پر

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسلام و ایمان پر قائم رہنے کی کوشش کریں، اسی پر زندگی گذاریں، اور جب موت آئے تو اسی دین وملت پر آئے :۔

ولاتموتن اِلا وانتم مسلمون . (آل عمران. ۱۰۲) تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

اسی کی وصیت ابراہیم ویعقوب علیہم السلام نے اپنی اولاد کو کی :۔

ووصی بھا ابراھیم بنیه ویعقوب . یابنی ان اللہ اصطفی لکم الدین فلاتموتن الا وانتم مسلمون. (البقر. ۱۳۲) اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی، اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنی اولاد کو کی، انہوں نے کہا تھا کہ "میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا"۔

شریعتِ اسلامی نے ایک مسلمان کے لئے پیدائش سے لے کر موت تک اس کے انتظامات کئے ہیں، اور ایسا ماحول تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں مسلمان اس حقیقت کو فراموش نہ کرنے پائے، اس کو ہر وقت یاد رہے کہ اس کا تعلق اس دین وملت سے ہے، جس کے داعی ابراہیم ومحمد علیہما السلام تھے، جس کی بنیاد توحید پر ہے، اور وہ ایک الگ "**اُمت**" ہیں مسلمان بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے، اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے، اس کا اسلامی نام رکھا جاتا ہے، ناموں میں ان ناموں کو ترجیح دی گئی ہے جن میں عبدیت وحمد کا اظہار ہے، اس سے ابراہیمی سنتیں ادا کرائی جاتی ہیں، اور جب وہ مرتا ہے تو سب اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں :۔

اللهم من احييته منا فاحيه على الاسلام ومن توفيته منا فتوفه على الإيمان. اے اللہ! ہم میں سے تو جس کو زندہ رکھے اس کو اسلام پر زندہ رکھیو، اور جس کو تو موت دے تو اس کو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھائیو۔

یہاں تک کہ قبر میں اتارتے ہوئے اور آخری ٹھکانے پر پہونچاتے ہوئے بھی یہی الفاظ زبان پر ہوتے ہیں :۔

بسم الله وعلى ملة رسول الله. اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کے دین وملت پر۔

اس سب کا مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، اور زندگی کی ہر منزل پر اس کو یاد رکھنا ہے کہ ہم ملتِ ابراہیمی اور اُمت محمدی کے فرد، اور ایک مخصوص شریعت اور آئین ومسلکِ زندگی کے پیرو، اور خدا کے موحد اور وفادار بندے ہیں، ہماری زندگی بھی اسی آئین ومسلک کی وفاداری میں گذرے، اور

ہمیں موت بھی اسی حال میں آئے، ہماری موجودہ نسلیں بھی اسی راستہ پر گامزن رہیں، اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اسی صراط مستقیم پر چلیں۔

ملت ابراہیمی اور دینِ محمدی کی اس دعوت کو آج صراحت اور تعین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہ اس تہذیب کی دعوت ہے، جس کی بنا ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی ہے، اور تکمیل و تجدید حضور ﷺ نے فرمائی ہے، اجتماع واخلاق میں اس کے کچھ معین اور خاص اصول ہیں، یہ فرد کی حریت اور فلاح کی ضامن ہے، چند معیّن عقائد، معیّن اصولوں اور معیّن کرداروں نے اس کو وجود بخشا ہے، یہ ابراہیم علیہ السلام اور محمد ﷺ کی مشترکہ دعوت اور میراث ہے، اور اس کے سوا کوئی تیسری چیز خدا کو قبول نہیں۔

نازک امانت

آج مسلمانوں کی قوتِ ایمانی کا بھی امتحان ہے، اور ذہانت کا بھی، قوتِ فیصلہ کا بھی امتحان ہے اور زندگی کی صلاحیتوں کا بھی، ہم کو ثابت کرنا ہے کہ ہم ایمان کے ساتھ زندہ رہنے کے اہل ہیں یا نہیں، ہم جہاں رہیں اس ملک کی خصوصیات اپنے اندر خوشی سے پیدا کریں، وہاں کی زبانیں سیکھیں، اور بچوں کو پڑھائیں، اپنا حصہ رسدی حاصل کریں، ملک کے نظم ونسق (ایڈ منسٹریشن)-(ADMINIS TRATION) میں اپنے شایانِ شان حصہ لیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ داعی بھی رہیں، مومن بھی رہیں، توحید کا اعلان بھی کریں، اور پیغام پہنچانے والے بھی بنیں، خدا کے یہاں ہم سے سوال ہوگا کہ اللہ نے ہم کو سیکڑوں برس اس ملک میں باقی رکھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ اور محمد ﷺ کی دعوت، اور آپ کا دین کیوں ہمارے اندر محدود رہا، اس کو پھیلنا اور وسیع ہونا چاہئے تھا۔

قومِ موسیٰ کی تقلید سے بچئے!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کاایک عبرت انگیز واقعہ بیان کیا ہے، جس میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے، اس کو خود قرآن مجید کی زبان سے سنئے :۔

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علی قومٍ یعکفون علی اصنام لھم. قالوا یٰموسی اجعل لنا الٰھاً کمالھم الھة. قال انکم قوم تجھلون. ان ھٰؤلاء متبر ماھم فیہ وبٰطل ماکانوا یعملون. قال اغیر اللہ ابغیکم الٰھا و ھو فضلکم علی العالمین. (الاعراف. ۱۳۸تا۱۴۰) بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گذار دیا، پھر وہ چلے اور راستہ میں ایک ایسی قوم پر ان کا گذر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی کہنے لگے "اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنادے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں" موسیٰ نے کہا "تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو، یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں، وہ تو برباد ہونے والا ہے، اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے، پھر موسیٰ نے کہا "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں" حالانکہ وہ اللہ ہی ہے، جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو اپنی صحیح معرفت عطا فرمائی اور توحید کی اس دولت سے نوازا جس سے بڑی کوئی دولت نہیں، ان کے اندر ایمان پیدا کیا، وہ یہ سمجھے کہ اللہ کے سوا اس دنیا میں کوئی پرستش اور بندگی کے لائق نہیں، اور اس کے سوا اس دنیا میں کسی کی حکومت

نہیں، لیکن وہ ایسے ناقدردان اور نادان تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ ایک میلہ دیکھا کہ جس میں خدا کے سوا اور ہستیوں کو لوگ پوج رہے تھے، اس منظر کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا کہ اگر ہمارے لئے بھی ایسے ہی معبود تجویز کر دیئے جاتے جن کے سامنے ہم اپنے ذوقِ عبودیت کا اظہار کرتے تو کیسی رونق اور بہار ہوتی، انہوں نے کہا :۔

یاموسی اجعل لنا الٰھا کمالھم الھة (الاعراف.۱۳۸) اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنادے جیسے ان لوگوں کے لئے معبود ہیں۔

اے موسیٰ! ہمارے لئے ایسے ہی کوئی ظاہری اور مجسم شکل میں معبود تجویز کر دیجئے، جیسا کہ ان کے پاس ہے، اپنے وقت کا موحّد اعظم بولا "**انکم قوم تجھلون**" تم پرلے درجہ کے نادان ہو، تمہاری عقل پر پتھر پڑے ہیں، تمہیں نظر نہیں آتا؟" **انّ ھٰؤلاء متبر ماھم فیه وباطل ماکانوا یعملون**" جو یہ کر رہے ہیں، وہ خاک میں مل جانے والا ہے، وہ کچھ کام آنے والا نہیں، اس کے بعد انہوں نے ذرا سمجھا کر کہا :۔

قال اغیر اللہ ابغیکم الٰھا وھو فضلکم علی العالمین. (الاعراف. ۱۴۰) پھر موسیٰؑ نے کہا "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے"۔

اللہ کے بندو! خدا تمہارے حال پر رحم کرے، خدا تمہیں عقل اور سمجھ دے، "**اغیر اللہ ابغیکم الٰھا**" میں خدا کو چھوڑ کر تمہارے لئے اور کوئی خدا لاؤں؟ "**وھو فضلکم علی العالمین**" حالانکہ اس نے تم کو تمام دنیا پر (اسی

عقیدۂ توحید کی بناء پر) فضیلت دی ہے، اور تم کہتے ہو کہ اس فضیلت دینے والے، احسان کرنے والے خدا کو چھوڑ کر جس نے فرعون کی غلامی سے تم کو نجات دی، میں کوئی عاجز اور بے اختیار خدا تمہارے سامنے لے آؤں۔

دائمی جدوجہد

ایک خصوصیت خاندانِ ابراہیمی کی یہ ہے کہ جہاں رہے گا، حق کے لئے سینہ سپر رہے گا، توحید کی صدا بلند کرتا رہے گا، اللہ کے راستہ کی طرف سب کو بلاتا رہے گا، یہ سعادت قیامت تک کے لئے، ملتِ ابراہیمؑ کے لئے مقرر اور مقدر ہو چکی ہے، جس نے اللہ کے نام کا جھنڈا بلند کیا، دنیا کے کسی گوشہ اور کسی حصہ میں آپ اگر سراغ لگائیں گے، اور تحقیق کریں گے تو سیدنا ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے اس کا رشتہ ملتا ہوگا، دنیا میں بار بار جنگیں ہوئیں، ماضی قریب میں دو عالمگیر جنگیں ہو چکی ہیں، اور وہ دنیا پر سخت تباہی لائیں، لیکن ان میں سے کوئی خاندانِ ابراہیمی کی جنگ نہیں تھی، اس جنگ میں خاندان ابراہیمی کی کوئی شاخ فریق نہیں تھی، یہ پیٹ کے لئے تھی، یہ بازاروں کے لئے تھی، مارکیٹ حاصل کرنے کے لئے تھی، حکومت اور اقتدار کے لئے تھی، یہ ہوا و ہوس کی جنگ تھی، اس لئے کہ یہ ملت ابراہیمی کی طرف سے نہیں لڑی گئی تھی۔

آج ساری دنیا میں جس کو دیکھیں گے کہ وہ اللہ کے نام کی رٹ لگاتا ہے، خود بھی لیتا ہے، دوسروں کو بھی تلقین کرتا ہے، اگر تحقیق کریں گے تو وہ ابراہیمی و محمدی نکلے گا اس کا تعلق دور سے یا قریب سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے نکلے گا، یا ان کی صلبی اولاد میں ہے، یا ان کے داعیوں اور

مُنادیوں کے ذریعہ وہ ان کے معنوی خاندان میں داخل ہو چکا ہے، قیامت تک کے لئے توحید کا اعلان، قیامت تک کے لئے ایمان کی دعوت، قیامت تک کے لئے خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی دعوت، قیامت تک کے لئے دینی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ نے خاندانِ ابراہیمی کے سُپرد کر دیا ہے، ہر جگہ، ہر زمانہ میں، خاندانِ ابراہیمی کا کوئی سر پھرا ملاح موجوں سے ٹکراتا رہے گا، دھارے کے خلاف کشتی کو چلاتا رہے گا، بازو شل ہو جاتے ہیں، پتوار جواب دے جاتے ہیں، موجیں گستاخیاں کرتی ہیں، مگر خاندانِ ابراہیمی کا ملاح ہے کہ ؎

ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خُسروانہ

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

تحقیق وانصاف کی عدالت میں
ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ

حضرت سید احمدؒ شہید کے
عظیم اصلاحی مجاہدانہ کارناموں پر ایک
اجمالی نظر اور اپنوں اور پرایوں کی ان
کوتاہیوں اور زیادتیوں کی نشاندہی اور دل
خراش داستان جو ان کے حق میں روا رکھی
گئیں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید
ابوالحسن علیؒ ندوی کی ایک شاہکار تحریر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحقیق وانصاف کی عدالت میں
ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ

اصلاح وتجدید کاوسیع ترین محاذ

حضرت سیّد احمد شہید (۱۲۰۱ھ تا ۱۲۴۶ھ) نے اس تحتی برّ اعظم میں جس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی، اس کی نظیر جامعیت، قوت تاثیر اور اسلام کی اولین دعوت اور طریق نبوت سے قرب و مناسبت میں نہ صرف تیرہویں صدی میں ہمیں نظر نہیں آتی ہے، جو اس کا عہد ہے بلکہ گذشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جیسی ایمان آفریں تحریک اور صادقین و مخلصین کی ایسی مربوط و منظم جماعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا، وہ عقائد واعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ اور جہاد و سرفروشی کے وسیع وطویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے اس کا اثر صرف ان کے میدان کارزار اور ان کی معاصر نسل تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے آئندہ نسل، اپنے بعد آنے والے اہل حق، اصحاب دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے، بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے مقابلہ کی اور

ہندوستان اور اس کے پڑوسی مسلم ممالک کی حفاظت کی جدو جہد کی ابتدا بھی آپ ہی نے کی، اس تحریک اور جدو جہد کی زمام قیادت ہندوستان میں اول اول انھیں کی جماعت کے علماء اور قائدین کی ہاتھ میں رہی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ ونشرواشاعت کی جدید تحریک (جس نے اس وسیع و عمیق خلیج کو پُر کیا جو مسلم عوام اور صحیح اسلامی تعلیمات اور کتاب وسنت کے درمیان پائی جاتی تھی) انھیں کی کوششوں کی رہین منّت ہے، مسلمانوں کی دینی وسیاسی بیداری بلاواسطہ اسی دعوت و تحریک کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس نے مسلمانوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اچانک بیدار کر دیا اور ان کے اعصاب واحساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس تحریک کے اثرات علم وادب، فکر اسلامی اور زبان واسالیب بیان (۱) پر بھی پڑے۔ اس لئے کہ سیّد صاحب اور ان کے رفقاء کی دعوت عوامی تھی جس نے اردو زبان کو مفاہمت و گفتگو اور خواص و عوام کو عمیق مطالب و معانی سے آشنا کرنے اور ان کے قلب ودماغ میں ان مطالب کو دلنشین وراسخ کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اس مقصد سے انھوں نے اس زبان کی تسہیل وترقی اور تراش وخراش کا پورا خیال رکھا اور اس کو فارسی زبان کا قائم مقام بنادیا جو اس زمانہ میں علم وادب اور تصنیف وتالیف کی واحد زبان سمجھی جاتی تھی۔ اس میں جو خیال آرائی اور صنعت لفظی شامل ہو گئی تھی اس کا حصّہ بھی اس میں کم کیا گیا اور اس کے نتیجے میں زبان وادب کا ایک مستقل دبستان وجود میں آ گیا۔

رائے بریلی کی تربیت گاہ سے بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک

سیّد صاحبؒ نے توحید کے عقیدۂ خالص (۲) کی دعوت پر اپنی تحریک کی بنیاد رکھی اور الا لِلّٰہِ الدین الخالص (دیکھو خالص عبادت صرف خدا ہی کے

لئے (زیبا) ہے) کا آوازہ اس جرأت اور بلند آہنگی سے بلند کیا، جس سے دشت وجبل گونج اُٹھے۔ ہمارے علم میں اس ملک میں اس سے پہلے اس بلند آہنگی سے یہ صدا بلند نہیں ہوئی تھی، انھوں نے مسلمانوں میں ایمان ویقین، جذبۂ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی۔ ایک بڑی جماعت کو داعیانہ اور مجاہدانہ بنیادوں پر منظّم کیا۔ ان کی ایسی مستحکم اور جامع دینی تربیت کی جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط اور حاوی تھی اور جس کی جڑیں ان کے دل و دماغ اور روح میں پیوست تھیں۔

۷ ار جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ کو مجاہدین فی سبیل اللہ کا یہ قافلہ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد (پشاور و مردان کے آزاد قبائلی علاقہ) تک جا پہنچا اور اس نے اس علاقہ کو دعوت و جہاد کا مرکز بنایا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ یہاں سے اپنے کام کا آغاز کریں گے اور انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کر کے اس پورے علاقہ میں کتاب و سنت کی بنیاد پر عادلانہ حکومت قائم کریں گے۔ اس کے لئے انھوں نے مسلمانوں میں جوش ایمانی اور حمیت دینی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اہل الرائے اصحاب اقتدار اور نوابین و امراء کو اس خطرے سے آگاہ کیا جو انگریزی اقتدار کی شکل میں ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا اور جس کی زد میں ہندوستان کے علاوہ برّ صغیر کے مرکز اسلام اور ممالک عربیّہ بھی تھے۔ اور جو ان کی پوری شخصیت اور وجود کو مٹا دینے کے درپے تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور انکے توسیع پسندانہ منصوبوں سے بھی ان کو متنبہ کیا۔ نوابوں اور راجوں مہراجوں نیز آزاد ممالک کابل، ہرات اور بخارا کے امراء سے رابطہ قائم کیا، ان کے پاس اپنے قاصد بھیجے اور ان کو بار بار ایسے مؤثر بلکہ دلدوز اور طاقت و حرارت اور ایمانی غیرت و حمیت سے بھرے ہوئے خطوط لکھے جس میں ایک مومن کامل کی

فراست، رہنما اور قافلہ سالار کی عالی ہمتی واولوالعزمی اور ایک ایسے امام وقت اور دینی مصلح و مربی کی دلسوزی خلوص اور شفقت (جس کو اللہ تعالی کسی بڑے کام کے لیے تیار فرماتا ہے) صاف جھلک رہی تھی۔ اپنی عالی ہمتی اور دور اندیشی اور خطرات کے پورے احساس میں وہ نہ صرف اپنے عہد میں صف اوّل کے مدبّر اور ماہرین سیاست وامور سلطنت سے آگے تھے بلکہ ان کے بعد سیاست دانوں کی رسائی بھی ان بلندیوں تک نہ ہو سکی، جہاں انکے شہباز فکر و عمل نے اپنا آشیانہ بنایا تھا۔

یہ دراصل سنت نبوی ﷺ کی ترویج اور اسلام کے مٹتے ہوئے نشانات کے احیا، جاہلیت کے مقابلے میں اسلام اور بدعت کے مقابلے میں سنت کا پرچم بلند کرنے، مسلمانوں میں احکام شریعت کے اجراء اور ان کو دین میں بتمام وکمال داخل ہونے کی دعوت تھی، جس میں کسی سیاسی مفاد، ذاتی مصلحت اور دنیا میں سربلندی ونام آوری کی خواہش بالکل شامل نہ تھی۔ (۳)

ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد تک پہنچنے کے لئے آپ نے صوبجات متحدہ مالوہ کے علاقوں اور راجپوتانہ، مارواڑ، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے ریگستان، درّوں، جنگلوں دریاؤں اور دلدلی علاقوں کو طے کیا، جن کو طے کرنا ایک مستقل جہاد تھا، بعض جگہ پانی کی قلت، سامان کی کمی، مقامات کی دشوار گذاری، قزاقوں کا خطرہ، بھوک اور پیاس کی شدت، اجنبی قوموں، نئی زبانوں اور نرم گرم مزاجوں کا سامنا کرنا پڑا، آپ نے پورے قافلہ کے ساتھ درّہ بولان کا وہ تنگ اور خطرناک راستہ طے کیا جو افغانستان کے داخلہ کا ایک قدرتی راستہ ہے اور جس کو قدرت الہی نے اولوالعزم فاتحین کے لئے اس طویل سلسلہ کوہ میں پیدا کر دیا ہے،

دراصل یہ ایک طویل اور گہری کھائی ہے جو کوہ براہنک (Brahtuick) کو کاٹتی ہوئی چلی گئی ہے۔ دونوں طرف بلند پہاڑوں کی فلک پیماں دیواریں ہیں جن کی بلندی سطح سندر سے پانچ ہزار ساٹ سو فٹ تک ہے۔ اس درّہ کی چوڑان بالعموم چار پانچ سو گز کے درمیان ہے اس کے بعد کوزک کا وہ تنگ اور مہیب درّہ واقع ہے جو قندہار سے قبل، جبلِ توبہ سے ہو کر گزرتا ہے۔

قندہار، غزنی اور کابل میں آپ کا جس طرح شاہانہ استقبال کیا گیا ایسا استقبال طویل عرصہ سے کسی حاکم وقت یا ملکی رہنما اور عالم دین کا نہیں ہوا تھا۔ یہ پورا علاقہ سرکاری وغیر سرکاری ہر سطح پر ان کے استقبال کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس استقبال و بے مثال خیر مقدم میں جوش ایمانی بھی تھا اور افغانیوں کی کریم النفسی اور جذبۂ مہمان نوازی بھی، ان کی امنگیں اور آرزوئیں اور موجودہ حالات سے ان کی بے اطمینانی بھی، ان کو اپنی تاریخ کے اس اہم دور میں ایک ایسی مخلصانہ قیادت کی ضرورت تھی جو ان کی از سر نو شیرازہ بندی کر سکے، خاندانی وقبائلی حکومتوں سے ان کو نجات دلائے اور ان کی طاقتوں اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرے جن سے کام لیکر انھوں نے بارہا اس ملک کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا لیکن اسلام کی نعمت سے مالامال اور خون شہادت سے لالہ زار کیا تھا۔

وہاں سے آپ پشاور اور ہشت نگر تشریف لے گئے۔ یہاں بھی وارفتگی اور محبت کے وہی مناظر سامنے آئے جو اس پورے سفر میں دیکھے جارہے تھے۔ ہشت نگر میں چند دن قیام کرتے ہوئے اور مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کرتے ہوئے آپ نوشہرہ تشریف لے گئے اور یہاں سے جہاد جیسے محبوب عمل اور عظیم

عبادت کا آغاز فرمایا جو برسوں کی دعوت و تبلیغ اور جدّو جہد کا ما حصل اور اس پُر مشقت سفر کا مقصد تھا۔ نوشہرہ سے آپ نے رنجیت سنگھ کو ایک اطلاع نامہ بھیجا، جس میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی گئی ورنہ جزیہ دینے اور اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ان دونوں مطالبوں کو قبول نہ کرنے کی صورت میں جنگ کی اطلاع دی گئی تھی۔

۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ میں آپ نے بیعت امامت لی۔ آپ کے نام سے جمعہ کا خطبہ پڑھا گیا اور لوگ کثیر تعداد میں آپ سے بیعت ہونا شروع ہوئے، مختلف ریاستوں کے امراء، سرداران قبائل اور جلیل القدر علما و مشائخ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور سمع وطاعت اور راہ خدا میں جہاد پر آپ سے بیعت کی، اس کے بعد ان حضرات نے حکومت پشاور کو اپنے اس اقدام کی اطلاع کی۔ حکام واہل اقتدار نے ان کی تائید و توثیق کی اور خود بھی آپ سے بیعت ہونے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس کے بعد حضرت سیّد صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحبؒ نے ہندوستان کے علماء و سربرآوردہ اشخاص کے نام خطوط روانہ کئے اور انکو اس اہم واقعہ کی اطلاع دی۔ ان تمام حضرات نے اس پر اپنی مسرت واطمینان کا اظہار کیا اور سیّد صاحبؒ کی تائید کی۔ سردار یار محمد خاں، سلطان محمد خاں (امرائے پشاور) اور آخر میں ان کے بھائی سردار پیر محمد خاں نے بھی آپ سے بیعت کر لی۔ چنانچہ شیدو کے معرکہ میں آپ کے پرچم کے نیچے تقریباً ایک لاکھ مجاہد جمع تھے۔

حکومت لاہور کے ساتھ جنگ کا آغاز خالص اسلامی طریقہ (۴) پر سنت نبویؐ کے مطابق کیا گیا، سکھ اس وقت پنجاب پر قابض تھے۔ ہندوستان کے شمالی مغربی سرحد میں اور آزاد قبائل پر بھی ان کا ایک گونہ تسلط قائم تھا۔ افغانستان

کی سالمیت اور وجود بھی ان کی وجہ سے خطرہ میں تھااور وہ کئی بار اس پر فوج کشی کر چکے تھے۔ پنجاب کے مسلمان جو عددی اکثریت میں تھے اور پانچویں صدی ہجری سے اب تک اس کے حکمراں چلے آرہے تھے سخت تذلیل واہانت کا نشانہ تھے اور اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ان کی مدد کی جائے، اور مظالم کا سدّ باب کیا جائے اور وہ خطرہ دور ہو جو قریب کے اسلامی ملکوں کو اس کی وجہ سے لاحق ہو گیا تھا۔

اس کے علاوہ پنجاب کی جنگی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت تھی۔ یہ جنگ رنجیت سنگھ کے خلاف تھی جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر کا ممتاز ترین جنگی قائدوسپہ سالار اور اپنے عہد کا سب سے طاقت ور فوجی حکمراں تھا۔ تاہم مجاہدین اکثر معرکوں میں کامیاب رہے اور ان فوجوں پر غالب آئے جن کو پنجاب کا حکمراں ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھااور جن کا سربراہ کبھی کبھی ان دو تجربہ کار اطالوی کمانڈروں کو بنایا جاتا تھاجو یورپ کی جنگوں میں نپولین کی آزمودہ کار فوج کے جنرلوں میں تھے، یہ جنرل ونیٹورہ (VANTURA) اور جنرل الارڈ (AL-LARD) تھے۔اس موقع پر مجاہدین کی صفوں میں شجاعت وجوانمردی، شوق شہادت، امیر کی اطاعت اور امن وجنگ، دونوں حالتوں میں احکام شریعت کی کامل پیروی کے ایسے نمونے نظر آئے، جن سے اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہو گئی، انھوں نے ہندوستان کی شمالی ومغربی سرحد میں جس میں پشاور اور اس کے نواح شامل تھے عملاً ایک صحیح اسلامی حکومت قائم کر لی۔ حدود شرعیہ کا باقاعدہ اجراء ہوا، مالیات، نظم وانتظام ہر شعبے میں احکام اسلامی کا حرف بحرف نفاذ کیا گیا۔ اس وقت تاریخ نے طویل صدیوں کے بعد ان مسلم حکومتوں کے درمیان

(جن کو ہم احکام شریعت اور اسلامی قوانین سے بے اعتنائی کی وجہ سے سیکولر یا نا مذہبی کہہ سکتے ہیں) خلافِ راشدہ کا ایک زندہ عملی نمونہ دیکھا۔

لیکن افسوس کہ یہ مبارک تغیر و انقلاب زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کیا جاسکا اور یہاں بھی وہی ہوا جو تاریخ اسلام میں بارہا پیش آیا ہے۔ شخصی و قبائلی جذبات و مفادات نے سر اٹھایا اور زخم خوردہ و مشتعل جاہلیت نے اپنی شکست وذلت کا بدلہ لینے کے لئے اس کمزوری کو پوری طرح استعمال کیا (جو مفاد پرستوں اور رسم ورواج کے پرستاروں میں ہمیشہ سے پائی جاتی ہے) اس علاقہ میں جو قبائل آباد تھے وہ ابھی تک اپنے ذاتی اغراض اور قبائلی رسم ورواج کے اثر سے پوری طرح آزاد نہ تھے۔ چنانچہ بعض امراء و سرداران قبائل سلطان محمد خاں والی پشاور کی سربراہی میں اس کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہو گئے۔ یہ سلطان محمد خاں وہ شخص ہے، جس کو سیدؒ صاحبؒ نے پشاور کا علاقہ (فتح کر لینے کے بعد) اس وعدہ پر حوالہ کیا تھا اور اس پر اس سے پورا عہد و پیان لیا تھا کہ وہ یہاں حدود شرعیہ کا اجراء اور اعلاء کلمۃ اللہ کا فرض انجام دیگا (جو اس تگ ودود اور جانفشانی کا اصل مقصد تھا اور جس کے لئے پشاور فتح کیا گیا تھا) لیکن اسکے آدمیوں نے شعبۂ احتساب و قضا کے ان عمال و مصلحین کو جو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، (۵) اس قدر سفاکی اور بے رحمی سے تہ تیغ کیا کہ اس کی مثال انقلابات اور بغاوتوں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ بعد میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ دراصل ایک منظم سازش تھی جس میں تمام سرداران قبائل ملوث تھے اور وہ لوگ اس میں شریک تھے۔ انھوں نے اس پورے نظام کو تہ وبالا کر دیا۔ اس وقت یہ مجاہدین اس پر مجبور ہوئے کہ کسی دوسری جگہ اپنا مرکز و مستقر بنائیں اور اپنے عظیم مقصد نظام اسلام کے قیام کے لئے از سر نو کوشش کریں،

چنانچہ انھوں نے اپنا رخ ہزارہ اور وادیٔ کشمیر کی طرف کر دیا۔ ان کو اس علاقہ کے امراء و سرداروں کی طرف سے یہاں آنے کی پیش کش کی گئی تھی اور انکی حمایت کا پورا وعدہ کیا گیا تھا۔

کشمیر کے راستہ ہی میں بالاکوٹ کا (جو وادیِ کاغان میں دو بلند پہاڑیوں کے درمیان ایک بستی ہے) آخری معرکہ پیش آیا۔ بعض ضمیر فروش مسلمانوں نے غنیم کو اس کی مخبری کر دی اور تنگ و پیچیدہ راستوں پر مخالف فوج کی رہنمائی کر کے اس کو یہاں پہنچادیا۔ خود رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ اس فوج کی کمان کر رہا تھا۔ یہاں آخری معرکہ پیش آیا جس میں حضرت سیدؒ صاحبؒ، مولانا شاہ اسمٰعیل صاحبؒ اور بہت سے دوسرے اکابر علماء اور مجاہد درجہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اس معرکہ میں سر فروشی و جانبازی و شجاعت و بسالت کے وہ محیّر العقول نمونے دیکھنے میں آئے جو چشم فلک نے عرصہ دراز سے نہیں دیکھے تھے۔ یہ واقعہ ہائلہ ۲۴۔ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶/ مئی ۱۸۳۱ء میں پیش آیا۔

مجاہدین برطانوی حکومت کے مقابلے میں

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت سیدّ صاحبؒ کے خلفاء اور رفقاءِ کار نے مولانا ولایت علیؒ عظیم آبادی اور ان کے بھائیوں اور بیٹوں کی قیادت و امارت میں آزاد قبائل کے درمیان علاقہ ستھانہ میں مجاہدین کا مضبوط مرکز قائم کیا۔ اور اب اس جہاد و قربانی کا رخ سکھوں سے ہٹ کر جنکی سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا (۶) انگریزوں کی طرف ہو گیا جو ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور یہاں ان کی ایک طاقتور اور منظّم حکومت قائم ہو چکی تھی۔ رخ کی، یہ بدیلی ان بلند و حقیقی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ تھی جو شروع سے سیدّ صاحب کے سامنے رہے، یہ مقاصد ان

کے ان مکاتیب سے پوری طرح ظاہر وآشکار ہیں،جو انھوں نے ہندوستان کے نوابین، راجگان اور وسط ایشیا کے مسلم سربراہان سلطنت کے نام لکھے تھے۔

جہاد و قربانی کی یہ نئی مہم ایسے حوادث و مصائب کی داستان ہے جس کو سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ یہ مسلسل جنگوں اور معرکہ آرائیوں کا سلسلہ تھا جو قتل و غارت گری، املاک و جائداد کی ضبطی، طویل مقدمات، جلاوطنی، اخراج اور ایسی تحقیق و تفتیش پر مشتمل تھا جو قرون وسطیٰ میں یورپ کی عدالتوں (INQUISATION) کے ساتھ مخصوص تھا۔ اگر جاں نثاری، ایثار و قربانی اور ہمّت وجوانمردی کے وہ سارے کارنامے، جو اس ملک کے جہاد حریّت اور قومی آزادی کی تاریخ کی زینت اور س کا سرمایہ فخر ہیں ایک پلڑہ میں رکھے جائیں اور اہل صادق پور (خاندان مولانا ولایت علیؒ عظیم آبادی) کے کارنامے اور قربانیاں ایک پلڑہ میں تو آخر الذکر کا پلڑہ نمایاں طور پر بھاری ہوگا۔(۷)

حیرت انگیز تربیّت اور تنظیم

جہاد، تنظیم جماعت، مالی امداد اور مجاہدین کے مرکز ستھانہ تک رضاکاروں کو پہچانے کے لئے ایک جال بچھادیا گیا تھا اور اس مقصد کے لئے بہار اور بنگال میں کئی خفیہ مرکز تھے جو ایک خفیہ زبان میں مراسلت کرتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں وفادار اور رضاکار تھے جو امیر کے اشارے پر چلنے کے لئے تیار تھے اور انگریزی حکومت دھمکی اور لالچ کے ذریعہ بھی ان کو اس سے باز رکھنے سے قاصر تھی۔(۸)

اس تحریک نے بنگالیوں میں شجاعت وبہادری، اسلامی جوش، دینی حمیّت، زندگی کی وقعت، روح سپہ گری، راہ خدا میں شہادت کا ذوق، اسلامی اتحاد کا

جذبہ اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت پر اپنی مصلحت کو قربان کر دینے کا حوصلہ اور اصولوں پر ثابت قدم رہنے کی عجیب وغریب طاقت پیدا کر دی تھی اور اس قوم کو (جس کی شہ سواری وسپہ گری اور جہاد وقتال کے میدان میں اس کے کارنامے دنیا نے عرصہ سے نہیں دیکھے تھے) ایک جنگجو اور بہادر قوم بنادیا۔

مسٹر جیمس او کنیلی لکھتا ہے :۔

> "کمزور اور بزدل بنگالی مسلمان خونخواری اور جوش جہاد میں افغانیوں سے کم نہ تھے۔"

عقیدہ کی پختگی اور دینی دعوت وتربیت کے اثر سے شیطان ان کے اندر جاہلی حمیّت اور لسانی تہذیبی یا نسلی وقومی تعصّب پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا وہ صرف اسلام پر فخر کرتے تھے اور اس کی خدمت، اشاعت و تبلیغ، اعمال صالحہ اور اخلاق عالیہ کو اصل معیار سمجھتے تھے۔

علمائے صادق پور نے مسلمانوں کی تنظیم، نظام شرعی کے قیام، مجاہدین کی تربیّت، تصحیح عقائد اور اصلاح اعمال واخلاق کا جو عجیب وغریب نظام قائم کیا تھا وہ اپنی وسعت واستحکام، مبلغین کی سیرت واخلاق اور جوش وایثار میں اپنی نظیر آپ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے داخلہ ہند سے لے کر ۱۸۶۴ء تک اس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس جماعت وتحریک کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں لکھتا ہے :

> "یہ لوگ مشنریوں کی طرح انتھک کام کرتے تھے، وہ بے لوث وبے نفس لوگ تھے جن کا طریق زندگی ہر شبہ سے بالا تر تھا اور روپیہ اور آدمی پہنچانے کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔

ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔"

"میرے لئے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں، ان میں سے اکثر نہایت مقدس و مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لئے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے۔"

جہاں تک مجھے تجربہ ہے یہ یقینی ہے کہ "**وہابی**" مبلغین سب سے بڑے روحانی اور کم سے کم خود غرض نوع کے لوگ ہیں۔"

"یحی علی (۹) کی مردم شناسی اور حسن انتخاب قابل داد ہے۔ ان کے انتخاب کئے ہوئے آدمیوں میں ایک شخص کو پکڑے جانے کا خوف و خطرہ شناخت ہو جانا، انعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے خلاف آمادہ نہ کر سکا۔"

اس تنظیم کی وسعت اور جماعت کی اعلیٰ سیرت کے متعلق بنگال کے اس وقت کے کمشنر پولس کی شہادت کافی ہے کہ:

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اسّی اسّی ہزار ہیں، ان میں آپس میں مکمل مساوات ہے۔ ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہے اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں اس کو کسی بات سے عذر نہیں ہوتا۔" (۱۰)

یہاں تک کہ بالآخر ۱۸۵۷ء کی وہ جنگ آزادی پیش آئی (جس کو برطانوی حکومت نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے مشہور کیا) اس کی قیادت اصلاً مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور اس میں جماعت مجاہدین کے بچے کھچے افراد کا قائدانہ حصہ تھا۔(۱۱) اور برادران وطن بھی اس میں شریک تھے، یہ کوشش بھی مختلف وجوہ اور اسباب کی بناء پر جس کی تفصیل موجب طوالت ہے. ناکام رہی اور اس کے قائدین بالخصوص مسلمان سخت مصائب کا شکار ہوئے۔ انگریزوں نے ان کے لئے ہر قسم کی درندگی اور بربریت روا رکھی۔ بالآخر انگریزوں کا اقتدار ملک پر پوری طرح قائم اور مستحکم ہو گیا۔(۱۲)

برطانوی حکومت کی انتقامی کاروائی اور جماعت کی بے نظیر استقامت

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بھی مجاہدین نے حکومت برطانیہ کے خلاف اپنی جدوجہد نہ صرف جاری رکھی بلکہ تیز کردی، اس کا اندازہ سر ولیم ہنٹر کے ان بیانات سے ہو سکتا ہے کہ "ان مجاہدین کے خلاف حکومتِ برطانیہ کو بعض اوقات اپنی پوی فوجی طاقت سے کام لینا پڑا۔ بعض جنگی کارروائیوں میں بے قاعدہ مددگاروں اور پولیس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ بعض دنوں میں پنجاب کی چھاؤنیاں اس طرح فوجوں سے خالی ہو گئیں کہ حکومت پنجاب کو ہراول کا ایک دستہ وائسرائے کے کیمپ سے مستعار لینا پڑا۔ بعض مرتبہ انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا اور حکومتِ پنجاب اس کو واپس بلا لینے پر راضی ہو گئی، پنجاب کی حکومت کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہو گئی اور ہندوستان کے مذہبی مجنوں نہ تو نکالے جا سکے اور نہ ہم انہیں مطیع کر کے انہیں اپنے گھروں کو واپس کر سکے"۔(۱۳)

حکومت کو اپنی متعدد شکستوں، ہندوستان میں زیرباری اور انگلستان میں بدنامی سے سخت جھنجھلاہٹ تھی۔ اس نے اپنا یہ غصہ ہندوستان کے ان رؤساء شرفاء وعلماء وصُلحاء پر اُتارا جن کا کچھ بھی تعلق سرحد کے مرکز ستھانہ یا اس تحریک سے ثابت ہوا، اور ان سے انتقام لینے کے جوش میں اس نے قانون کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے مولانا یحیٰ علی صاحب عظیم آبادی، ان کے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب، رئیس پٹنہ عظیم آباد، ان کے ایک عزیز مولانا عبد الرحیم صاحب صادق پوری، مولوی محمد جعفر تھانیسری، رئیس تھانیسری، محمد شفیع (۱۴) سوداگر و رئیس لاہور اور ان کے بعض کارندوں پر سازش کا مقدمہ چلایا۔

ان میں سے مولانا یحیٰ علی صاحب عظیم آبادی، مولوی عبد الرحیم صاحب صادق پوری اور مولوی محمد جعفر تھانیسری اور ان کے بعض رفیقوں کو انبالہ جیل میں رکھا۔ یہ قیدی سرور و مستی کی ایسی حالت میں تھے کہ انگریز تماشائی اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ خاص طور پر مولانا یحیٰ علی صاحب سراپا جذب و شوق نظر آتے تھے، وہ مشہور صحابی حضرت خبیبؓ کی رباعی لطف لے لے کر پڑھتے جس میں انہوں نے پھانسی کے تختہ پر چڑھتے وقت کہا تھا، کہ "جب میں اسلام کی حالت میں مارا جاؤں تو مجھے اس کی ذرا پروا نہیں کہ میری موت کس کروٹ پر ہو"۔ ۲ر مئی ۱۸۶۴ء کو انگریز سیشن جج نے ایک مجمع عظیم کے سامنے سزائے موت کا حکم سنایا اور فرطِ غضب میں آخر میں یہ الفاظ کہے کہ "میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا"۔ مولانا یحیٰ علی صاحب اس فیصلہ کو سن کر ایسے خوش ہوئے گویا انکو دلی مراد مل گئی۔ مولوی محمد جعفر صاحب اپنی کتاب "**کالا پانی**" میں لکھتے ہیں کہ "مجھ کو اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سن کر ایسا

خوش ہوا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا"۔ یہ بات ان لوگوں کے لئے جو ایمان کی قوت اور شہادت کی فضیلت کے علم سے بے بہرہ تھے۔ ایسی ناقابلِ فہم تھی کہ انگریز کپتان پولیس پارسن سے (جس نے ان مظلوموں پر خاص طور پر ظلم ڈھائے تھے) نہ رہا گیا اور اس نے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری سے پوچھا کہ "تم کو پھانسی کا حکم ملا ہے تم کو رونا چاہئے تم کس واسطے اتنا بشاش ہے"؟ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے جواب دیا کہ "شہادت کی اُمید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے اور تم اس سے ناآشنا ہو"۔

یہ حضرات انبالہ جیل کے پھانسی گھر میں رکھ دیئے گئے یہاں بکثرت انگریز مرد و عورت تماشہ دیکھنے اور ان کی ذلت و مصیبت سے اپنا دل خوش کرنے آتے ایک جمگھٹا لگا رہتا، لیکن دوسرے عام پھانسی پانے والوں کے برخلاف ان کو شاداں و فرحاں پاکر یہ یورپین زائرین تصویرِ حیرت بن جاتے۔ سبب دریافت کرنے پر ان کو بھی وہی جواب ملتا جو ان کے ہم قوم پارسن کو دیا گیا تھا۔ جب یہ چرچا انگریزوں میں پھیلا اور ان کو معلوم ہوا کہ یہ دیوانے پھانسی پانے کو اللہ کی نعمت سمجھ رہے ہیں اور بقول اقبال ؂

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
شہادت نہیں موت ان کی نظر میں

تو جرم و سزا کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ اس سزا کو اس لئے منسوخ کیا گیا کہ اس سزایاب کو خوشی حاصل ہوگی اور اپنے آپ کو فائز المرام سمجھے گا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ڈپٹی کمشنر انبالہ پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ "تم لوگ پھانسی پانے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو، اس

واسطے سرکار تمھاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمھاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدلی گئی۔(۱۵)

۱۸۶۵ء میں یہ لوگ پورٹ بلیر انڈمان بھیجے گئے اور ان کے مکانات کھدوا کر پھکوا دیئے گئے۔ قبرستان میں ہل چلادیا گیا۔ جائدادیں ضبط کی گئی۔ مولانا یحیٰ علی صاحب اور مولانا احمد اللہ صاحب وہیں بحالت جلا وطنی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری اور مولانا عبدالرحیم صاحب صادقپوری ۱۸ اربرس اس کالے پانی میں جلا وطن رہ کر رہا ہوئے اور ہندوستان واپس ہوئے۔(۱۶)

۱۹۴۷ء تک یہی صورتحال قائم رہی۔ اس کے بعد آزادی کا دور آیا اور یہ تحتی براعظم دو حصوں پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم ہو گیا۔ پاکستان کے حصے میں جو ملک آیا اسمیں وہ سب علاقے تھے جن کو اس اصلاح وجہاد کی تحریک میں اولیت دی گئی تھی اور وہ شروع سے ان کے پیش نظر تھے۔ اگرچہ آج اس اوّلین خاکہ اور اس موجودہ تصویر میں بڑا فرق ہے۔ سیّد صاحب کے پیش نظر جو عظیم اور اعلیٰ مقاصد تھے اور جس کے لئے انھوں نے زندگی بھر دعوت دی اور بالآخر اس پر اپنی جان قربان کر دی، وہ اس کردار سے بہت مختلف ہے، جس کا نظارہ اس ملک کے سیاسی، انتظامی اور اخلاقی اسٹیج پر دنیا نے دیکھا ہے۔

امکانی تدبیر اور مناسب حکمت

سیّد صاحب نے اس وقت جو سیاسی اور جنگی منصوبہ بندی کی، اس سے زیادہ بہتر منصوبہ بندی کا کم از کم اس دور میں اس پیچیدہ اور نازک صورت حال میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس منصوبہ سازی میں ان کی سلامت طبع، دور اندیشی اور

بصیرت کا اندازہ صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو اس کے تاریخی پس منظر اور ان تجربات سے آگاہ ہو جن کی وجہ سے ان اقدامات پر وہ مجبور ہوئے نیز اس نے سیاسی، سماجی، عسکری صورت حال کا پوری گہرائی اور تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہو جو انیسویں صدی کے اوائل میں ہمیں ہندوستان میں نظر آتی ہے۔اس سے پہلے انگریزی اقتدار سے نجات اور ایک مستحکم مرکز اور اقتدار کے قیام کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو مختلف قائدین اور والیان ریاست نے کی تھیں، حالانکہ اس فہرست میں سلطان ٹیپو شہید (۱۲۱۴ھ۔۱۷۹۹ء) جیسا عالی حوصلہ، غیور اور جانباز قائد، امیر خاں (۱۲۵۰ھ) جیسا شہسوار اور شجاع جرنل بھی شامل ہے۔ان دونوں سے قبل نواب سراج الدولہ والیِ مرشد آباد (م ۱۱۷۰ھ) اور نواب شجاع الدولہ حاکم اودھ (۱۱۸۸ھ) اپنے عظیم وسائل اور منظم افواج کے باوجود اس کوشش میں ناکام رہے تھے۔اس کا پہلا سبب انگریزوں کی ''لڑائی اور حکومت کرو'' کی کامیاب پالیسی تھی۔دوسرے یہ کی ہندوستان میں کوئی ایسا آزاد علاقہ نہ تھا جہاں انگریزوں کی دسترس سے محفوظ ہو کر جہاد کی عملی سرگرمیاں اور تیاریاں پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ جاری رکھی جاسکتیں۔

اس قسم کے سیاسی اور فوجی منصوبے اور نقشے ہمیشہ بہتر اور ترجیحی صورت، مخلصانہ غور وفکر اور خیر خواہ اور مخلص اہل الرائے سے تبادلہ خیال واتفاق آراء کے بعد تیار کئے جاتے ہیں۔اس کے ساتھ (اگر یہ قائد ور ہنماء رضائے الٰہی کے لئے اور خدا کا نام بلند رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہو) تو دعا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز و درماندگی اور فقر و بے چارگی کا کامل اظہار، استخارہ اور اعتماد علی اللہ کا عنصر بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ہم جب سیّد صاحب کی مساعی وجدّ جہد کا تاریخی

جائزہ لیتے ہیں تو اس میں کوئی شبہ نظر نہیں آتا کہ انھوں نے یہ تمام شرائط پورے کیے تھے اور اس میں کسی کوتاہی اور غفلت سے کام نہیں لیا تھا۔

اپنے عصری مقامی پیمانوں سے کسی ایسی شخصیت یا تحریک کو ناپنے کی کوشش جس پر طویل عرصہ گزر چکا ہو اور جس کا اصل مرکز اور میدان بھی دور اور مختلف ہو اور کسی ایسی مخلصانہ اور سنجیدہ کوشش پر (محض ان نتائج کی بنیاد پر جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت سے ہے) کوئی فیصلہ صادر کرنا ایک غیر منصفانہ اور غیر حقیقت پسندانہ کوشش ہے۔ اگر کامیابی و ناکامی کا یہی پیمانہ یا "بیرومیٹر"، ہم اپنے سامنے رکھیں گے تو ہمیں اسلامی تاریخ میں سعی پیہم دعوت و عزیمت اور جہاد و قربانی کے بہت سے حسین اور روشن ابواب سے محروم ہونا پڑے گا اس لئے کہ اسلام میں معاملہ کا سارا انحصار حسن نیت، انتہائی انسانی کوشش، صدق و اخلاص اور اپنی امکانی حد تک مفید اور کامیاب طریقۂ کار کے انتخاب پر ہے نہ کہ محض نتائج ظاہری کامیابیوں اور مادی فوائد پر۔

من المئو منین رجال صدقوا ما عا هدوا الله علیه فمنهم من قضی نحبه ومن هم من ینتظر وما بد لوا تبدیلا (الاحزاب) مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نظر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں اور انھوں نے اپنے قول کو ذرا بھی نہیں بدلا۔

مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے اس تحریک اور جدّو جہد پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب سیّد احمد شہید میں کتنا صحیح لکھا ہے :

"تاریخ ہند و پاک میں جس عہد کو مسلمانوں کا دور

زوال کہا جاتا ہے یہ اسی کا ایک باب ہے، لیکن کیا کوئی حق پسند اور حق شناس انسان اس اعتراف میں تأمل کرے گا کہ مسلمانوں کے عہد عروج واقبال کا بھی کوئی حصہ اصولاً اس سے زیادہ شاندار یا زیادہ قابل فخر نہیں ہو سکتا، حکم وفیصلہ کا انحصار نتائج پر نہیں بلکہ عزم جہاد، ہمّتِ عمل اور راہِ حق میں کمال استقامت پر ہوتا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کمالِ عزیمت اور کمالِ ہمّت واستقامت کی ایسی مثالیں ہمارے عہدِ عروج کی داستانوں میں مل سکتی ہیں، جن میں مقصود نصب العین، دین اور صرف دین رہا ہو"؟(۱۷)

تجدید واحیاء کے چند عظیم کارنامے اور انقلابی اصلاحات

سیّد صاحبؒ کے عظیم کارناموں میں سے ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے اہم رکن کو انھوں نے زندہ کیا جو ایک طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے متروک اور نا قابل عمل سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے نقوش وآثار صرف قرآن وحدیث، سیرت اور ان مجاہدین اوّلین کی تاریخ میں باقی رہ گئے جو صرف اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے اور دین حق کو غالب کرنے کے لئے جہاد کرتے تھے، کوئی دنیاوی غرض، ملک و مال، حکومت وسلطنت یا خاندان اولاد کے لیے کوئی انتظام اور بندوبست ان کے پیش نظر ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ سلاطین اسلام نے یا اس فریضہ کو اپنے ذاتی اغراض اور حوس ملک گیری کے لیے غلط طور پر استعمال کیا تھا یا سرے سے اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اصحاب دعوت واصلاح بھی اپنی مشغولیت یا اس پر قدرت رکھنے کی وجہ سے اس سے قاصر رہے، دوسری طرف مسلمان جہاد کی اہمیت

وفضیلت کو تقریباً فراموش کر چکے تھے اور فقہ کے بعض مسئلوں (۱۸) سے بھی کم ان کی اہمیت رہ گئی تھی اور اس کا شمار ''**مستحبات**'' میں کیا جانے لگا تھا۔

اسلام کے اس رکن عظیم کے ساتھ اس بے اعتنائی نے عالم اسلام کو بہت شدید نقصان پہنچایا، ناخداترس وبے ضمیر اور کمتر درجہ کے لوگ قدر تاجری وبے باک ہوگئے، اسلام اور مسلمانوں کی شوکت مجروح ہوئی اور وہ مسلمان جنہوں نے طویل صدیوں تک اس ملک پر حکمرانی کی اور اس کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیا، اپنے ہی ملک میں غریب الدیار اور تذلیل واہانت کا شکار ہوگئے۔ ان کی مسجدیں بے تکلف گرائی جاتیں، ان کی حرمت وناموس سے کھیلا جاتا اور ان کی عزت خاک میں ملائی جاتی۔ آنحضرت ﷺ کی یہ پیشگوئی ان کے بالکل حسب حال تھی۔

اذا ترکتم الجھاد سلّط اللہ علیکم ذلاً، لاینزعہ حتی ترجعوا الی دینکم۔ (ابو داؤد بروایت ابنِ عمرؓ) اگر تم جہاد کرنا ترک کردو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کردیگا اور اسکو اس وقت تک دور نہ کریگا جب تک اپنے دین پر واپس نہ آجاؤ گے۔

پورا عالم اسلام بالخصوص اسکے وہ حصے جو خلافت عثمانیہ کے مرکز سے زیادہ دور رہے، اس ذلت آمیز اور شرمناک صورت حال سے دوچار تھے۔

جہاد کی ضرورت واہمیت پر خود سیدؒ صاحبؒ نے جو ارشادات ''**صراطِ مستقیم**'' میں فرمائے ہیں ان کا مطالعہ اس سلسلہ میں کافی ہوگا۔ اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''آسمانی برکتوں کے نزول کے سلسلے میں (جو فریضہ جہاد کے قیام سے وابستہ ہیں) روم وترکی سے ہندوستان کا مقابلہ

کر کے دیکھ لو، سال رواں ۱۳۴۲ھ میں ہندوستان جس کا بڑا
حصہ (انگریزی اقتدار میں) دارالحرب بن چکا ہے اس کا مقابلہ
دو سو تین سو برس پہلے کے ہندستان سے کرو۔ آسمانی برکتوں کا
کیا حال تھا اور اولیاء عظام اور علمائے کرام کی کتنی بڑی تعداد پائی
جاتی تھی"۔(۲۰)

لیکن اسلام کے اس رکن عظیم کو زندہ کرنے کے لئے سید صاحبؒ کے اس "**جہاد**" نے جہاد کو زندہ اور اپنی اصل حقیقت وصورت کے ساتھ باقی رکھا اور مسلم معاشرہ نیز مسلمانوں کے افکار وخیالات احساسات وجذبات، اسلامی ادب اور اردو شاعری (۲۱) پر اس کے ناقابل انکار اثرات مرتب ہوئے، موت کا ڈر دلوں سے نکل گیا، راہ خدا میں تکلیفیں برداشت کرنا بلکہ جان قربان کرنا آسان معلوم ہونے لگا، شہادت کا ایسا شوق دامن گیر ہوا جیسے کوئی پرندہ سر شام اپنے نشیمن میں پہنچنے کے لیے بے چین وبیقرار ہوتا ہے۔۔۔ ناز پروردہ نوجوان اور امراء و اغنیاء ہجرت وجہاد کی سختیاں جھیلنے اور بے آرامی، زہد وقناعت اور ایثار و قربانی کی زندگی گزارنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ جذبہ اتنا عام ہوا کہ بیبیاں اپنے بچوں کو لوری دیتیں تو ایسے اشعار پڑھتیں:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب ☆ یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

جہاد وشہادت کا یہ نشہ لوگوں پر ایسا طاری ہوا کہ بعض اوقات چاہنے والا باپ اپنے جوان بیٹے کو معرکۂ کارزار میں شہید ہونے کے لئے پیش کرتا جیسا کہ نواب فرزند علی رئیس غازیپور نے اپنے بیٹے امجد کو یہ کہہ کر پیش کیا "میں چاہتا ہوں کہ ذبیح اللہ اسمٰعیلؑ کی طرح اس کے بھی گلے پر اللہ کی راہ میں چھری چلے۔" نوجوا

نوں میں قرعہ اندازی ہوتی اور والدین اپنے اس لڑکے کو ملامت کرتے جو پیچھے رہ جاتا۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے کہ :

"کوئی وہابی (۲۲) باپ اپنے کسی غیر معمولی دیندار بیٹے کے متعلق نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ (جہاد کے لئے) اس کے گھر سے غائب ہو جائے گا۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ اسلام کے نظام امارت اور منصب امامت کا احیاء ہے یہ بھی اسلام کا وہ رکن ہے جس کو مسلمان طویل عرصہ سے چھوڑ بیٹھے تھے اور اس کی وجہ سے ان کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا اور ان کی حیثیت بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرح ہو گئی تھی، جسکا کوئی گلہ بان اور محافظ و پاسبان نہ ہو، حالانکہ اسلام نے اس نوع کی زندگی کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اور اس حال پر زندہ رہنے اور مرنے سے خبردار کیا ہے اور اس کو سخت ناپسندیدہ بات قرار دیا ہے کہ مسلمان پر ایک گھڑی بھی اس حال میں گزرے کہ ان کا کوئی امیر یا امام نہ ہو، اس عظیم سنّت اور رکن اسلام کے احیاء کا شرف بھی اس جماعت کے حصہّ میں آیا اور سب سے پہلے اسی نے اس متروک سنّت کو اس وقت از سر نو زندہ کیا جب عالم اسلام کے اکثر حصوں میں تاریخ کے ایک طویل دور تک اس پر کوئی عمل پیرا نظر نہ آرہا تھا۔

اگر اسلام کے ان دو عظیم الشان ارکان کے زندہ و تابندہ کرنے کے علاوہ سیدّ صاحبؒ کا اور کوئی کارنامہ نہ ہوتا اور انھوں نے مسلمانوں کی نگاہ میں ان کا اعتبار ووقار بحال کرنے اور ان کو محبوب و مرغوب بنادینے کے سوا اور کوئی خدمت انجام نہ دی ہوتی تو یہ ان کے فخر و عظمت کے لئے کافی تھا، لیکن اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی ناقابل فراموش اور گراں قدر خدمات انجام دی

ہیں۔مثلاً ہندوستان میں فریضۂ حج کا احیاء جو متروک ہوتا جارہا تھا اور بحری سفر کے خطرات اور راہ کی بدامنی کو بنیاد بنا کر علمی و فقہی طور پر اس کو ساقط کرنے کی کوشش جاری (۲۳) تھی۔اس موقع پر سیدؒ صاحبؒ کی وہ تقریر پڑھنی کافی ہے جو انھوں نے شوال ۱۲۳۶ھ میں سفر حج شروع کرتے وقت ضلع رائے بریلی دلمئو میں فرمائی تھی :

"جناب الٰہی میں نے اہل ہند کے لئے بہت دعاء کی کہ الٰہی ہندوستان سے تیرے کعبہ کی راہ مسدود ہے۔ہزاروں مالدار صاحب زکوٰۃ مر گئے، نفس وشیطان کے بہکانے سے کہ راستہ میں امن نہیں ہے حج سے محروم رہے،اور ہزاروں صاحبِ ثروت اب جیتے ہیں اور اسی وسوسہ سے نہیں جاتے ہیں۔سو اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے بے دغدغہ چلا جائے اور اس نعمت عظمٰی سے محروم نہ رہے۔ میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب کی اور ارشاد ہوا کہ حج سے آنے کے بعد یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے سو انشااللہ جو مسلمان بھائی زندہ رہیں گے وہ یہ حال بچشم خود دیکھیں گے"۔(۲۴)

اسی طرح نکاح بیوگاں جو اس زمانے میں سخت معیوب سمجھا جاتا تھا، اور اگر کوئی اسکی جرأت کرتا تھا تو اس کا مقاطعہ کیا جاتا یا اس کو خاندان سے الگ کردیا جاتا تھا۔شرفاء اور عالی نسب خاندانوں سے اسکا رواج جاتا رہا تھا یہ بات دراصل حکومت مغلیہ کے زوال کے زمانے میں ہندوؤں کے اثر سے جن کے یہاں بیوہ کا

نکاح قطعی طور پر ممنوع تھا پیدا ہو گئی تھی، یہاں تک کہ بعض علماء نے اس جاہلی فعل کی حمایت میں رسائل تک لکھے (۲۵) سیدؒ صاحب کی کوشش سے یہ بات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور نکاح بیوگان کا رواج پڑ گیا اور اس مظلوم طبقہ نے جو مسلمانوں کے ہزاروں گھروں میں زندہ درگور ہو رہا تھا، شریعت وسنّت کے سایہ میں نئی زندگی پائی۔ اسوقت ایک عالم شاعر حسن نے اپنے قصیدہ میں جو بطور تہنیت سیدؒ صاحب کے سفر حج سے واپسی پر کہا تھا اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں اس انقلاب حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

زنِ بیوا کے تو حق میں ہے سحاب ممطر — ذات سے تیری یتیموں کو بہت تقویت
کھوئی یہ رسم زبوں رحمت حق ہو تجھ پر — تھا غضب ظلم کہ بیوہ نہ کرے عقدِ نکاح
آبرو کا نہ انہیں خوف نہ کچھ جی کا ڈر — جس میں راضی ہو خدا ہے وہی ان کو منظور

اس طرح ان لڑکیوں کی شادی کا بھی آپ کی کوشش سے آغاز ہوا، جو افغانی قبائل میں مختلف رسوم وقیود کے نتیجہ میں عرصہ تک بیٹھی رہتی تھی اور شادی کی نوبت نہ آتی تھی اور اسکے نتیجہ میں ان کے اندر مختلف اخلاقی وطبّی امراض اور شرعی منکرات راہ پاتے تھے، اور سخت غیر فطری زندگی گزارنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جاہلیت کے اثرات ونشانات، رفض، ہندوانہ تہذیب اور رسم ورواج اور بدعت کی مختلف شکلوں کی (جو غیر اسلامی عناصر سے اختلاط اور کتاب وسنت سے بُعد کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ میں اندر تک سرایت کر چکی تھی) بیخ کنی کی۔۔۔ مزید برآں اسلام کا نظام مالیات، نظامِ دیوانی وفوجداری اور شعبۂ احتساب (۲۶) وقضا قائم ہوا، حدود شرعیہ نافذ کی گئیں، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دعوت الی اللہ کا اجرا عمل میں آیا اور خلافت اسلامیہ کے دوسرے مہمات اور مثالی

اسلامی معاشرہ کے اصل نقوش و خصوصیات دنیا کے سامنے آئے۔

ایک بڑا انقلاب وہ عمومی دینی فضا تھی جو اس دعوت و تحریک کے اثر، امام جماعت اور اسکے باخدا و صاحب علم و تاثیر رفقاء کے دوروں اور وعظ و ارشاد سے سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی اور زندگیوں کا رخ غفلت و بے دینی سے دینداری اور خدا پرستی کی طرف پھر گیا تھا اور ایک نئی دینی اصلاحی و تعلیمی تحریک پورے ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔ مذکور الصدر شاعر حسن اس انقلابِ حال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جس طرف دیکھئے تعمیر مساجد ہے گی — ہے ہر اک شخص کی تحقیق مسائل پہ نظر
آتی ہر سمت سے ہے بانگ موذن کی صدا — جسکو سنیے یہی کہتا ہے کہ اللہ اکبر
اس قدر عصر میں تیرے ہوئی افراط نماز — لاکھوں تیار ہوئے ملک میں چھوٹے منبر
قطع بدعات ہوئی فیض سے تیرے ایسی — ہند سے رسم بُری اٹھ گئی صدہا یکسر
دیکھے جس کو سو کرتا ہے کلام اللہ یاد — باندھی ہر شخص نے تہذیب و ہدایت پہ کمر
تیری تائید سے اک خلق ہوئی ہے تائب — تیری تنبیہ سے لاکھوں ہوئے فاسق اطہر
اک قدم دھرنے کی جگہ بھی نہیں واں ملتی — جو کہ چھوٹی ڈھی مسجد تھی پڑی صاف کھنڈر (۲۷)

سفر حج کو جاتے ہوئے کلکتہ کے زمانہ قیام میں۔۔۔۔ دینداری کی ایک ہوا سی چل گئی، ایک لخت شراب بکنی موقوف ہو گئی، یہاں تک کہ دوکانداروں نے سرکار انگریزی میں عذر خواہی کی کہ سرکاری محصول معاف کیا جائے، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں، انھوں نے تمام نشہ آور چیزوں سے توبہ کرلی ہے اب کوئی ہماری دکانوں کو ہو کر نہیں نکلتا، نکاح شرعی کی

مکتبۃ العلامۃ عبد الحی الحسنی

ترویج ہوئی، بے پردگی کا انسداد ہوا، شرک وبدعت کے نشانات مٹنے لگے اور ان کی جگہ سنت وشریعت کے نشانات نے لی، بنگال وآسام میں تبلیغ اسلام واصلاح کی ایک رو چلی اور بکثرت لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ اس موقع پر صاحب مخزن کا یہ شعر بالکل حسب حال تھا ؎

زدیں خلق وعالم پر آوازہ گشت تو گفتی کہ عہد نبی تازہ گشت

واقعہ یہ ہے کہ یہ شعر صرف کلکتہ ہی پر صادق نہیں آتا، اس عہد کے پورے ہندوستان پر صادق آتا ہے۔

۱۶۱۶ / ۱۵۰۵۲ گوشہ [illegible] اسلام

ہمہ گیر اور دور رس اثرات

اس تحریک ودعوت کے اثرات بڑے ہمہ گیر اور دور رس تھے، اس نے اصلاح حال، کتاب وسنت کی طرف رجوع، اتباع شریعت واعلائے کلمۃ اللہ کا جو صور پھونکا تھا، اس کے اثر سے ملک کے مختلف گوشوں میں نئی نئی اصلاحی تحریکیں اور دینی کوششیں شروع ہوئیں جنہوں نے اپنی اپنی جگہ مفید کام انجام دیا اور مسلمانوں میں نئی نئی بیداری پیدا ہوئی، مشرقی بنگال میں نثار علی (عرف ٹیٹو میاں) کی اصلاحی تحریک بر صغیر کی جماعت اہل حدیث، صادق پور پٹنہ کا مرکزِ جہاد وتربیت، امرتسر کا غزنوی خاندان اور اسکی تعلیمی تبلیغی کوششیں، دار العلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور اور انکے طرز کے صدہا عربی مدارس جو اس بر صغیر ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں، سلفی المسلک مدارس وجامعات اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کا علمی ودینی مرکز سب نے کم وبیش کسی ایک چراغ سے روشنی حاصل کی جو تیل بتی کے بجائے خون جگر اور اشک سحر گاہی سے جلایا گیا تھا اور جس کو ایک **"مرد درویش"** نے جس کو خدا نے **"انداز خسروانہ"** بخشے تھے،

تیز آندھی میں بھی فروزاں رکھا تھا۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ ازپر تو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

مغربی مصنفین کا معاندانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویہ

اس عظمت وشہرت کے باوجود جو سید صاحبؒ کو اپنے زمانہ میں اور اس کے بعد حاصل ہوئی اور ان کے ان اصلاحی وانقلابی کارناموں کی موجودگی میں جو پچھلی صدیوں سے کم کسی مصلح اور داعی کی تاریخ میں ملتے ہیں، جزم ووثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ میں (پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مستثنیٰ کر کے) کسی شخصیت اور دعوت پر لکھنے میں اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا گیا جتنا سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے بارے میں دیا گیا ہے۔ (۲۸)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے اس سلسلہ میں پڑھنے اور محنت کرنیکی بالکل ضرورت نہیں سمجھی یا انہوں نے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کیا، یا تاریخ نویسی سے زیادہ تاریخ سازی سے کام لیا۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد حریت فکر، حقیقت وصداقت کی تلاش اور علم وتحقیق کا جو دور شروع ہوا تھا اور مذہبی تعصبات، اوہام پرستی اور بلا تحقیق کسی بات کو مان لینے اور اس کو رٹتے رہنے کے خلاف جو خونریز جنگ لڑی گئی تھی اور جس نے نہ صرف یورپ کو بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچایا۔ اس سے توقع تھی کہ کسی علمی وتاریخی موضوع پر قلم اٹھانے اور تحقیق کرنے میں اصل محرک مذہبی عناد یا سیاسی اغراض نہیں ہوں گی بلکہ حقیقت کی مخلصانہ تلاش اور طالب علمانہ جستجو ہوگی اور کم سے کم انیسویں صدی کے نصف اول کے اہل قلم اور مصنفین اس سے زیادہ وسیع

النظری، وسیع القلبی اور بے لاگ تحقیق کا ثبوت دیں گے جتنا قرون وسطیٰ کے ان مصنفین اور فضلا نے دیا، جنھوں نے جنگ صلیبی کے سایہ میں پرورش پائی تھی اور جو حقائق سے زیادہ جذبات سے مغلوب تھے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ انسانی زندگی تضاد کا ایک عجیب وغریب مرقع ہے اور دنیا میں بہت کچھ دیکھنا اور ماننا پڑتا ہے جس کے پیش آنے کی کوئی توقع اور جواز نہیں ہوتا۔

معروف زندگی، محفوظ تاریخ

سید احمد شہیدؒ الف لیلہ کی کوئی افسانوی شخصیت یا ما قبل تاریخ کا کوئی انسانی کردار نہ تھے، انہوں نے تیرھویں صدی کے اوائل اور اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں نشوونما پائی۔ انکی تعلیم وتربیت اور ابتدائی سرگرمیوں کا مرکز شمالی ہند کا وہ آباد اور مرکزی خطہ تھا جو علم وادب، تہذیب وتمدن اور سیاسی اہمیت کے اعتبار سے ہندوستان کا درجۂ اول کا علاقہ تھا، اور جس کو قدیم انگریزی اصطلاح میں صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ کہتے تھے، پھر ان کا رابطہ دہلی اور دہلی کے شہرۂ آفاق خاندان ولی اللہی سے قائم ہوا جس کے علم ودرس کا سکہ سارے ہندوستان میں چل رہا تھا، خود ان کا خاندان اودھ کا مشہور ومعروف سادات کا خاندان تھا جو کم سے کم پانچسو برس سے نامور علماء ومشائخ کی بدولت جو اس خاندان میں پیدا ہوتے رہے اور اپنی خاندانی روایات، زاہدانہ زندگی اور وقار وسنجیدگی کی وجہ سے قرب وجوار میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ہر دور میں دہلی کے مغل فرمانروا اس سے اپنی عقیدت کا اظہار اور اس کی عالی نسبی کا اعتراف کرتے رہے اور ان سب فارسی تذکروں میں جو مختلف عہدوں میں لکھے گئے اس خاندان کے ممتاز افراد کا ذکر ملتا ہے، پھر وہ جنگی تربیت ومہارت حاصل کرنے کے لئے وقتی طور پر سنبھل

(یوپی) کے ایک بلند حوصلہ افغانی سردار نواب امیر خاں کی فوج میں رضاکارانہ خدمات انجام دیتے رہے (جو بعد میں راجپوتانہ کی اسلامی ریاست ٹونک کے بانی ہوئے) نواب ممدوح ان کو بڑی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے۔ نواب امیر خاں کی زندگی اور حالات بھی تاریکی میں نہیں ہیں اور ان پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں ان کو پنڈاروں اور اٹھارویں صدی کے وسط کے ٹھگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا (جیسا کہ انگریز مؤرخین کو غلط فہمی ہوئی ہے یا انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے)۔

امیر خاں کے لشکر سے واپسی کے بعد ان کی طرف علماء ومشائخ، شرفاء وامراء کا ایسا رجوع ہوا اور انہوں نے پروانوں کی طرح ان سے بیعت ہونے اور ان سے روحانی فائدہ اٹھانے کے لئے ایسا ہجوم کیا جس کی مثال ہندوستان میں بہت دور تک نہیں ملتی، پھر انہوں صوبجاتِ متحدہ کے کئی دعوتی وتبلیغی دورے کئے جس میں یہ پورا علاقہ ان پر امنڈ آیا اور توبہ واصلاح اور رد شرک وبدعت کی ایسی تیز رو چلی جس کی مثال عرصہ دراز سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پھر انہوں نے ساڑھے سات سو آدمیوں کے ساتھ (جو اس زمانہ کے وسائل کے لحاظ سے بہت بڑی تعداد تھی) اس شان وشوکت سے حج کیا۔ جس کی کوئی نظیر نہ ہندوستان کے بادشاہوں کی تاریخ میں ملتی ہے نہ علماء ومشائخ کے سوانح وتذکروں میں۔ اپنے وطن رائے بریلی سے لیکر جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا، کلکتہ تک جو انکے خشکی کے سفر کا منتہی تھا، گنگا کے کنارے کا یہ پورا علاقہ ایک نئی زندگی سے آشنا اور ایک نئے جوش سے مخمور ہو گیا، اور پورے کے پورے شہر ان کے حلقۂ ارادت اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ (۲۹)

پھر وہ مکہ مدینہ گئے، جہاں انکا ایسا استقبال ہوا جو عرصہ سے کسی غریب عربِ دینی شخصیت کا نہیں ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حجاز میں وہابیت یا وہابیوں کا نام لینا بھی خطرے کو دعوت دینے اور اپنے کو مشکوک بنانے کے مرادف تھا، وہاں ان کے کسی وہابی مبلغ سے ملنے کی کوئی ادنیٰ سی شہادت نہیں ملتی، ان کا دینی وذہنی ارتقاء اس سفر سے پہلے اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا اور انکی اصلاح عقیدہ اور اصلاح عمل کی دعوت جو قرآن وحدیث کے براہ راست مطالعہ پر مبنی تھی، ہندوستان ہی میں واضح اور معین ہو چکی تھی۔ (۳۰)

پھر انہوں نے جہاد اور خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لئے جس کے حدود ان کے وسیع منصوبے اور بلند تخیل میں ہندوستان سے لے کر ترکستان، بلکہ ترکی تک وسیع تھے، ایک زبردست تحریک شروع کی اور آزاد قبائل کے علاقہ کو اپنی اس دعوت وجدوجہد کا مرکز بنالیا، اپنے مستقر سے ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر پہونچنے کے لئے آپنے ایک عظیم قافلہ کے ساتھ ہندوستان، بلوچستان اور افغانستان کا جو طویل اور پر مشقت سفر کیا، اس کی روئداد اتنی منضبط، مفصل اور صحیح معلومات پر مشتمل ہے اور اس میں ایک ایک مقام اور ان کے فاصلہ، انکی جغرافیائی وتمدنی حالت کا اتنا مستند بیان موجود ہے جسکی کسی سرکاری دورہ کی روئداد یا روزنامچے سے توقع کی جاسکتی ہے۔ (۳۱) وہاں سے انہوں نے ہندوستان سے رابطہ قائم رکھا، وہ اپنے عزائم اور اقدامات کی اطلاع گشتی مراسلوں کے ذریعہ ہندوستان کے علماء اور بااثر لوگوں کو دیتے رہے ان دعوتی وسرکاری خطوط کے مجموعہ، ہندوستان کے مختلف خاندانوں اور کتب خانوں اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں۔ میدان جنگ میں بھی ان کے حالات اور جنگی کاروائیوں کی روائداد لکھی جاتی رہی۔

ان کی شہادت کے بعد جو ۲۴/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶/ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں پیش آئی۔ ان کے حالات انکی زندگی کے جزئیات لکھنے کا اتنا اہتمام کیا گیا جو شاید ہی کسی مصلح اور قائد کے بارے میں مختلف صدیوں میں کیا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں دو کوششوں کا ذکر کرنا نامناسب نہیں ہوگا۔

ایک وہ کوشش جو اجتماعی اور منظّم طریقہ پر والی ریاست ٹونک نواب وزیر الدولہ کے حکم و تعاون سے شہادت کے عین بعد ٹونک میں کی گئی جہاں ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھیں جو برسوں ان کے ساتھ رہے تھے، جنگی موقعوں پر شریک تھے اور ان کے شب و روز سے واقف تھے، انہوں نے اجتماعی طریقہ پر اپنے چشم دید واقعات اور ذاتی معلومات قلمبند کرائے، یہ گویا علمی انداز کا پہلا منظم (اکیڈمک) کام تھا جو انجام پایا، یہ قلمی دفتر چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ (۳۲) جس کا نام **"وقائع احمدی"** ہے۔

دوسرا مستند ترین ذخیرہ مولوی سید جعفر علی نقوی (م ۱۲۸۸ھ) کی فارسی تصنیف **"منظورۃ السعداء فی احوالِ الغزاۃ والشہداء"** ہے کتاب کے مصنف قدیم ضلع گورکھپور حال ضلع بستی کے ایک نامور سادات و علماء کے خاندان کے فرد اور جید عالم اور فارسی کے انشاپرداز تھے، وہ خود محاذ جنگ پر تھے اور لشکر کے میر منشی کی خدمت انکے سپرد تھی جو انکی گہری واقفیت اور مستند معلومات کی ضامن ہے۔

تیسری تاریخ دستاویز سید صاحب کے بڑے بھانجے مولوی محمد سید علی (م ۱۲۶۶ھ) کی فارسی زبان میں تصنیف **"مخزنِ احمدی"** ہے جو سید صاحب کی ولادت سے لیکر حج سے واپسی تک کے حالات میں سب سے بڑا قابلِ

اعتماد ماخذ ہے، اس لئے کہ وہ انکے عزیز قریب کے قلم سے ہے، مصنف اکثر واقعات کے چشم دید گواہ اور سفر و حضر کے رفیق تھے۔ نواب محمد علی خاں والی ٹونک کے عہد میں یہ کتاب لکھی گئی اور آگرہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔

چوتھا ماخذ مولوی محمد جعفر تھانیسری اسیر پورٹ بلیئر و متہم مقدمہ سازش ۱۸۶۴ء کی تصنیف **"سوانح احمدی"** ہے، جس نے سید صاحب کے حالات کی اشاعت کی بڑی خدمت انجام دی، یہ اردو میں پہلی کتاب تھی جو سید صاحب کے حالات میں چھپ کر ہندوستان میں عام ہوئی اور گھر گھر پہونچی۔ مصنف سید صاحب کے خلفاء سے بیعت اور سید صاحب کے سچے اور پر جوش معتقد تھے، وہ ۱۸ برس تک کالا پانی رہ کر وطن واپس ہوئے تھے، انگریز اس جماعت کی ہر چیز کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لئے یہ کتاب خاص احتیاط سے لکھی گئی اور اس میں ان حقیقتوں کا اظہار نہ کیا جاسکا، جس کا آزادی کے دور میں برملا اظہار کیا جاسکتا ہے۔

اس موضوع پر سب سے جامع اور مکمل تصنیف مولانا غلام رسول مہرؔ مرحوم کی **"سید احمد شہید"** ہے یہ چار ضخیم جلدوں میں ہیں، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ایک ہزار نو سو اکیس ہے۔ اس کو سید صاحب کی سیرت اور آپ کی تحریک جہاد و دعوت اور جماعت مجاہدین اور آپ کے ممتاز رفقائے کار کے حالات میں ایک انسائیکلو پیڈیا کہنا چاہئے، یہ کتاب لاہور سے طبع ہوئی ہے اور علمی و ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے راقم سطور نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب **"سیرت سید احمد شہید"** کے نام سے لکھی ہے ۱۹۳۹ء میں یہ کتاب ایک جلد میں چار سو باسٹھ صفحہ میں شائع ہوئی۔ اس پر مولانا سید سلیمان

ندویؒ کا ایک بلیغ اور دل آویز مقدمہ تھا، جس کا شمار سید صاحب کی بہترین شگفتہ ادبی تحریروں میں ہے۔ اس مقدمہ سے نوعمر مصنف کی جس کی عمر اس وقت ۲۴ر سال سے زیادہ نہ تھی بڑی ہمت افزائی ہوئی، یہ مصنف کی پہلی کوشش اور اس کے قلم کا پہلا ثمر تھا، کتاب کا ہندوستان میں علمی و دینی حلقوں میں جس طرح غیر معمولی طور پر استقبال ہوا اس سے اس پیاس کا اندازہ ہوتا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں میں موجود تھی، ہندوستان کے مخصوص سیاسی حالات اور اسلام کے اقتدار و غلبہ کے شوق و آرزو نے ان کے اندر ایسی چیزوں کی طلب پیدا کر دی جو ان کے اندر خود اعتمادی اور خود شناسی اور ایمان و یقین کے سوئے ہوئے جذبات بیدار کر سکیں، چنانچہ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا اور اس کے بعد کئی ایڈیشن شائع ہوئے، اسی دوران مصنف نے اس میں اضافہ اور تحسین و تنقیح کا کام جاری رکھا اور ان اضافات کی وجہ سے کتاب کا حجم پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا۔ کتاب کا پانچواں ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں پاکستان سے اور چھٹا ۱۹۷۸ء میں ہندوستان سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ایک ہزار ایک سو پینتالیس ہے، اور اس میں جابجا اہم تاریخی نقشے، تاریخی مقامات کی تصویریں، اہم دستاویزات شامل ہیں، آخر میں سید صاحب پر انگریزی میں ایک نئی کتاب (SAIY!D AHMAD SHAHID HIS LIFE AND MISSION) کے نام سے شائع ہوئی جو گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے اور جدید اسلوب میں لکھی گئی ہے اور بہت سی تاریخی دستاویزات سرکاری رپورٹوں اور غیر ملکی شہادتوں اور بیانات پر مشتمل ہے، اس کتاب کے مصنف محی الدین احمد نے یہ کتاب بڑے سائز کے اور باریک انگریزی حروف کے ۴۲۷ر صفحات میں آئی ہے، ان کتابوں کے علاوہ متعدد اور کتابیں رسائل اور مقالات

ہندوپاک نیز یورپ اور امریکہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

افسوس ہے کہ عربی زبان میں اس موضوع پر بہت کم چیزیں ملتی ہیں اور عالم عربی اس اہم شخصیت اور اسکے نامور افراد کے کارناموں سے بالعموم ناواقف ہے اور شاید اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش راقم سطور کا وہ رسالہ ہے جس کو علامہ سید رشید رضا مرحوم نے اپنے مشہور رسالہ "**المنار**" ۱۳۴۹ھ۔ ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۱ء میں شائع کیا اور پھر بعد میں اس کو ایک علحدہ اور مستقل رسالہ کی شکل میں چھپوایا اس رسالہ کا عنوان تھا "**السیّد الامام احمد بن عرفان الشہید، مجدد القرن الثالث عشر**" اس رسالہ کی تحریر کے وقت مصنف کی عمر ۱۷ سال کی عمر سے زیادہ نہ تھی، اس لئے اس میں ان کتابوں کا معیار نظر نہ آئے گا جو فکری پختگی، مکمل مطالعہ اور وسیع تجربے کے بعد لکھی جاتی ہے تاہم آگے چل کر مصنف کو عربی میں ایک نئی متوسط درجہ کی کتاب لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی، جس میں اس تحریک جہاد و قربانی کے ان مختلف اثر انگیز واقعات کو سلیس عربی زبان میں جمع کیا ہے جن سے سید صاحب کی نگاہ کی دوررسی ان کی صحبت کی کیمیا اثری اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کی اسلامی سیرت و کردار اور ان کے بلند اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے، اسی کے ساتھ دعوت و جہاد کی مختصر مرحلہ وار تاریخ بیان کی گئی ہے تاکہ اس کا پورا پس منظر سامنے آجائے۔ یہ کتاب "**اذاھبت ریح الایمان**" کے نام سے شائع ہوئی اور لکھنؤ و بیروت سے اس کے تین ایڈیشن نکلے۔(۳۴)

ایک ایسی معروف شخصیت جس کی پیدائش سے لے کر شہادت تک کے حالات اس قدر تیز روشنی میں ہوں کہ صرف وہی شخص ان سے ناواقف ہو سکتا

ہے جو اپنی آنکھیں پورے طور پر بند کر لے اور دیکھنے کا ارادہ ہی نہ کرے، اور ایک ایسی تحریک کے متعلق جس کی جزئیات اس تفصیل کے ساتھ قلمبند کی گئی ہو جو جدید عصری طریقوں سے کسی طرح کم نہ ہو۔ قیاس آرائیاں، قصے کہانیوں پر انحصار اور بے سند لکھی ہوئی یا کہی ہوئی باتوں کو دہراتے رہنا، عصری جدید کا ایک ایسا تضاد اور ایک علمی دنیا کی ایک ایسی بوالعجبی ہے، جس کی کوئی تاویل آسانی سے ممکن نہیں۔

عناد وتعصب کے چند نمونے

یہاں پر اس کی صرف چند مثالیں ہی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے اس غیر ذمہ دارانہ اور غیر علمی طرز عمل کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، جس کو ہمارے بہت سے مغربی مصنّفین نے (جو تاریخی موضوعات پر بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں) اپنے لئے روا رکھا ہے۔

ہیوگس (Hughes) ڈکشنری آف اسلام "**مقالہ وہابی**" میں لکھتا ہے :۔

> "اور پھر جب ایک بے چین طبیعت شخص ہندوستان سے اپنے پچھلے گناہوں کا کفارّ ادا کرنے کے لئے مکہ حج کرنے گیا تو وہاں وہ ان وہابی مبلغین کے زیر اثر آگیا جو حاجیوں میں خفیہ طور پر وہابیت کی اشاعت کر رہے تھے"
>
> رائے بریلی کا قزاق اور ڈاکو سیّد احمد مراسم حج ادا کرنے مکہ سے ۱۸۲۲ء میں اس عزم کے ساتھ واپس آیا کہ پورے شمالی ہندوستان کو پرچم اسلام کے زیر نگیں لے آئیگا"۔

اولف کیرو (Olaf Caroe) اپنی کتاب The pathan صفحہ ۳۰۱ میں لکھتا ہے :۔

"سیدّ احمد بریلوی بدنام زمانہ امیر خاں کا پیرو تھا۔ جس نے وسط ہند میں پنڈاروں کے خلاف انگریزوں کی مہم کے زمانے میں کرایہ کے سپاہیوں کا ایک جتھا جمع کر لیا تھا۔ امیر خاں کی فوج منتشر ہونے کے بعد سیدّ احمد کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا"

پی ہارڈی(P. Hardy)(The Muslim of birtish india)
صفحہ ۵۱ پر لکھتا ہے :۔

"سیدّ احمد ایک غیر معروف خاندان میں جو شاید معمولی درجہ کے ملا زمت پیشہ لوگ تھے۔۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۸ء تک وہ پنڈاری سردار امیر خاں کی فوج میں جو بعد میں ٹونک کے نواب ہوئے، ایک سپاہی رہے، اس عرصہ میں شاید کوئی ایسی بات نہیں تھی جو انھیں دوسرے پنڈاری قزاقوں سے ممتاز کرتی"

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر "ہندوستانی مسلمان" ۶۰۔۶۱ میں لکھتا ہے "وہابی ہونے کے الزام میں سیدّ احمد کو اعلانیہ ذلیل کر کے مکہ سے نکال دیا گیا"۔

صفحہ ۲۴ میں لکھتا ہے :۔

"اس طرح اپنی گزشتہ سوانح حیات کو جو حیثیت ایک قزاق کے گزری تھی، حاجی کے لباس میں چھپا کر اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمبئی میں وارد ہوئے"

یہ اس "**علمی تحقیق**" اور "**ترقی یافتہ**" تاریخ نویسی کے چند نمونے ہیں جو اس غیر ذمہ دارانہ طرز تحریر کو ظاہر کرتے ہیں جس کی بیسویں صدی کے ان یورپین مورخین سے بالکل توقع نہ تھی، جن کو سفر، مستند معلومات اور جرح وتعدیل کے مقررہ اصولوں سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقعہ حاصل تھا۔

مغربی مصنفین کے مشرقی خوشہ چیں

مشرق وسطی اور ایشیا کے بھی بیشتر فضلاء نے جن کو وہابیت، مہدویت اور ہندوستان کی تحریک جہاد پر قلم اٹھانے کی ضرورت پیش آئی، انھیں مصنفین پر آنکھ بند کرکے اعتماد کرنے اور مکھی پر مکھی مارنے سے زیادہ لیاقت کا ثبوت نہیں دی۔ سب سے زیادہ تعجب اور شکایت ان عرب فضلاء اور مصنفین سے ہے جو ہندوستان کے علمی وتاریخی ذخیرہ سے بلاواسطہ یابالواسطہ صحیح معلومات اخذ کرسکتے تھے جن کے ہندوستان کے صحیح الخیال علماء اور مرکزوں اور اداروں سے روابط تھے، جن کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ سیاسی وجماعتی اغراض کی بنا پر جزیرۃ العرب کے بارھویں صدی کے عظیم مصلح شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف الزامات وافتراآت کا کیسا جال بُنایا گیا ہے جس نے ان کی شخصیت اور کارناموں پر دبیز پردہ ڈال دیا اور جن کو اس صورتِ حال کے خلاف احتجاج اور شکایت کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے یہاں بطور نمونہ ایک ایسے عالم کی کتاب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کو عام اشاعت اور تقسیم کے لئے حکومتِ سعودیہ نے شائع کیا اس پر وہاں کے ایک جلیل القدر عالم کا مقدمہ بھی ہے۔ علامہ احمد بن حجر بن محمد (قاضی محکمۂ شرعیہ قطر) اپنی کتاب "**الشیخ محمد بن عبدالوہاب**" کے صفحہ ۷۸ پر لکھتے ہیں :۔

"اس طرح سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت

نے ہندوستان کے بعض علاقوں کو متاثر کیا۔ یہ کام ایک
ہندوستانی حاجی سید احمد کے ذریعہ عمل میں آیا۔ یہ شخص
ہندوستان کے والیانِ ریاست میں سے تھا جس نے ۱۸۱۶ء
میں اسلام قبول کرنے کے بعد (۳۴) فریضہ حج کی ادائیگی
کے لئے حجاز کا سفر کیا جب ان کی وہاں مکہ میں وہابیوں سے
ملاقات ہوئی تو وہ اس بات کے قائل ہوئے کہ ان کی
دعوت بہت صحیح اصولوں پر قائم ہے وہ ان کے مذہب کے
ایسے پُر جوش اور مخلص داعی بن گئے جن کے دل ودماغ
پر عقیدہ حاوی ہو جاتا ہے"۔(۳۵)

یہ درحقیقت مغربی مصنفین کی خوشہ چینی اور مکمل طریقہ پر انہیں کے بیانات پر اعتماد اور تحقیق حق کی براہ راست کوشش نہ کرنے کا افسوس ناک نتیجہ ہے جس کا شکار ڈاکٹر احمد امین (۳۶) جیسے فاضل مصنف (جن کے قلم سے فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام، ظہر الاسلام جیسا مشہور اور مقبول سلسلہ نکلا ہے) اور بعض دوسرے عرب مصنفین ہوئے۔ جنہوں نے تمام تر انگریزی فرانسیسی ماخوذ پر انحصار رکھا۔

مثال کے طور پر ہم ڈاکٹر احمد امین کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، وہ اپنی کتاب "**زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث**" میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

"ہندوستان میں ایک وہابی رہنماء اور قائد پیدا ہوا،
جسکا نام سید احمد تھا۔ اس نے ۱۸۲۲ء میں فریضہ حج ادا کیا وہاں

اس نے پنجاب میں اس دعوت کا علم بلند کیا اور تقریباً وہاں اقتدار قائم کرلیا۔ اس کی قوت وطاقت بڑھتی رہی یہاں تک کہ شمالی ہندوستان کو بھی اس سے خطرہ لاحق ہونے لگا۔ اس نے بدعات اور خرافات کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا اور اس علاقہ کے واعظین واہلِ دین سے جنگ کی اور وہ ہر اس شخص کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جو ان کے مذہب پر عمل پیرا اور ان کی دعوت کا حامل نہ ہو، اس نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ انگریزی حکومت کو اس کی اور اسکے پیروکاروں کی وجہ سے بڑی دشواریوں کا سامان کرنا پڑا۔ بالآخر انکے دبانے میں کامیاب ہوئی"۔ (۳۷)

شاید ان تاریخی غلطیوں (اگر ہم ان کو مغالطوں کا نام نہ دیں) کی تعداد اس مختصر اقتباس میں اسکی سطروں سے کم نہ ہوگی، اور یہ وہ باتیں ہیں جن میں کسی بحث اور تمحیص کا سوال نہیں، ہر وہ شخص جسکو سید صاحب کی سیرت ان کی تحریکِ جہاد ودعوت، نیز اس عہد کی عمومی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ بداہۃً ان کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ ان غلطیوں کی وجہ یہی تھی کہ یہ معلومات انگریزی ماخذ سے ماخوذ تھی جس میں کلی طور پر انہیں پر انحصار کیا گیا تھا اور اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ ان کی سیرت وکارناموں کا، اور تاریخ دعوت وجہاد کا اچھی طرح اور مکمل مطالعہ کیا جائے یا ان لوگوں سے یہ معلومات حاصل کی جائیں جو ہندوستان کی شخصیتوں سے واقف ہیں اور جن کا گاہ بگاہ مصر جانا ہوتا ہے اگر وہ ایسا کرتے تو ہندوستان کے مصلحین کی صفِ اول میں سر سید احمد خاں اور سید امیر علی کے بجائے وہ انکو جگہ

دیتے، میں نے ۱۹۵۱ء میں اپنے سفر مصر کے دوران ان کی توجہ ان غلطیوں کی طرف مبذول کرائی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کس مرتبہ کے لوگ تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے تذکرہ میں انہوں نے سید صاحبؒ کی کتنی غلط تصویر پیش کی ہے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ان دونوں کے بارے میں انکی معلومات ناکافی تھی اور انکو فکر اسلامی کی تاریخ میں ان کی اہمیت اور مسلم معاشرہ میں ان کے ہمہ گیر اثرات کا اس قدر اندازہ نہ تھا۔ (۳۸)

ہمارے عرب و مسلم مصنفین واہل قلم کی یہ وہ تحریریں ہیں جن کو پڑھ کر ایک عرب شاعر کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

وظلم ذوی القربیٰ أشد مضاضۃ

علی النفس من وقع الحسام المھند

بعض اکابر معاصرین کی شہادتیں

کسی شخص کی عظمت اور اصل حیثیت و مرتبہ کا اندازہ اس کا صاحبِ نظر معاصرین کی شہادتوں سے ہو سکتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم صرف دو تین اقتباسات پر اکتفا کریں گے۔

ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنف و مؤرخ سید صدیق حسن خاں (والی بھوپال) (م ۱۳۰۷ھ) جنہوں نے انکی تعلیم وتربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا، اور ان کے دیکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کو انہوں نے دیکھا تھا۔ "**تقصار جیود الأحرار**" میں لکھتے ہیں :۔

"خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھی، ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ

کی قلبی وجسمانی توجہ سے درجۂ ولایت کو پہنچی۔ آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک وبدعت کے خس وخاشاک سے پاک کردیااور کتاب وسنت کی شاہ راہ پر ڈال دیا۔ ابھی تک ان کے وعظ وپند کے برکات جاری وساری ہیں"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"خلاصہ یہ کہ اس زمانے میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحب کمال سنا نہیں گیااور جو فیوض اس گروہِ حق سے خلق خدا کو پہنچے، ان کا عشرِ عشیر بھی اس زمانہ کے علماء ومشائخ سے نہیں پہنچا"۔

علامۂ عصر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حیدر علی رامپوری ٹونکی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (م ۱۲۷۳ھ) **صیانۃ الناس** " میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ان کی ہدایت کا نور آفتاب کی مثل کمال زور اور شور کے ساتھ بلاد اور قلوب عباد میں منور ہوا ہر ایک طرف سے سعیدان ازلی رخت سفر باندھ کر منزلوں سے آآ کے، شرک وبدعت وغیرہ منہیات سے حسب عادت زمانہ خوگر ہو رہے تھے توبہ کرکے توحید وسنت کی راہِ راست اختیار کرنے لگے اور اکثر ملکوں میں خلفاء راست کردار جناب موصوف نے سیر فرماکر لاکھوں آدمیوں کو دین محمدی کی راہِ راست بتادی، جن کو سمجھ تھی اور توفیق الٰہی نے ان کی دست گیری کی وہ اس راہ

پر چلے"۔

اور ہزاروں خلیفہ جابجا مقرر ہوئے کہ ان سے ایک سلسلۂ بیعت وارشادو تلقین جاری ہے اور وہ لوگ جو نماز روزے سے بیزار اور بھنگ بورہے سے کاروبار رکھتے تھے، شراب اور تاڑی ان کے بدن کا خمیرہ ہو رہا تھا۔ بر ملا کہتے تھے کہ نماز کمپنی کا حکم نہیں اور نہ روزہ کو نسل کا آئین۔ زکوٰۃ وحج کا پھر کیا ذکر ہے؟ شب وروز رِشوت وزنا، مردم آزاری اور سود خوری میں مشغول رہتے تھے اور مرد و عورت مثل حیوانات بے نکاح باہم ہوتے اور سینکڑوں ولد الزنا ان سے پیدا ہوتے اور صدہا پیر وجوان نامختون نصاریٰ اور مشرکوں کے مثل تھے، محض حضرت کی تعلیم سے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے نکاح اور ختنے کروائے۔ نیک پاک اور متقی ہو گئے۔ حضرت کے ہاتھ پر دس دس ہزار آدمی ایک ایک بار بیعت کرتے گئے اور بہت بہت ہنود اور رافضی اور جوگی اور انت حضرت کی ارشادو تلقین سے خالص مسلمان ہو گئے اور بعضے نصاریٰ اپنی قوم سے آکر خفیہ ایمان لے آئے پھر ہزارہا علماء نے بعد حصول بیعت وخلافت رہنمائی خلق اللہ اختیار کی۔ بعضوں نے وعظ ونصیحت وارشاد وتلقین کو عادت سی ٹھہرائی اور بعضوں نے آیاتِ قرآنی واحادیث صحیحہ کی کتابیں لکھیں اور رسالے اور ترجمے شائع کیے کہ جس میں ترغیب عبادات اور ترہیب گناہ ہی سے اپنے ملک

کی زبان میں پیشہ اپنا کر کے ہزاروں جہلاء کو کہ سیدھا کلمہ پڑھنا
نہیں جانتے تھے، عالم بنا دیا اور بعضوں نے دونوں طریقے
اختیار کیے"۔ (۳۹)

ہندوستان کے ایک باخبر اور ثقہ عالمِ دین جنہوں نے اس جماعتِ قدسیہ کے بہت سے افراد کی زیارت کی تھی اور جن کا زمانہ قریب تھا، مولوی عبدالاحد صاحب لکھتے ہیں :۔

"حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے، اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے۔ اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں"۔

مشہور عالمِ ربانی اور مجاہد فی سبیل اللہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) تحریر فرماتے ہیں :۔

"جس وقت دعوت کی آواز ملک ہندوستان میں بلند ہوئی، تمام ملک کے لوگ پروانوں کی طرح اس شمع ہدایت پر ہجوم کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک روز میں دس دس ہزار آدمیوں کی جماعت بیعت ہونے لگی، ان کا گروہ روز بروز بڑھتا گیا، اور ہزارہا انسان اپنا دین چھوڑ کر اسلام سے مشرف ہوئے اور ہزارہا لوگوں نے مذاہب باطلہ سے توبہ کی، پانچ چھ برس کے عرصہ میں ہندوستان کے تیس لاکھ آدمیوں نے

حضرت سے بیعت کی اور سفر حج میں تقریباً لاکھ آدمی بیعت سے مشرف ہوئے، ان سب لوگوں میں ہزارہا عالم ہیں اور ہزارہا عاقل اور سیکڑوں حافظ ہیں اور سیکڑوں مفتی اور بہتیرے جہاندیدہ ہیں اور بہتیرے کار آزمودہ، اس سے صاف ظاہر ہوا کہ اللہ کے حضور میں ان کی بڑی مقبولیت اور تائید ہے کہ تمامی خلائقِ کا دل ان کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر مرید ہوتے ہیں"۔(۴۰)

پھر اس دعوت کے اثرات اور اس کے اثر سے زندگی کے تغیرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اس متبرک گروہ کا اثر دریافت کیا چاہئے کہ جو شخص اعتقاد کے ساتھ اس گروہ میں داخل ہوا اور اس نے بیعت کی۔ اسی وقت سے اس کو دنیا سے نفرت اور آخرت کا خوف پیدا ہوتا ہے اور روز بروز یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور شرک وبدعت سے محض پاک ہو جاتا ہے اور اللہ کی محبت وعظمت، شرع کی تعظیم و توقیر، نماز کا شوق سب اس کے دل میں جگہ پکڑتے ہیں، اللہ کے مخالف اس کو بُرے لگتے ہیں، اگرچہ باپ دادا ہوں، بیٹا بیٹی یا پیر اُستاذ۔ دل میں اللہ کا خوف کچھ ایسا آجاتا ہے کہ ان کی مروت ہر گز باقی نہیں رہتی اکثر لوگوں نے عمدہ نوکریاں چھوڑ دی ہیں۔ حرام پیشے ترک کر دیئے اور کتنے خانماں سے ہاتھ اُٹھا کر محض اللہ کے واسطے نکل پڑے، اور اس

گروہ کے سبب ایک عالم نمازی ہوا، بلکہ اس گروہ کو دیکھ کر گمراہ کرنے والے بھی اپنے معتقدوں کو نماز کی تلقین کرنے لگے کہ ہمارے لوگ کہیں ہم سے نہ پھر جائیں"۔(۴۱)

مولانا کرامت علی صاحب جونپوری (م ۱۲۹۰ھ) جو خود اپنے وقت کے ایک بڑے مصلح وداعی اور بنگال کے حق میں (جو عرصہ سے صحیح اسلامی زندگی اور اسلامی تعلیمات سے ناآشنا تھا) خدا کی رحمت اور تاثیر وہدایت میں اس کی ایک نشانی تھے(۴۲)۔ اپنے رسالہ "**مکاشفاتِ رحمت**" میں سید صاحبؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اُن کے اوصاف وکرامات لکھنے کی حاجت نہیں، تمام ملک میں مشہور ہیں اس سے بڑھ کر کیا کرامات ہوں گی کہ اس ملک کے مردوں، عورتوں میں نماز روزہ خوب جاری ہو گیا اور آگے ہندوستان کے پیرزادوں اور مولویوں سے لے کر عوام لوگوں تک کی عورتوں میں نماز کا چرچا بھی نہ تھا اور اب بالکل ہر قوم کی عورت مرد نماز میں مستعد ہو گئے ہیں، قرآن شریف کا صحیح اور باتجوید پڑھنا اور قرآن شریف کا حفظ خوب جاری ہو گیا ہے، اور حافظوں کی کثرت ہوئی ہے، یہاں تک کہ عوام لوگوں کی عورتیں حافظ ہوئیں، اور دیہات اور شہروں میں لوگ حفظ کر رہے ہیں اور پرانی مسجدیں آباد ہوئیں اور نئی مسجدیں بننے لگیں۔ ہزاروں آدمی مکہ مدینہ کے حج اور زیارت سے مشرف ہوئے اور شرک اور بدعت اور کفر کی رسم اور

خلافِ شرع کام سے لوگ باز آئے اور سب کو دین کی تلاش ہوئی اور دینی کتابیں جو نادر اور کمیاب تھیں سو شہر گاؤں میں ہر کہیں گھر گھر پھیل گئیں اور حقیقت میں حضرت سید احمد صاحبؒ اس زمانہ کے سارے مسلمانوں کے مرشد ہیں۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، جانے یا نہ جانے، مانے یا نہ مانے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے مجدد کیا ہے، اس کے طریقہ میں داخل ہونا دین میں مضبوطی کی نشانی ہے"۔ (۴۳)

بعض مغربی مصنفین کا اعتراف حق

متعدد مغربی مصنفین اور اہل قلم نے بھی (ان غلط فہمیوں یا بالارادہ غلط بیانوں کے ساتھ جس کے بعض نمونے اوپر گذر چکے ہیں) سید صاحبؒ کی تحریکِ اصلاح و جہاد اور انکی تعلیم و تربیت کے گہرے اور دیرپا اثرات اور ان کے مقاصد کی وسعت و عظمت کا اعتراف کیا۔ زمانۂ حال کا ایک مغربی مصنف (WILFRED CANTVELT SMITH) جس نے ممالکِ اسلامیہ میں پیدا ہونے والی تحریکوں اور اداروں کا غائرِ نظر سے مطالعہ کیا ہے، اپنی کتاب (ISLAM IN MODREN HISTORY) میں لکھتا ہے :۔

"لیکن تحریک کا نصب العین اور اس کی قوت محرکہ زیادہ دیرپا اور زیادہ ہمہ گیر طریقہ پر باقی رہی، کافروں کو نکال باہر کرنے کی سعی دبائی جا سکتی تھی اور دبادی گئی، مگر مسلم سوسائٹی کے اقبال کو بحال کرنے کے لئے اس کے احیاء اور تجدید کی کوششیں باقی رہنی تھیں، جس سے ضمنی طور پر دونوں مقاصد

کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس کے ذریعہ اسلامی
طاقت کا تصور بیسویں صدی میں باقی رہااور معاشرہ پر منڈلاتا
بلکہ اسے متحرک کرتارہا"۔(۴۴)

(P. HARDY) اپنی کتاب (THE MUSLIM IN BRITISH IN-DIA) میں لکھتاہے :۔

"سید احمد بریلوی کا مقصد مغلوں یا مغل اشراف کی
بحالی نہیں ، بلکہ ہندوستان کی سرحد پر قرونِ اولیٰ کی اسلامی
سوسائٹی کاایک نمونہ پیش کرنا تھا۔ انہیں یقین تھاکہ یہ نمونہ
مسلمانوں کوایسافیضان بخش سکتاہے کہ ایک دن وہ ہندوستان کو
اللہ کے لئے فتح کرلیں گے، ان کے پیغام نے اعلیٰ طبقوں کو
نہیں بلکہ ہندوستان کی مسلم سوسائٹی کے نچلے طبقات کو
متاثر کیا۔ صنعتی سوسائٹی قائم ہونے سے قبل یہ نچلے طبقے
چھوٹے زمیندار ، شہروں اور دیہاتوں کے مولوی، اساتذہ ،
کتب فروش، دکاندار چھوٹے سرکاری ملازم اور
کاریگر تھے"۔(۴۵)

نائب رسول وامامِ کامل

اب شاید وقت آچکاہے کہ اس عظیم مجدد و مصلح کی شخصیت کو (جو طویل صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے) تاریخ اسلام کے چوکھٹے میں صحیح جگہ دی جائے اور اصلاح وتجدید، فکرِ اسلامی اور جہاد و قربانی کی تاریخ میں ان کے مقام اور مرتبہ کا تعین پوری صحت، دقت نظر، احساس ذمہ داری، اور ایک ملی امانت کی حیثیت سے

کیا جائے اور انکی عظمت کے مختلف (۴۶) پہلو اُن کے حقیقی اور اعلیٰ مقاصد اور اصلاحی اور جنگی منصوبے اور نقشے، اُن کی عالی ہمتی اور اولوالعزمی اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت و تدبر کے اعلیٰ اوصاف کو اجاگر کیا جائے جو ابھی تک پورے طور پر روشنی میں نہیں آئے اور جن پر اتنے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ان کی اصل تابانی سے عالمِ اسلام پوری طرح فیضیاب نہیں۔

جس شخص کو اس آیت قرآنی کی روشنی میں دین کا صحیح فہم حاصل ہو:

لقد من الله علی المومنین اذبعث فیهم رسولاً من انفسهم یتلوا علیهم آیاته وَیز کّیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین . (آل عمران . ١٦٤) خدا نے ان مومنو پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجے جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اور جس کی نظر میں دین کے وسیع آفاق، اسکی گہرائیاں اور اس کے وہ اعلیٰ مقاصد ہوں جو عقیدہ و عبادت، اخلاق و سلوک، تزکیہ و تربیت، اللہ تعالیٰ سے گہرے اور مستحکم تعلق، قرآنی اور ایمانی اخلاق و کردار، اخلاص و للّٰہیت اور خلافت راشدہ کے نقشے پر عادلانہ اور عارفانہ سیاست و انتظامِ ملکی سب پر حاوی ہیں اور اس نے اسلام کو اس صورت و معنی میں سمجھا ہو جس صورت و معنی میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کرام اور تابعین نے سمجھا اور پیش کیا تھا نہ کہ اس منقسم اور جزئی شکل میں جس نے اس کو ظاہر و باطن، جسم و روح، دین و سیاست میں بانٹ دیا ہے، نہ اس بدلی ہوئی بدنما شکل میں جو مغربی فلسفوں، مغربی طرزِ فکر اور غیر شعوری ردّ عمل کے نتیجہ میں عمل میں آئی ہے، ایسا شخص البتہ ایسی اہم اور مایہ ناز

شخصیت کے ساتھ ضرور انصاف کرے گا اور اس کو تاریخ اسلام کی اسی صف میں رکھے گا جو اسلام کے یگانہ اور یکتائے زمانہ ائمہ ہدایت، مجددین دین اور مجاہدینِ اسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔

سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور ان کا فہم دینی اور ان کی دعوت اسلامی کی حقیقی واولین شکل میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش دراصل قرآن کے عمیق مطالعہ کا عکس اور سیرت نبویؐ اور عشق رسولؐ کا حسین و جمیل پرتو ہے جو ان کے گوشت وپوست میں خونِ حیات کی طرح پیوست اور جاری وساری تھا، اور اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عہد اور معاشرہ کے لئے خصوصی طور پر تیار اور اس منصبِ عظیم پر مامور کیا تھا جس کو کسی ایسے عظیم مصلح کی شدید ضرورت تھی جو اپنے صدق واخلاص، حسنِ نیت، صفائی قلب، طہارتِ باطنی، بے لوثی وبے غرضی، اغراضِ دنیاوی، شوقِ نام آوری اور شہرت طلبی سے سخت نفرت وکراہت، اللہ تعالیٰ کے دربارِ عالی میں کثرت دعا اور اظہار عاجزی ولاچاری جیسی وہبی صلاحیتوں اور نعمتوں سے کام لے کر اس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک سکے اور اس کی سرد رگوں میں نیا جوش مارتا ہوا خون ڈال سکے اس لئے ان کو عام قومی وملی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، بانیانِ حکومت وسلطنت، فاتحین وکشور کشاؤں، جماعتوں وتحریکوں کے مؤسسین (FOUNDERS) پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

جس کو ترک واختیار، احساس حسن وقبح، اخلاق وعادات، عبادت ودعا، سیاست وحکومت میں ذوقِ نبوی، یا ذوقِ محمدی کا کچھ اندازہ ہے اور وہ اس طرزِ خاص کا اداشناس ہے جس کو ہم مزاجِ نبوت کہہ سکتے ہیں اور جس میں تمام انبیاء

شریک ہیں وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ان کے سینوں میں درد و سوز کی کون سی آگ سلگتی ہے، ان کی روح کس لئے بے چین ہوتی ہے، ان کی راتوں کی نیند کیوں حرام ہوتی ہے۔ دن میں وہ کس لئے دیوانہ وار پھرتے ہیں اور صبح و شام سے بے پرواہ ہو کر اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، وہ کیا چیز ہے جو ان کے دلوں کے سوتوں کو روانی بخشتی ہے، وہ کیا درد ہے جو ان کی آنکھوں کو اشکبار کرتا ہے، وہ کیا "**اکسیر**" ہے جس سے ان کی زبان سر چشمۂ حکمت بن جاتی ہے اور ان کے سیدھے سادھے اور مختصر جملوں سے پتھر موم ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے معاند اور گمراہ چشم زدن میں راہِ ہدایت پر آجاتے ہیں۔

جو ایک دفعہ اس ذوق کو سمجھ لے گا اور راز سے آشنا ہو جائے گا اس کے ہاتھ میں وہ "**شاہِ کلید**" آجائے گی جس سے اس شخصیت کا قفل آسانی سے کھل سکتا ہے جو بہت سے قارئین کے لئے اب بھی ایک راز سربستہ اور بہت سے ان اہل قلم اور اصحاب فکر و تحقیق کے لئے چیستاں ہے جو مادی ذہن کے غلبہ اور عصرِ حاضر کے معروف تصورات اور مخصوص پیمانوں کے اثر اور گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔

واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔

آپ کی امامت و قیادت اپنے وقت کی وہ آزاد زندہ اور حقیقی امامت و قیادت تھی جس کی طرف ہر زمانہ میں مسلمانوں کے بالغ نظر حکماء و مبصرین کی آنکھیں لگی رہی جس کے انتظار میں چرخ کہن سینکڑوں کروٹیں بدل چکا، جو مسلمانوں کی درد کا واحد درماں اور اسلام کے حق میں پیغام حیات

ہے۔ اس امامت کی حقیقت ہمارے زمانے کے حکیم شاعر ڈاکٹر اقبال نے بیان کی ہے۔ ؎

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے — حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام بر حق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست — زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے — فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنہ ٔ ملت بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (۴۷)

حواشی :۔

(۱) متعدد ہندوستانی و پاکستانی فضلاء و اہل علم نے اس موضوع پر محققانہ مقالے لکھے ہیں اور ہندوستان اور یورپ و امریکہ کی مشہور جامعات میں اس پر لیکچر دیئے ہیں کہ اردو زبان پر حضرت سید احمد شہیدؒ و مولانا اسماعیل کی تحریک و جہاد کا کیا اثر پڑا اور اس کی وجہ سے اسالیب زبان میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور اردو زبان نے کس طرح عوام کو مخاطب و متاثر کرنا سیکھا اور وہ عام و فہم اور آسان زبان بنی، اس سلسلہ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا فاضلانہ مقالہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

(۲) اس کا بہترین نمونہ ان کی بلند پایہ کتاب **"صراط مستقیم"** اور شاہ اسماعیل کی شہرۂ آفاق کتاب **"تقویۃ الایمان"** ہے، ان دونوں کتابوں سے ان کے خیالات کا پورا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۳) ملاحظہ فرمایئے، ان کی کتاب "صراط مستقیم" فصل پنجم، ضرورت جہاد۔ نیز ان کے مکاتیب اور خطوط جو انہوں نے ہندوستان کے حکام و رؤساء و علماء و مشائخ اور سرحد و افغانستان و بخارا و ترکستان کے اہل حکومت کو لکھے۔ **"سیرت سید احمد شہیدؒ"** حصہ اول سولہواں باب ص ۳۸۵، ۳۹۵

(۴) یعنی پہلے اسلام کی دعوت، پھر جزیہ کی مہلت اس کے بعد دعوتِ مبارزت یہ وہ اسلامی طریقہ ہے جس کو اسلامی حکومتوں اور مسلم ممالک کے قائدین نے صدیوں سے فراموش و نظر انداز کر رکھا تھا۔

(۵) ان کی تعداد ڈیڑھ سو بتائی گئی ہے، جو سب کے منتخب ترین، صالح اور کارگزار افراد تھے اور اس معاشرہ کا عطر و جوہر۔

(۶) رنجیت سنگھ کی قائم کی ہوئی عظیم سلطنت پر انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں کلی طور پر قبضہ کر لیا جس کا مطلب

یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کی شہادت کے کل ۱۸ برس بعد اس سلطنت کا چراغ بھی آخری طور پر گل ہو گیا۔

(۷) تفصیل کے لئے دیکھئے "**ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**" از مولانا مسعود عالم ندوی اور "**سید احمد شہید**" از غلام رسول مہر جلد چہارم "**جماعت مجاہدین**"

(۸) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (THE GREAT WHABI CASE) اور ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب (OUR INDIAN MUSALMANS)

(۹) مولانا یحیٰ علی عظیم آبادی امیر جماعت مجاہدین

(۱۰) "**مسلمانانِ ہند**" ڈاکٹر ہنٹر خطوط سو مورخہ ۱۳ر مئی ۱۸۴۳ء و ۱۸۴۷ء۔

(۱۱) اس جدوجہد کے قائدوں میں جنرل بخت خاں (سپہ سالار عام) اور مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی کا تعلق سید صاحبؒ اور ان کی جماعت سے ثابت ہو چکا ہے۔ ہنٹر نے اعتراف کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کی بجی بجھی چنگاریاں کام کر رہی تھیں۔

(۱۲) تفصیل کے لئے دیکھیں مصنف کی کتاب "**ہندوستانی مسلمان**" باب "**ہندوستانی کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ**" از صفحہ ۱۵۴ تا صفحہ ۱۷۶

(۱۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، "**ہندوستانی مسلمان**" از ڈاکٹر ہنٹر۔

(۱۴) لاہور میں سرائے شفیع کے نام سے اب بھی انار کلی کے قریب ایک محلہ موجود ہے۔

(۱۵) ملاحظہ ہو "**کالا پانی**" از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری۔

(۱۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "**کالا پانی**" یا "**تواریخ عجیب**" از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری۔ مطبوعہ صوفی پرنٹنگ پریس پنڈی بہاؤالدین پنجاب اور الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور۔

(۱۷) سید احمد شہید ص ۱۶ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

(۱۸) مولانا اسماعیل شہیدؒ نے جو سید صاحبؒ کے دستِ راست اور گویا ترجمان اور وزیر تھے علماء و مشائخ کے نام ایک مکتوب میں یہ الفاظ لکھے ہیں:۔ "جہاد کی اہمیت آج علماء کے نزدیک اتنی بھی باقی نہیں رہ گئی ہے جتنی ان کی نگاہ میں کتاب الحیض والنفاس کی اہمیت ہے"۔

(۱۹) ابو داؤد بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ

(۲۰) "**صراط مستقیم**" باب دوم فصل چہارم افادہ پنجم

(۲۱) اس کا ثبوت جہاد کی فضیلت میں مومن خاں مومن کا کلام اور مولانا خرم علی بلہوری کے "**قصیدہ جہادیہ**" سے ملتا ہے جو مجاہدین کی اگلی صفوں میں عین لڑائی کے آغاز کے وقت پڑھا جاتا تھا۔ سید صاحبؒ ہی خاندان کے ایک فرد منشی سید عبد الرزاق کلامی مرحوم نے "**فتوح الشام**" موسوم بصمصام الاسلام

(مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ) کے نام سے غزوات اسلام پر ایک شاہ نامہ تیار کیا تھا، جو پچیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پورے ملک میں پھیل گئی تھی اور علم ودین کے گھرانوں اور عام مسلمانوں میں باقاعدہ پڑھی جاتی تھی اور سب بیٹھ کر اس کو سنتے تھے۔ یہ سب اسی دعوت وجہاد کا نتیجہ تھا جس کا پرچم سید صاحبؒ نے بلند کیا اور اس کے نتیجہ میں یہ فضا قائم ہوئی۔

(۲۲) انگریزی حکومت اور انگریز مصنف سید صاحبؒ کی جماعت کے لوگوں کو اسی طرح یاد کرتے ہیں۔

(۲۳) دیکھئے سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول عنوان "**حج کی عدم فرضیت کا فتنہ**" ص ۲۴۷ نیز "**فریضۂ حج کی ہندوستانی تجدید**"۔ ص ۲۵۱

(۲۴) "**سیرت سید احمد شہیدؒ**" حصہ اول ص ۲۶۲ بحوالہ وقائع احمدی ص ۶۰۲

(۲۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، عنوان "**بیوہ کا نکاح**" ص ۲۲۹ سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول

(۲۶) تفصیل کے لئے دیکھئے "**جب ایمان کی بہار آئی**"۔ عنوان "**نظام قضا واحتساب کا قیام**" ص ۱۴۰۔

(۲۷) پورا قصیدہ سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول، اور سید احمد شہیدؒ از غلام رسول مہر میں دیکھا جا سکتا ہے

(۲۸) شاید اس موقع پر باخبر ناظرین کو یہ خیال گزرے کہ بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر کے مشہور عرب مصلح اور داعئ توحید شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی (ولادت ۱۱۱۵ھ م ۱۲۰۶ھ) کا معاملہ اس بارے میں سید صاحبؒ سے کچھ مختلف نہیں بلکہ بڑھا ہوا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شیخ کے متعلق جو کچھ لکھا اور کہا گیا ہے وہ عربی ترکی اور مشرقی زبانوں میں ہے اور زیادہ تر مسلمانوں کے قلم سے ہے، مغرب کے فضلاء نے اس کے خلاف کوئی خاص مہم نہیں چلائی، جہاں تک مغرب کے اہل قلم کا تعلق ہے انہوں نے سید صاحبؒ کے بارے میں جو معاندانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرز اختیار کیا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

(۲۹) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "**سیرت سید احمد شہید**" حصہ اول ص ۲۵۶، ص ۳۸۱۔

(۳۰) ملاحظہ ہو سید صاحبؒ کی مختلف تقریروں اور مواعظ کی قلمی روئدادیں اور ان کی تعلیم وتحقیقات کا مجموعہ "**صراط مستقیم**" جو ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) حج کے سفر سے تین سال قبل مکمل ومتداول ہو چکا تھا۔

(۳۱) ملاحظہ ہو منشی سید حمید الدین صاحب کے فارسی خطوط جو انہوں نے سفر کے دوران ہندوستان کے اعزاء اور معززین کو لکھے اور جو مجموعۂ خطوط قلمی میں محفوظ ہیں۔

(۳۲) یہ جلدیں کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ہیں۔

(۳۳) اردو میں یہ کتاب "**جب ایمان کی بہار آئی**" کے عنوان سے "**مکتبہ فردوس**" لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

(۳۴) سید لکھنے کے بعد مصنف کو یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ وہ پشتنی مسلمان تھے، اس کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا کیا مطلب تھا؟

(۳۵) "الشیخ محمد بن عبدالوہاب" مطبعۃُ الحکومۃ مکہ مکرمہ ص ۸۷ (۱۳۹۵ھ) سید صاحبؒ کے تذکرے اور ان کی سرگرمیوں کے لئے جن میں اسی انداز سے واقعات بیان کئے گئے ہیں ص ۸۹ بھی ملاحظہ ہو۔

(۳۶) ملاحظہ ہو کتاب المهدویه والمهدیون.

(۳۷) زعماء الاصلاح فی عصر الحدیث ص ۲۱

(۳۸) دیکھئے کتاب "شرقِ اوسط کی ڈائری" از مصنف

(۳۹) صیانة الناس عن وسوسة الخناس از مولانا حیدر علی رامپوری مطبوعہ ۱۲۶۷ھ ص ۴، ۵ تا ۶۔

(۴۰) رسالہ "دعوت" مشمولہ مجموعہ رسائل تسعہ از مولانا ولایت علی عظیم آبادی ص ۶۵

(۴۱) رسالہ "دعوت" از مولانا ولایت علی عظیم آبادی صادق پوری ص ۶۸۔

مولانا ولایت علی عظیم آبادی صادق پور کے اس گروہ صادقین کے سرگروہ، امیر اور مربی تھے جو عامل بالحدیث تھا اور ابھی تک یہی اس کا شعار اور دستور ہے، انہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی عظمت و مقبولیت اور فیض و تاثیر کی شہادت جن میں بلند الفاظ میں دی ہے وہ اوپر گذر چکی۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اپنی مشہور تالیف "صراط مستقیم کے مقدمہ میں سید صاحبؒ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

> "امابعد میگوید عاجز ذلیل الراجی لرحمۃ اللہ الجلیل بندۂ ضعیف محمد اسماعیل کہ نعم الٰہی دربارۂ اس ضعیف نامتناہی است، واز اعاظم آں حضور محفل ہدایت منزل ملازماں فخر خاندان سیادت، مرجع اربابِ ہدایت، مرکز دائرہ ولایت، دلیلِ سبیل فلاح ورشاد رہنمائی طریق استقامت وسداد، مظہر انوار نبوی، منبع آثار مصطفوی، سلالۂ خاندان صلب طاہر۔ سید الاولیاء اعنی علی مرتضیٰ، نقادہ دودماں سبط اکبر سند الاصفیاء اعنی حسن مجتبیٰ، تقدائی اصحاب شریعت پیشوائے اربابِ طریقت، ہادیٔ زمانہ، مرشد یگانہ سراج المحبین، تاج المحبوبین، الامام الاوحد السید احمد متع اللہ المسلمین، بطول بقائہ وتفعنا وسائر الطالبین باقوالہ وافعالہ واحوالہ"۔

(۴۲) راقم سطور نے خود نواب بہادر یار جنگ کی زبان سے ایک تقریر میں سنا کہ میری معلومات یہ ہیں کہ مولانا کرامت علی کے ذریعہ بنگال میں جن لوگوں کو ہدایت ہوئی، ان کی تعداد دو کروڑ کو پہنچتی ہے۔

(۴۳) "مکاشفاتِ رحمت" از مولانا کرامت علی جونپوری

NEW YARK 1957, P.53 (۴۴)

CANAIDY 1972, P.58 (۴۵)

(۴٦)اس سلسلہ میں سب سے وقیع اور نفیس کتاب جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے (اگرچہ بہت اختصار کے ساتھ بلکہ اشارہ اور کنایہ کی زبان میں) وہ ملتِ اسلامی ہند کے ایک فرد فرید مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف "**منصبِ امامت**" ہے اور اپنے موضوع پر بے مثل کتاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

علم کا مقام
اور
اہلِ علم کی ذمہ داریاں

مفکر اسلام کا وہ مقالہ جو کشمیر یونیورسٹی کے ساتویں کانووکیشن منعقدہ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علیؒ ندوی کو ڈاکٹر آف لیٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کئے جانے کے موقع پر پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم کا مقام
اور
اہلِ علم کی ذمہ داریاں

جناب چانسلر صاحب (بی۔ کے نہرو۔ گورنر کشمیر) پرو چانسلر صاحب (شیخ محمد عبداللہ چیف منسٹر کشمیر) وائس چانسلر صاحب (ڈاکٹر وحید الدین ملک) اساتذۂ جامعہ، فضلائے کرام اور معزز حاضرین!

میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے، جو بٹ نہیں سکتی، اسکو قدیم و جدید مشرقی و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں اور جیسا کہ علامہ اقبالؔ نے کہا ہے ؎

دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں جو خدا کی دین ہے، جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں اور نہ ہونی چاہئے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے، وہ "**وحدت**" سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے، اور اسکو پانے کی خوشی ہے، اس کے باوجود میں جناب چانسلر صاحب، وائس چانسلر صاحب اور

اس جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اپنے ایک علمی اعزاز کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جسکا انتساب اور تعلق قدیم طرز تعلیم سے ہے۔

میں علم ،ادب،شاعری ،فلسفہ ، حکمت کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی "وردی" پہن کر آئے وہی عالم اور دانشور ہے اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے نہ لائق سماعت، بد قسمتی سے ادب وشاعری میں بھی یہی حال ہے، جو ادب کی دوکان نہ لگائے اور اس پر ادب کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے اور جو ادب کی وردی پہن کر ادبی محفل میں نہ آئے وہ بے "ادب" ہے،لوگوں نے ان پیدائشی ادیبوں اور شاعروں کا قصور کبھی معاف نہیں کیا، جن کے جسم پر وہ وردی دکھائی نہ دیتی ہو یا جن کو بد قسمتی سے ان وردیوں میں سے کوئی وردی نہ مل سکی ہو، میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں، جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے،اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے کسی وقت فیضان میں کمی نہیں۔

حضرات!

اس موقر دانش گاہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو فلک بوس ہمالیہ کی ایک سرسبز و حسین وادی میں منعقد ہو رہا ہے، مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آتا ہے، جب عرب کے ایک خشک علاقہ میں ایک پہاڑ پر جو نہ بلند تھا اور نہ سرسبز،(۱) تقریبا چودہ سو سال پہلے پیش آیا تھا،اور جس نے تاریخ انسانی ہی نہیں بلکہ تقدیر انسانی پر ایسا گہرا اور لازوال اثر ڈالا ہے، جس کی نظیر تاریخ

میں نہیں ملتی اور جس کا اس ''لوح و قلم'' سے خاص تعلق ہے، جس پر علم و تہذیب اور تحقیق و تصنیف کی اساس ہے اور جس کے بغیر نہ یہ عظیم دانش گاہیں وجود میں آتیں اور نہ یہ وسیع کتب خانے جس سے دنیا کی زینت اور زندگی کی قدروقیمت ہے، میری مراد پہلی وحی کے واقعہ سے ہے جو ۱۲ فروری ۶۱۱ء کے لگ بھگ نبی عربی محمد ﷺ پر مکہ کے قریب غارِ حرا میں نازل ہوئی، اس کے الفاظ یہ تھے۔

اقرا باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرا وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم (سورہ علق ۱ تا ۵)

(اے محمد ﷺ) اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

خالق کائنات نے اپنی وحی کی اس پہلی قسط اور باران رحمت کے اس پہلے چھینٹے میں بھی اس حقیقت کے اعلان کو مؤخر وملتوی نہیں فرمایا کہ علم قسمت سے وابستہ ہے، غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی امی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا، اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود بھی نہیں سیکھا تھا، جو قلم کے فن سے یکسر واقف نہ تھا، کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے؟ اور اس بلندی کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ اس نبی امی پر ایک امت امی اور ایک ناخواندہ ملک کے درمیان (جہاں جامعات اور دانش گاہیں تو بڑی چیز ہیں، حرف شناسی بھی عام نہیں تھی) پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے، اور آسمان و زمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے تو اس

کی ابتدا ہوتی ہے "اقرا" سے، جو خود پڑھا ہوا نہیں تھا، اس پر جو وحی نازل ہوتی ہے، اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ "پڑھو" یہ اشارہ تھا اس طرف کہ آپ کو جو امت دی جانے والی ہے، وہ امت صرف طالب علم ہی نہ ہوگی بلکہ معلم، عالم اور علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنیوالی ہوگی، جو دور آپکے حصہ میں آیا ہے، وہ دور "امیت" کا دور نہیں ہوگا وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دَور جہالت کا دَور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دور ترقی کا دور ہوگا۔

"اِقرأ باسم ربك الذی خلق" (اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا) بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستے سے ہٹ گیا تھا، اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو یہاں جوڑا گیا، جب علم کو یاد کیا گیا، اس کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھی آگاہی دی گئی کہ اس علم کی ابتدا "اسم رب" سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ علم اسی کا دیا ہوا ہے، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اسی کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انگیز اور صاعقہ آسا آواز تھی جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی، جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا، اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے کہ جو وحی نازل ہونے والی ہے، اس کی ابتدا کس چیز سے ہوگی؟ اس میں کس چیز کو اولیت دیجائیگی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی بھی جو اس امی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا، یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ "اقرا" کے لفظ

سے شروع ہوگی۔

یہ ایک انقلاب انگیز دعوت تھی کہ علم کا سفر خدائے حکیم و علیم کی رہنمائی میں شروع کیا جانا چاہئے اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل، پُر پیچ اور بہت پُر خطر ہے، یہاں دن دہاڑے قافلے لٹتے ہیں، قدم قدم پر مہیب و عمیق گھاٹیاں ہیں، گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہئے اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، مجرد علم وادب نہیں، وہ علم مقصود نہیں جو بیل بوٹے بنانیکا نام ہے، جو محض کھلونوں سے کھیلنے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدہ کی خندق کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے، بلکہ "اقرا باسم ربك الذى خلق خلق الانسان من علق اقر ا وربك الاكرم الذى علم بالقلم علم الانسان مالم يعلم". پڑھو تمھارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمھاری ضرورتوں سے، تمھاری کمزوریوں سے، کیسے ناآشنا ہو سکتا ہے، "اقرا وربك والاكرم الذى علم بالقلم "آپ خیال کیجئے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غار حرا کی پہلی وحی نے بھی قلم کو فراموش نہیں کیا، وہ قلم جو شاید ڈھونڈنے سے بھی مکہ میں کسی گھر میں نہیں ملتا، اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو شاید معلوم نہیں کسی ورقہ بن نوفل (۲) کے یا کسی "**کاتب**"(۳) کے جو دیار عجم سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ کر آیا ہو، گھر میں ملتا۔

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی

کوئی انتہا نہیں "علم الانسان مالم یعلم" انسان کو سکھایا جس کا اس کو پہلے سے علم نہ تھا، سائنس کیا ہے؟ ٹکنالوجی کیا ہے؟ انسان چاند پر جارہا ہے، خلا کو ہم نے طے کر لیا ہے، دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں، یہ سب "علم الانسان مالم یعلم" کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے؟

حضرات!

اجازت دیجئے! کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وادی علم کے ایک مسافر کی حیثیت سے کچھ مشورے اور کچھ تجربے پیش کروں۔

جامعات کا پہلا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایسا کیرکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبال ایک کفِ جو کے بدلے میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آجکل کے فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے، کوئی اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جاسکتا تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائیگا؟ ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کر سکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تخریبی فلسفہ، کوئی غلط دعوت و تحریک کسی دام خرید نہ سکے، جو اقبال کے الفاظ میں پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ کہہ سکیں۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغرِ نہیں میں

دوسرا فرض یہ کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں حق و صداقت اور علم و ہدایت کیلئے قربان کرنے کیلئے تیار ہوں، جن کو کسی کے لئے بھوکا رہنے میں وہ لذت آئے جو کسی کو پیٹ بھر کھانے اور "نائے و نوش" میں آتی

ہے، جن کو کھونے میں وہ مسرت حاصل ہو جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں ہوتی، جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں، ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ جس سے انکی جھولی بھر دی گئی ہے، انسانیت کو تباہی سے بچانے کیلئے صرف کریں۔

دانش گاہوں کو دیکھنا چاہئے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہی ہیں؟ میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں بڑی تعداد میں یونیورسیٹیاں ہیں یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہو گئی ہے، سوال یہ کہ علم کے شوق میں، جستجو کی راہ میں، علم واخلاق کے پھیلانے، اور برائیوں، بداخلاقیوں، سفاکی ودرندگی، دولت وقوت کی پرستش کو روکنے لیے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں۔ اپنی قوم کو صاحب شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کیلئے کتنی تعداد میں نوجوان موجود ہیں، جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کر کے اس مقصد کیلئے اپنے کو وقف کرتے ہیں، اصل معیار یہ ہے کہ کتنے نوجوان ایسے ہیں جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کر کے کسی گوشے میں ٹھوس علمی و تعمیری کام کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب، شاعری، فنون لطیفہ، حکمت و فلسفہ، تصنیف و تالیف سب کا مقصد یہ ہے کہ ملک وملت میں ایک نئی زندگی اور روح پیدا ہو اور ساب کی نمود اور شعلہ کی بھڑک نہ ہو، میں اس وقت ترجمان حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال کے یہ شعر پڑھوں گا، جو انھوں نے اگرچہ کسی ادیب یا شاعر سے مخاطب ہو کر کہے تھے، لیکن یہ علم وادب، فلسفہ وحکمت سب پر صادق آتے ہیں۔؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن ۔۔۔ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے ۔۔۔ یہ اک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ۔۔۔ جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

حضرات!

اب آخر میں مجھے اپنے ان قابل مبارکباد بھائیوں سے جو یہاں سے سند لے کے جارہے ہیں یا ان خوش نصیب عزیزوں سے جو ابھی اس چمن علم کی خوشہ چینی میں مصروف ہیں، کچھ کہنے کی اجازت دیجئے! میں اپنی بات کہنے میں (جو شاید کسی قدر خشک اور سنجیدہ ہوں) ایک دلچسپ کہانی کا سہارا لوں گا، جو شاید آپکے کانوں کا ذائقہ تبدیل کرنے میں مدد کرے۔

راوی صادق البیان کہتا ہے کہ ایک بار چند طلباء تفریح کیلئے ایک کشتی پر سوار ہوئے طبیعت موج پر تھی، وقت سہانا تھا، ہوا نشاط انگیز اور کیف آور تھی، اور کام کچھ نہ تھا، یہ نو عمر طلباء خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے؟ جاہل ملاح دلچسپی کا اچھا ذریعہ، اور فقرہ بازی مذاق و تفریح طبع کیلئے بیحد موزوں تھا، چنانچہ ایک تیز و طرار صاحبزادہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "چچا میاں آپ نے کون سے علوم پڑھے ہیں؟

ملاح نے جواب دیا "میاں! میں نے کچھ پڑھا لکھا نہیں"

صاحبزادے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ارے آپ نے سائنس نہیں پڑھی" ملاح نے کہا "میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا"

دوسرے صاحبزادہ بولے "جامٹری اور الجبرا تو آپ ضرور جانتے ہوں گے"؟ ملاح نے کہا "حضور یہ نام میرے لئے بالکل نئے ہیں"

اب تیسرے صاحبزادہ نے شوشہ چھوڑا" مگر آپ نے جوگرفی اور ہسٹری تو پڑھی ہی ہو گی" ؟

ملاح نے جواب دیا" سرکار یہ شہر کے نام ہیں یا آدمی کے" ؟ ملاح کے اس جواب پر لڑکے اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے اور انھوں نے قہقہہ لگایا، پھر انھوں نے پوچھا "چچا میاں! تمھاری عمر کیا ہو گی" ؟ ملاح نے بتایا" یہ کوئی چالیس سال" لڑکوں نے کہا" آپ نے اپنی آدھی عمر برباد کی اور کچھ پڑھا لکھا نہیں"

ملاح بیچارہ خفیف ہو کر رہ گیا، اور چپ سادھ لی، قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کشتی کچھ ہی دور گئی تھی کہ دریا میں طوفان آگیا، موجیں منھ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی تھیں اور کشتی ہچکولے لے رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبی تب ڈوبی، دریا کے سفر کا لڑکوں کا پہلا تجربہ تھا، ان کے اوسان خطا ہو گئے، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اب جاہل ملاح کی باری آئی، اس نے بڑی سنجیدگی سے منھ بنا کر پوچھا "بھیا! تم نے کون کون سے علم پڑھے ہیں" ؟

لڑکے اس [illegible] نہیں سمجھ سکے اور کالج یا مدرسہ میں پڑھے ہوئے علوم کی لمبی فہرست گنانی شروع کر دی، اور جب وہ بھاری بھر کم اور مرعوب کن نام گنا چکے تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا، "ٹھیک ہے یہ سب تو پڑھا، لیکن کیا پیراکی بھی سیکھی ہے؟ اگر خدانخواستہ کشتی الٹ جائے تو کنارے کیسے پہنچ سکو گے؟ لڑکوں میں کوئی بھی پیرنا نہیں جانتا تھا، انھوں نے بہت افسوس کے ساتھ جواب دیا" چچا جان! یہی ایک علم ہم سے رہ گیا ہے، اسے نہیں سیکھ سکے"

لڑکوں کا جواب سن کر ملاح زور سے ہنسا اور کہا" میاں! میں نے تو اپنی

آدھی عمر کھوئی مگر تم نے تو پوری عمر ڈبوئی، اس لئے کہ اس طوفان میں تمہارا پڑھا لکھا کام نہ آیگا ، آج پیراکی ہی تمھاری جان بچا سکتی ہے ، اور وہ تم جانتے ہی نہیں"(۴)

آج بھی دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں جو بظاہر دنیا کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں، صورتِ حال یہی ہے کہ زندگی کا سفینہ گرداب میں ہے، دریا کی موجیں خونخوار نہنگوں کی طرح منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی ہیں، ساحل دور ہے اور خطرہ قریب، لیکن کشتی کے معزز و لائق سواریوں کو سب کچھ آتا ہے، مگر ملاحی کا فن اور پیراکی کا علم نہیں آتا۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے سب کچھ سیکھا ہے لیکن بھلے مانسوں، شریف، خداشناس اور انسانیت دوست انسانوں کی طرح زندگی گذارنے کا فن نہیں سیکھا، اقبال نے اپنے ان اشعار میں اسی نازک صورتِ حال اور اس عجیب و غریب **"تضاد"** کی تصویر کھینچی ہے، جس کا اس بیسویں صدی کا مہذب اور تعلیم یافتہ فرد بلکہ معاشرہ کا معاشرہ شکار ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

شریفانہ انسانی زندگی گذارنے کا بنیادی فن، خداترسی، انسان دوستی، ضبط نفس کی ہمت و صلاحیت، ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی عادت، انسانیت کا اہتمام، انسانی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کا جذبہ، حقوق کے مطالبہ پر ادائے فرض کو ترجیح، مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت و حفاظت اور ظالموں و طاقت وروں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ، ان انسانوں سے جو دولت و جاہت کے سوا کوئی جوہر نہیں

رکھتے، عدم مرعوبیت و بے خوفی، ہر موقع پر اور خود اپنی قوم اپنی جماعت کے مقابلے میں کلمۂ حق کہنے کی جرأت، اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور ترازو کی تول، کسی داناوبینا، طاقت کی نگرانی کا یقین اور اسکے سامنے جواب دہی اور حساب کا کھٹکا، یہی صحیح خوشگوار و بے خطر اور کامیاب زندگی گذارنے کی بنیادی شرطیں اور ایک اچھے وخوش اسلوب معاشرہ، اور ایک طاقتور و محفوظ باعزت ملک کی حقیقی ضرورتیں اور اسکے تحفظ کی ضمانتیں ہیں، اسکی تعلیم اور اس کے لئے مناسب ماحول مہیا کرنا دانشگاہوں کا اولین فرض، اور اس کا حصول تعلیم یافتہ نسل اور ملک کے دانشوروں کی پہلی ذمہ داری ہے، اور ہم کو اس جیسے تمام مواقع پر دیکھنا چاہئے کہ اس کام کی تکمیل میں ہماری دانش گاہیں کتنی کامیاب اور ان کے سند یافتہ افراد و فضلاء کتنے قابل مبارکباد ہیں، اور آئندہ ان مقاصد کے حصول اور تکمیل کے لئے ہم کیا عزائم رکھتے ہیں، اور ہم نے کیا انتظامات سوچے ہیں۔

آخر میں میں پھر آپ کی عزت افزائی، اعتماد اور جذبۂ محبت واحترام کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے اپنے اس اقدام کی شکل میں اظہار فرمایا ہے۔

حواشی:۔

(۱) اس موقع پر مقرر نے کہا کہ وہ سرزمین خشک اور وہ پہاڑ غیر سرسبز تھا، لیکن حفیظ جالندھری نے خوب کہا ہے ؎

نہ یاں پر گھاس اگتی ہے نہ یاں پر پھول کھلتے ہیں ☆ مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

(۲) عہد بعثت کے ایک عرب فاضل جو توراۃ وانجیل کے بڑے عالم تھے، اور عبرانی زبان سے خوب واقف تھے۔

(۳) عرب میں پڑھے لکھے آدمی کو "**کاتب**" کہتے تھے۔

(۴) ماخوذ از "منصب **نبوت** اور اس کے **عالی مقام حاملین**" از **مصنف**۔

بصائر

ہندوستانی کی عظیم دینی واصلاحی تحریکات اور دعوتوں ،مدارس وحلقہائے فکر اور تعلیمی وتربیتی مرکزوں کا اجمالی ومستند تعارف۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بصائر

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد واله وصحبه اجمعين ومن تبعهم باحسان ودعا بدعوتهم الى يوم الدين.

غیر مسلموں سے اختلاط اور کتاب وسنت کی تعلیم کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں میں بعض اعتقادی عملی خرابیاں:

ہندوستان کی قدیم تاریخ پر نظر رکھنے والا ہر شخص اس سے واقف ہے کہ سرزمین ہند کا بت پرستی سے بہت پرانا اور گہرا تعلق ہے، وہ یہاں اجنبی نہیں بلکہ یہیں کی پروردہ، ساختہ پرداختہ ہے اور یہاں کے ادیان و مذاہب تو کجا، یہاں کی تہذیب وتمدن، آداب و معاشرت اور علم ریاضی اور علم فلکیات تک میں اس کی آمیزش ہے۔

یہ سرزمین دیوی دیوتاؤں کی ہے افسانوں اور کہانیوں کی ہے، میلوں اور تہواروں کی ہے، یہاں جشن بھی منایا جاتا ہے اور سوگ بھی، یوم پیدائش بھی

منایا جاتا ہے اور یوم وفات بھی، یہاں تقریبات کا آئے دن انعقاد ہوتا رہتا ہے اور تاریخی اور افسانوی شخصیتوں کی یاد منانے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

ابتدائی عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کی عام زندگی، بود باش، عادات واطوار، اور طور وطریق پر اس ماحول نے کچھ نہ کچھ اثر ڈالا اور مسلم حکمرانوں کی بے توجہی، علم حدیث سے بے اعتنائی، کتب احادیث کی کم یابی، ہم وطنوں سے اختلاط و تعلقات اور رسم ورواج میں آزادانہ شرکت نے مسلمانوں کی معاشرت پر اثر ڈالا اور بعض غیر اسلامی رسم ورواج داخل ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نشر و اشاعت اور حق وباطل میں امتیاز کے لئے، مصلحین و مجددین کی ایک جماعت پیدا فرمائی جس کے سر خیل مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندیؒ اور ان کے خلفاء تھے، مجدد الف ثانیؒ کے بعد اس جماعت کی قیادت کی باگ ڈور شاہ ولی اللہؒ دہلوی، ان کے افراد خاندان اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے علماء و فقہاء اور محدثین نے سنبھالی۔

مسلمانوں کی زندگی میں غیر اسلامی اثرات کی یہ آمیزش صرف ہندوستان ہی میں نظر نہیں آتی جو مرکز اسلام سے ہزاروں میل دور کے فاصلے پر ہے اور جہاں اسلام مختلف علاقوں، رنگ برنگی قوموں اور سخت ترین مراحل سے گزر کر پہونچا تھا اور اسی وجہ سے اس کی اس قوت وتاثیر اور حقیقت واصلیت میں کمزوری پیدا ہو گئی تھی جو اس کا امتیاز تھا، بلکہ خود بعض عرب ملکوں میں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں غیر مسلموں سے اختلاط بڑھنے، عجمیوں کی کثرت سے آمد ورفت ہونے، غیر عرب قوموں کے اسلام قبول کرنے، اپنی عادات واطوار اور رسم ورواج کے بچے کھچے اثرات اپنے ساتھ لانے، مصر وشام میں باطنی واسماعیلی فرقہ کے

اقتدار میں آنے اور آزاد مشرب صوفیا کی غلط تشریح کرنے کی وجہ سے بعض عرب ممالک اور اسلامی سلطنتوں میں بھی مسلمانوں پر بعض باطل افکار و نظریات کا اثر پڑنے لگا تھا اور اقوام و مذاہب غیر کے بعض خیالات بعض حلقوں میں سنائی دینے لگے تھے۔

علامہ ابن تیمیہ کی کتاب "الردُّعلی البکری" اور "الرد علی الاخنائی" کے مطالعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ائمہ و مشائخ اور اولیاء و صلحاء کی تعظیم و تقدیس میں جہلاء کا غلو کہاں تک پہنچ گیا تھا اور ان کی عادات و اطوار میں جہالت کا رنگ کس حد تک نظر آنے لگا تھا۔

زہد و عبادت میں غلو اور بعض شخصیتوں سے حد سے بڑھی ہوئی عقیدت و تقدیس کے اثرات بعض اسلامی ممالک میں آج بھی پائے جاتے ہیں اور ان اثرات کا ازالہ وہی دعوت و تحریک کر سکتی ہے جو حکیمانہ بھی ہو اور جرأت مندانہ بھی۔

مجدد الف ثانی امام احمد بن عبد الاحد سر ہندیؒ (۹۷۱ھ ۱۰۳۴ھ)

مجدد الف ثانیؒ نے بدعات و توہمات پر جنھوں نے ایک مستقل شریعت کی شکل اختیار کر لی تھی، سخت نکیر فرمائی، انہوں نے مشرکانہ اعمال اور جاہلی طور طریقوں اور روایات کی کھل کر مخالفت کی، "بدعت حسنہ" کے وجود ہی کا انکار کیا، اور اس کے قابل عمل ہونے کا رد کیا، ہندستان میں اسلام کے اکھڑتے قدموں کو جمانے کی کوشش کی، اکبری عہد کے اسلام مخالف اثرات اور رجحانات کا جرأت و حکمت کے ساتھ مقابلہ کیا اور تجدید دین کے ساتھ ساتھ زندگی میں انقلاب لانے کے لئے وہ حکیمانہ طریقہ اختیار کیا جس کا نتیجہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی شکل میں ظاہر ہوا جنھوں نے عملی، قانونی اور انتظامی حیثیت سے

ہندوستان میں دین وملت کے محافظ کا کردار ادا کیا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادۂ گرامی حضرت خواجہ محمد معصوم کی پیش بینی اور فراست صحیح ثابت ہوئی، جو ان کو اپنے گرامی ناموں میں شہزادۂ دین پناہ" کے لقب سے یاد اور خطاب فرماتے تھے۔

مجدد الف ثانیؒ نے بدعت اور سنت کے فرق کو واضح کیا، مجتہدین کے قیاسات اور متاخرین کے استحسانات اور قرون اولیٰ اور قرون متاخرہ کے عمل وکردار میں فرق وامتیاز ثابت کیا۔

آپ ہمیشہ معروف ومسنون عمل کی تعلیم ودعوت دیتے، منکر پر نکیر کرتے، جلال شاہی سے کبھی مرعوب نہ ہوتے، کلمہ حق کہنے سے کبھی دریغ نہ کرتے، دین کے معاملہ میں کسی ملامت کی پرواہ نہ کرتے، امراء وسلاطین کی آزادانہ گرفت کرتے تھے، دینی امور میں ان کی رہنمائی کرتے تھے، روافض کی صحبت سے ان کو عار دلاتے تھے، دشمنان اسلام کی ان کے دلوں میں نفرت بٹھاتے تھے، اور انکی خیر خواہی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے، (۱) علامہ اقبالؒ نے اپنے ان دو شعروں میں اس تاریخی حقیقت کو صداقت وبلاغت کے ساتھ واضح کیا ہے ۔

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(اقبالؒ)

آپ کی ان دعوتی واصلاحی کوششوں سے ہندوستان میں ایک انقلاب آگیا، اعتقادات کی دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی، ارباب حکومت کی زندگیوں میں تبدیلی آگئی، اور ان کی تبدیلی سے عوام میں دینی رجحان عام ہوا، عقائد کی اصلاح

ہوئی، شرک وبدعت کا زور گھٹا اور ہندوستان میں دین اسلام اپنی اصل اور حقیقی شکل میں پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔

مجدد الف ثانیؒ جب کتاب وسنت اور جمہور اہل سنت کے عقیدہ کے خلاف کوئی صوفیانہ تحقیق یا حال سنتے اور اس کی سند تصوف کی کسی کتاب یا کسی بزرگ کے احوال واقوال سے لائی جاتی تو ان کی دینی غیرت جوش میں اور رگ فاروقی حرکت میں آجاتی، اور ان کے قلم سے حمایت شریعت اور غیرتِ سنت کا طوفان امنڈ پڑتا، کسی تعلق والے نے کسی صوفی یا متکلم شیخ عبد الکبیر یمنی کا ایسا ہی ایک ملفوظ یا تحقیق نقل کی جو اہل سنت کے عقیدہ کے خلاف تھی، تو مجدد الف ثانیؒ اس کی تاب نہ لا سکے اور ان کے قلم سے بے اختیار یہ فقرے نکل گئے۔

> "مخدوما! فقیر کو ایسی باتوں کے سننے کی تاب نہیں، بے اختیار میری رگِ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے اور تاویل وتوجیہہ کا موقع نہیں دیتی، ایسی باتوں کے قائل شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی، ہمیں کلام محمد عربی علیہ وعلی آلہ الصلوۃ والسلام درکار ہے، نہ کہ کلام محی الدین ابن عربی (۲) یا صدر الدین قونوی اور شیخ عبد الرزاق کاشی، ہم کو نص (۳) سے کام ہے نہ کہ فص سے، فتوحات مدینہ نے فتوحات مکیہ (۴) سے مستغنی بنا دیا ہے۔ (۵)

حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ احمد بن عبد الرحیم دہلویؒ (۱۱۱۴ھ۔۱۱۷۶ھ) نے جو شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام سے مشہور ہیں، تجدید واصلاح کے کام کو آگے بڑھایا، ان کا شمار امام غزالیؒ اور

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے درجہ کے حکمائے اسلام میں ہوتا ہے،(٦) انھوں نے ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی زندگی میں پانچ کمزوریوں کی تشخیص کی اور ان کی اصلاح کے لئے یہ تدابیر تجویز کیں۔

شاہ صاحب کا اصلاحی وتجدیدی طریق کار

۱۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو توحید کے مفہوم ہی سے ناآشنا، مشرکانہ رسم ورواج میں مبتلااور باطل افکار و نظریات سے متأثر ہے، لہٰذااس بات کی شدید ضرورت ہے کہ توحید کے صحیح مفہوم کواجاگر کیا جائے اور اسلام کے اصلی خدوخال کو نمایاں کیا جائے، جاہلی عہد کے مشرکین کے اعتقادات اور خدا کی ذات کے بارے میں ان کے تصورات وخیالات کو سامنے لایا جائے تاکہ مشرکانہ اعتقادات اور اسلام کے عقیدۂ توحید کے درمیان فرق واضح ہوسکے۔

۲۔ مسلمانوں کا قرآن کریم اور حدیث نبوی سے براہ راست ربط قائم کیا جائے، علمائے کرام اس خیال سے کہ قرآن کریم کا سمجھنا عام لوگوں کے لئے دشوار ہے، اور اس اندیشہ سے کہ عوام کا قرآن سے براہ راست تعلق پیدا ہو جانا اور اس کو سمجھنے لگنا، ان کی علمی برتری اور روحانی قیادت کے لیے خطرناک ہے، وہ ہمیشہ قرآن کریم اور طبقۂ عوام کے درمیان حائل رہے، انھوں نے عوام کو اس بات کا کبھی موقعہ نہیں دیا کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے خود قرآن کریم کا مطالعہ کر سکیں اور اس کے معانی ومفاہیم کو سمجھ سکیں، چنانچہ انھوں نے نہ تو ملکی زبان میں نہ علاقائی زبانوں میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، اور نہ کتب احادیث کو رواج دیا، جسکی وجہ سے عوام کا قرآن کریم اور حدیث شریف سے رشتہ نہیں جڑ سکا، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کریم کے معانی اور مضامین ملکی اور عوامی زبان میں منتقل کئے جائیں اور کتب

احادیث کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے تاکہ عوام براہ راست قرآن وحدیث سے مستفید ہو سکیں۔

۳۔ ہندوستانی علماء کی دینی علوم وفنون اور خاص طور پر علم حدیث سے واقفیت بہت محدود تھی اور یہ وہ کمی تھی جس کی وجہ سے عقیدہ کی اصلاح میں بڑی دشواری پیش آرہی تھی چنانچہ شاہ صاحب نے صحاح اور مؤطا کا گہرا مطالعہ کیا اور کتبِ حدیث کی تعلیم اور اس کی اشاعت کا نظم کیا، یہاں تک کہ ہندوستان کو اسی خاندان کے افراد کی کوششوں سے علم حدیث کے درس وتدریس اور اشاعت وترویج میں دنیائے اسلام میں ایک بلند ونمایاں مقام حاصل ہو گیا۔

۴۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی فراست ایمانی سے یہ محسوس کیا کہ عنقریب عالم اسلام میں وہ دور آنے والا ہے جو عقلی ہوگا اور ایسا انقلاب رونما ہونے والا ہے جو فکری ہوگا جس کے لئے اسلامی تعلیمات اور اسلامی طریق کار کی افادیت وضرورت اور شریعت اسلامیہ اور تعلیمات نبویہ کی مربوط ومؤثر تشریح نیز خلافت اسلامیہ کے اصول وضوابط کی تعیین، اس کے ڈھانچہ کی تشریح، اور انسانی معاشرہ کی تشکیل میں اسلامی طریق کار کی افادیت وضرورت کی وضاحت ناگزیر ہے، چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے "حجة الله البالغه" اور "ازالة الخلفا عن خلافة الخلفاء" جیسی دو معرکۃ الآراء کتابیں لکھیں، جن کی مثال اسلامی ذخیرۂ کتب اور دوسرے ممالک کی بلند پایہ علمی تصنیفات وتحقیقات میں بھی ملنی مشکل ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کے شاہی گھرانہ میں زندگی کی کوئی علامت اب پائی نہیں جاتی اور تیموری خاندان کے نوجوانوں میں بیداری کی کوئی امید اب نظر نہیں آتی اور جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے کہا ہے جب

کسی حکومت پر بوڑھاپا طاری ہو جاتا ہے تو وہ جاتا نہیں۔ تو ایسی صورت میں اس میں نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا، اس کو طاقت پہنچانے کے لئے جد و جہد کرنا، اس پر طاری اضمحلال دور کرنے کے لئے اپنی توانائی صرف کرنا بے سود ہے، چنانچہ اس سعی لا حاصل کے بجائے ایسی جماعت تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، جو اسلامی انقلاب لانے میں معاون ہو، اور ایک ایسی اسلامی حکومت کے قیام پر اپنی صلاحیتیں صرف کرنی چاہئیں جو خالص دینی اور علمی بنیادوں پر قائم ہو۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ان کے صاحبزادگان اور ان سے تعلق رکھنے والے دوسرے علماء نے جہاں ایک طرف تجدید و اصلاح کے اس اہم فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دیا وہیں دوسری طرف انھوں نے دین کے بنیادی علوم کی اشاعت، اور دین کے اسرار و رموز کی وضاحت کی اور ایسی کتابیں تصنیف کیں جنھوں نے صرف یہ کہ اسلام کا صحیح اور جامع تصور پیش کیا بلکہ اسلامی انقلاب لانے اور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے ذہن کو تیار کیا۔

ان حکیمانہ مساعی کے نتائج

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آدم گری، مردم سازی اور روحانی تزکیہ و تربیت کا جو کارنامہ انجام دیا اسی کا نتیجہ تھا کہ ایسے مردانِ کار تیار ہوئے جو اعلائے کلمۃ اللہ، مردہ سنتوں کے احیاء، حمایت شریعت اور محو بدعت کا عظیم الشان کام انجام دینے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد ان کے صاحبزادۂ گرامی شاہ عبد العزیزؒ نے روحانی، علمی اور دینی قیادت کی ذمہ داری سنبھالی، انھوں نے تدریسی مشغولیت وانہماک کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام کیا، اور شاگردوں کی ایسی جماعت چھوڑی جنھوں نے علم حدیث کو عام کیا، دین کی حمایت

و تائید اور بدعت کی مخالفت و تردید کا فرض انجام دیا، قرآن و حدیث پر عمل کرنے کی اعلانیہ دعوت دی، تزکیۂ نفس، تطہیر قلب کے لئے جدو جہد کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدارس آباد ہوئے، حدیث کا علم گھر گھر پہنچا، شریعت کو بالادستی حاصل ہوئی، اور دین کی حمایت و نصرت کے لئے دلوں میں جوش وولولہ پیدا ہوا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کوشش اور جدو جہد کو صرف دعوتی اور علمی کاموں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ ہندؤوں سے صدیوں پرانے تعلقات کے اثر سے مسلم معاشرہ میں جو غیر اسلامی شعار ورسوم وعادات داخل ہوگئے تھے، آپ نے ان پر کھل کر تنقید کی اور کتاب و سنت سے عدم اشتغال، علم حدیث سے ناواقفیت، علماء کی کوتاہ اندیشی، دینی معاملات میں ان کی تساہلی اور مسلم حکمرانوں میں احساس ذمہ داری کے فقدان اور دینی شعور کی کمی کی وجہ سے، معاشرہ میں جو اخلاقی و اعتقادی بگاڑ آگیا تھا اس کے ازالہ کی بھرپور کوشش کی۔

شاہ عبد العزیزؒ نے ان مشرکانہ عقائد، باطل افکار و نظریات، جاہلی خرافات و توہمات اور غیر مسلموں کی تقلید واتباع کے سلسلہ میں سخت رویہ اپنایا، جبکہ اس دور کے علماء جو علوم عقلیہ اور فنون حکمیہ میں اپنی ذہانتیں صرف کررہے تھے، عوام کی مخالفت کے ڈر یا مشکلات مین پھنسنے کے اندیشہ سے ان جاہلی رسم ورواج کی تنقید و تردید سے چشم پوشی برت رہے تھے،

حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱ھ ۱۲۴۶ھ)

تیرہویں صدی کے ابتدائی پچیس سالہ دور میں سید احمد شہیدؒ نے (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ) جو شاہ عبد العزیزؒ کے فیض یافتہ تھے اپنے رفیق خاص شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا اور اپنے انفاس قدسیہ سے

سر د دلوں کو گرم اور تاریک دماغوں کو منور کیا۔

آپ نے توحید خالص کی دعوت دی، اتباع سنت پر زور دیا، شرک وبدعت کے خلاف اعلان جنگ کیا، ایمان و احتساب اور زہدو تقویٰ کی زندگی گزارنے کی تلقین کی، اور ملت اسلامیہ ہندیہ مین دین کی ایسی روح پھونکی اور راہ خدا میں جان ومال قربان کر دینے کا ایسا جذبہ پیدا کیا جس کی مثال صدیوں کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

سید احمد شہیدؒ نے ہندوستان کے طول وعرض میں دعوتی اسفار کئے، لاکھوں مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی، شراب خانے آپ کی کوششوں سے ویران اور مساجد آپ کی مساعی سے آباد ہوئیں، شرک وبدعت کے اڈوں میں خاک اڑنے لگی اور نامور و سر کردہ علماء پروانہ وار آپ کے زیر سایہ آنے لگے۔

۱۲۳۶ھ میں آپ حج کے ارادہ سے نکلے، جس کے بارے میں (بعض علماء کے اس اجتہاد وفتوے کی وجہ سے کہ سمندر کے حائل ہونے کی وجہ سے حج ہندوستانی مسلمانوں پر فرض نہیں ہے) اس کے معطل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، (۷) سات سو افراد آپ کے ساتھ تھے، جدھر سے آپ کا گزر ہوتا انسانوں کا ایک سیلاب امنڈ کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا اور معاصی ومنکرات، رسومِ قبیحہ اور عقائد فاسدہ سے توبہ کر کے پاکیزہ شرعی زندگی کا آغاز کرتا، حتیٰ کہ اسپتالوں میں مریضوں نے دعوت دے کر توبہ وبیعت کی، مختلف طبقوں کے لوگ پروانوں کی طرح آپ پر گرنے لگے، ہزاروں بت پرست اس موقعہ پر آپ کے ہاتھ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

آپ کے مواعظ کی برکت، لوگوں کے اسلام قبول کرنے کے اثرات اور

شریعت کے آگے سر تسلیم خم کردینے کے نتیجہ میں کلکتہ جیسے شہر میں (جو انگریزی سلطنت کا ابتدائی مرکز تھا) شراب کا کاروبار ٹھپ ہو گیا، قمار خانوں میں سناٹا چھا گیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ شراب بیچنے والوں نے گاہک نہ ملنے کی وجہ سے حکومت کو شراب کا ٹیکس ادا کرنے سے انکار کردیا، سید احمد شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ سے اعتقادی، علمی، دینی، روحانی اور اخلاقی حیثیت سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد شمار کرنا آسمان کے تاروں کو گننے کے مرادف ہے، البتہ جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو محتاط اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد ۳۰ لاکھ سے متجاوز ہے، اور جن لوگوں کو آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ان کی تعداد ۴۰ ہزار سے زائد ہے۔ (۸)

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۴۶ھ)

جہاں تک شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں شیخ بن یحییٰ ترہتی نے اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں یہ تحریر فرمایا ہے

"شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ دین کے معاملہ میں نہایت سخت تھے، سنت کی تلقین کرنے والے، اس کی پامالی پر غصّہ کا اظہار کرنے والے، بدعت کی شناعت بیان کرنے والے اور مبتدعین پر کھلی تنقید کرنے والے تھے"۔

امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں صاحب قنوجی (م ۱۳۰۷ھ) نے اپنی مشہور کتاب "الحطة بذکر الصحاح الستة" میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، (۹) "شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پوتے مولوی محمد اسماعیل شہیدؒ نے قول و عمل میں اپنے دادا کی اتباع کی، دادا نے جس کام کا آغاز کیا تھا پوتے نے اس کی تکمیل کی، جو حقوق ان پر عائد ہوتے تھے انھوں نے وہ

ادا کئے، البتہ ان کے حقوق دوسروں سے ابھی تک ادا نہ ہو سکے، اللہ تعالیٰ ان کے صالح اعمال اور فیصلہ کن اقوال قبول فرمائے اور ان کو اس پر پورا اجر وثواب عطا فرمائے، انھوں نے جیسا کہ بعض جہلاء کا خیال ہے۔ اسلام میں کوئی نیا طریقہ ایجاد نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ما كان لبشرٍ ان يو تيه الله الكتاب والحكم والنبوة ثم يقول للناس كونوا عبادالي من دون الله ولكن كونوا ربٰنيين بما كنتم تعلمون الكتٰب وبما كنتم تدرسون (سوره آل عمران آیت۔ ۷۹). ترجمہ: کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکمت اور پیغمبری پھر وہ کہے لوگوں کو کہ تم میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر لیکن یوں کہے تم اللہ والے ہو جاؤ جیسے کہ تم سکھلاتے کتاب اور جیسے کہ تم بھی پڑھتے تھے اسے۔

آپ نے متعدد مردہ سنتوں کو زندہ کیا، شرک وبدعت کی بیخ کنی کی اور غیر اسلامی رسم ورواج پر روک لگائی، یہاں تک کہ راہ خدا میں اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کر دیا۔

جہاں تک آپ کی شہرۂ آفاق کتاب "تقوية الايمان" کا تعلق ہے تو وہ عقیدۂ توحید کا رمز اور حق صریح کا شعار بن گئی اور اس کتاب سے ہندوستانی مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد نے فائدہ اٹھایا جس کا شمار نہیں کیا جا سکتا، بلاشبہ وہ لاکھوں سے متجاوز ہے، یہ کتاب اس شخص کے موئے قلم سے نکلی جس کا دل مسلمانوں کے حالات، ان کی زندگیوں میں بت پرستی کے اثرات اور ان کے گھروں میں جاہلی رسم ورواج کے مظاہر دیکھ کر زخمی تھا، اور اس کتاب کی قوت تاثیر اس وقت دوبالا ہو گئی جب اس میں اسلامی حکومت کی تاسیس اور شریعت اسلامی کی تنفیذ

کے لئے میدانِ کارزار میں جو خون بہا تھا اور خلوت و تنہائی میں آنسوؤں کا جو سیلاب رواں ہوا تھا وہ بھی شامل ہو گئے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی جامعیت تھی ان کے یہاں عبادت بھی تھی اور حمیت بھی، تلوار بھی تھی اور مصحف بھی، حکمت بھی تھی اور خودداری بھی، میدان جہاد میں ان کے ہاتھ میں تلوار چمکتی تھی اور رات کی تاریکی میں تسبیح کے دانے حرکت میں آتے تھے، دن میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے اور رات میں خدا کے حضور گریہ وزاری کرتے نظر آتے، حق کی ہمیشہ بات کی اور راہ حق میں ہی شہادت پائی، اور یہی سب سے بڑی سچائی، پوری وفاداری، کامل اخلاص اور توحید کا لب لباب ہے۔

من المومنين رجال صدقوا ماعاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا (سورۂ الاحزاب آیت ۲۳).

ترجمہ: ایمان والوں میں کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے، پھر کوئی تو ان میں پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہے ان میں جو انتظار میں ہے اور انھوں نے کچھ تبدیلی نہیں کی۔

اس کتاب میں وہ اثر اندازی اور سحر انگیزی ہے جو امت کے منتخب اکابر کی تصنیفات میں ملتی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ اس میں صراحت کے ساتھ توحید کے مسائل سے بحث کی گئی ہے، قلبی امراض کی تشخیص کی گئی ہے، شرک کے مظاہر کی تعیین کی گئی ہے، رستے زخم پر انگلی رکھی گئی ہے اور اس دور میں مسلمانوں کی بد عقیدگی، زہد و عبادت میں غلو اور اولیاء و صلحاء کی حد سے بڑھی ہوئی تقدیس پر پرزور الفاظ میں نکیر کی ہے۔

اس زمانہ میں لوگوں کا مزاج بن گیا ہے کہ وہ ان تقاریر کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے جو عمومی ہوتی ہیں اور ان مضامین کو چنداں اہمیت نہیں دیتے جو اجمالی طور پر توحید و شرک سے بحث کرتے ہیں، کیوں کہ جب تک صراحت کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے بات نہیں کی جاتی، ان میں پائے جانے والے امراض کی نشان دہی نہیں کی جاتی، ان سے سرزد ہونے والے مشرکانہ افعال پر ان کی سرزنش نہیں کی جاتی، اور ان اشخاص اور مقامات کی تعیین نہیں ہوتی جن کے بارے میں وہ غلو میں مبتلا ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ واعظ نے جو کچھ کہا وہ دوسروں سے کہا، اور مصنف نے جو کچھ لکھا وہ دوسروں کے لئے لکھا، لیکن جب یہی واعظ اور مصلح ان کی زندگیوں میں پائے جانے والے امراض پر زبان کھولتا ہے اور وہ مضمون نگار ان کے اندر پلنے والے شرک کو باہر لانے کے لئے موئے قلم کو حرکت دیتا ہے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، انتقام کی آگ سے ان کا سینہ جھلنے لگتا ہے اور اسی حق بیانی اور صاف گوئی پر اس واعظ و مصنف کو بڑا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ داعی جس پر فکر آخرت کا غلبہ ہو، اپنے عمل میں اخلاص اور اللہ کی قدرت پر اعتماد ہو، دعوت واصلاح کے جذبہ سے اس کا دل سرشار ہو، انبیاء کرام کے دعوتی اسلوب سے واقف اور آشنا ہو، وہ اس صورت حال سے کبھی نہیں گھبراتا بلکہ وہ اس صورت حال کا خود اپنے لئے انتخاب کرتا ہے اور اس طرح وہ قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کرتا، اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرتا، اپنی دعوتی واصلاحی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا اور اپنے ضمیر کی تسکین اور دل کی راحت کا سامان کرتا ہے۔

کتاب وسنت کی تعلیم اور عمل بالحدیث کے دو حلقۂ درس

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تلامذہ، صاحبزادگان اور احفاد واسباط کے بدعات

کے خلاف آواز اٹھانے، علاقائی مشرکانہ رسم ورواج کے خلاف برسر پیکار ہونے، علم حدیث کے فروغ کو اپنا مشن بنالینے کی وجہ سے دعوت الی اللہ کی تحریک میں قوت پیدا ہوگئی، اور بدعات کے خلاف جاری مہم زور پکڑ گئی. سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے اسلاف کے اس مشن کو آگے بڑھایا اور دعوت واصلاح کے کام کا دائرہ اور وسیع کیا، ان حضرات کی کوششوں سے دین کا کام کرنے والوں کی ہمتیں بلند ہوئیں، دل ودماغ میں نشاط پیدا ہوا، اور قرآن وحدیث سے اشتغال رکھنے والوں اور دینی موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کی ایک جماعت حق تیار ہوگئی۔

اس جماعت کے سرگرم عمل ہونے سے حدیث نبویؐ کی خدمت کے لئے دو مدرسے وجود میں آئے، پہلا مدرسہ "مدرسہ صادق پور السلفیہ" جس کے روح رواں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفۂ اجل، عالم ربانی مولانا ولایت علی عظیم آبادی تھے اور دوسرا مدرسہ مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے مولانا نذیر حسین دہلوی کے درس حدیث میں شریک ہوکر ان سے حدیث کی سند حاصل کی، انکے سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔(۱۰)

> اللہ تعالیٰ نے ان کو طویل عمر عطا فرمائی، اور ان کے علم سے عرب وعجم سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، تقویٰ، دیانت، زہد، علم وعمل، ہندوستان میں تدریس حدیث کے میدان میں ان کو ایک امتیاز واعزاز حاصل ہوا، اسی کے ساتھ وہ قناعت، توکل، استغناء، صدق گفتاری، حق بیانی اور حب

رسول میں بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، مخالف مسلک پر سخت نکیر کرنے والے، متواضع اور بردبار، پر مذاق وبامزاح، بلند ہمت اور جرأت مند انسان تھے۔(۱۱)

دینی دعوت وتربیت اور علوم دینیہ کی تدریس واشاعت کے چند اہم مراکز

ایک طرف اصلاح وتجدید اور دعوت وتبلیغ کی کوششوں کا یہ سلسلہ جاری تھا اور دوسری طرف شرک وبدعت پر اکسانے والے بھی اپنے اپنے میدانوں میں سرگرم عمل تھے، وہ گاؤں گاؤں گھومتے، جاہلیت کا نعرہ لگاتے، حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دیتے، علمائے حق کو گمراہ گردانتے، مجددین ومصلحین پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے اور اس کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے۔

یہ صورت حال دیکھ کر علماء ربانی کے دلوں میں ملک میں دین کے مستقبل اور ملت اسلامیہ کے شریعت سے ربط وتعلق کے سلسلہ میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے، ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال، اکثریت کی حکومت کے قیام کے بعد اسلام کا مستقبل اور زیادہ خطرہ میں نظر آنے لگا، انھیں محسوس ہوا کہ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد اب کوئی طاقت نہیں جو دین وشریعت کی حمایت اور ملت کی حفاظت کر سکے، کوئی منصب، کوئی عہدہ اور وسائل نہیں جو لوگوں پر اثر انداز ہو سکیں، ان کے پاس اگر کوئی سرمایہ ہے تو وہ دین کا سرمایہ ہے، اگر کوئی زادراہ ہے، اگر کوئی سہارا ہے تو وہ توکل کا سہارا ہے اگر کوئی ہتھیار ہے تو وہ اخلاص کا ہتھیار ہے، چنانچہ وہ اسی دین، علم، توکل اور اخلاص کے سہارے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے طے کیا کہ دین کی حفاظت کے لئے ایسے قلعے تعمیر کریں گے، جہاں

دین محفوظ رہ سکے، اور شریعت جہاں پناہ پا سکے۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم اور ان کی دینی خدمات

دینی علوم کی بقاء اور شریعت اسلامی کے تحفظ کے لئے علماء کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا جائے اور مکاتب کا جال ہندوستان کے چپہ چپہ میں پھیلا دیا جائے، چنانچہ انھوں نے اسلامی تشخص کی حفاظت اور مغربی تہذیب وتمدن کے امنڈتے سیلاب اور ہلاکت خیز طوفان کو روکنے اور علماء، صلحاء اور واعظین کی ایسی جماعت تیار کرنے کے لئے جو اسلام پر کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کر سکے اور اسلامی تشخص اور دین کے تحفظ کی ضمانت لے سکے مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کیا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ) نے دارالعلوم دیوبند (جس کی بنیاد ۱۲۸۳ھ میں پڑی تھی) کی سرپرستی اور رہنمائی قبول فرمائی، اسی سال شیخ سعادت علی نے سہارن پور میں مظاہر العلوم کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، اس کے بعد ہندوستان میں مدارس کا ایک سلسلہ چل پڑا اور ہندوستان کے ہر علاقہ میں کوئی نہ کوئی مدرسہ وجود میں آتا رہا، اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دینی تعلیم کو عام کرنے، اسلامی ثقافت کو نمایاں کرنے، شرک وبدعت کا زور توڑنے، امت مسلمہ میں دین کی روح پھونکنے اور دلوں میں جہاد وسرفروشی کا جذبہ پیدا کرنے میں ان مدارس کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

ان مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء نے نہ صرف یہ کہ عقیدہ کی اصلاح کا کام کیا اور اہل بدعت وضلال سے مناظرہ کر کے ان کو راہ فرار اختیار کرنے

پر مجبور کیا، بلکہ ہندستان کی جنگ آزادی میں کارہائے نمایاں انجام دینے اور وطن کے دفاع اور ملکی سیاست میں قائدانہ رول ادا کرنے اور ظالم وجابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جسارت کرنے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

دارالعلوم دیوبند نے کچھ ردوبدل کے ساتھ درس نظامی کو جس کی نسبت علامہ نظام الدین انصاری فرنگی محلی (م ۱۱۶۱ھ) کی طرف کی جاتی ہے، اور جس میں فلسفہ، منطق، اصول فقہ اور علم کلام کی خاص رعایت رکھی گئی ہے، بحیثیت نصاب تعلیم اختیار کیا، لیکن جس علم کی طرف دارالعلوم دیوبند نے سب سے زیادہ توجہ کی، وہ علم "**علم حدیث**" ہے، حدیث نبوی کی تعلیم دینے اور پورے ادب واحترام اور گہرائی وگیرائی کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کرنے، اس سے فقہی استدلال کرنے اور مذہب حنفی کو اس سے ثابت کرنے میں دارالعلوم کو امتیازی شان حاصل ہے۔

علم حدیث میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور وہاں کے اساتذہ کے علم وفن کا اعتراف شیخ محمد عبدہ کے شہرۂ آفاق شاگرد اور اپنے وقت کے نامور خطیب وعالم علامہ سید رشید رضا مصری صاحب مجلۃ "**المنار**" نے خود اپنے ہندوستان کے دورہ کے موقع پر کیا ہے، (۱۲) ہندوستان کے اس سفر میں جب وہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور وہاں کا روح پرور منظر دیکھا تو بے ساختہ ان کی زبان سے یہ نکلا "اگر میں نے یہ ادارہ نہ دیکھا ہوتا تو میں ہندوستان سے ناکام ونامراد واپس جاتا" اور جب دارالعلوم کے استاد حدیث علامہ انور شاہ کشمیری کے حلقۂ درس میں انھیں شرکت کا موقع ملا تو وہ یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ "اس جیسا عالم میں نے کبھی نہیں دیکھا" انھوں نے "مفتاح کنوز السنۃ" کے اپنے مقدمہ میں تحریر

فرمایا کہ "اگر ہندوستانی علماء نے اس زمانہ میں علم حدیث سے اشتغال پیدا نہ کیا ہوتا تو یہ علم مشرق سے ناپید ہو جاتا، مصر و شام اور عراق و حجاز میں دسویں صدی ہجری سے اس علم میں انحطاط شروع ہو گیا تھا اور چودہویں صدی ہجری میں یہ انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا"۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

عالم ربانی مولانا محمد قاسم صدیقی نانوتوی ۱۲۴۸ھ نانوتہ میں پیدا ہوئے، حدیث شریف کی تعلیم شاہ عبد الغنی بن شاہ ابو سعید دہلوی سے حاصل کی اور ایک عرصہ تک ان کی صحبت و تربیت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ زہد و تقویٰ، ذکر و مراقبہ میں اپنے عصر میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۳ھ کے ہنگامہ رست خیز میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا الزام آپ پر عائد کیا گیا، جس کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے روپوش ہونے پر مجبور ہوئے، روپوشی ختم ہونے کے بعد دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈال کر شہرت حاصل کی، عیسائیوں، پادریوں اور ہندو مناظرہ کرنے والوں سے کئی مرتبہ آپ کا مقابلہ ہوا اور ہر مرتبہ آپ نے ان کو شکست سے دوچار کیا، عقائد، دینی احکام اور علم کلام سے متعلق کئی اہم کتابیں آپ نے تصنیف کیں جو اسرار و رموز اور باریک لطائف و اشارات پر مشتمل تھیں، ہندوستان میں قدیم طرز پر دینی و اصلاحی بیداری پیدا کرنے میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں آپ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ۱۲۹۷ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تعارف میں ہم یہاں وہ عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو تذکرۂ علمائے ہند کی شاہکار کتاب "نزہۃ الخواطر" سے ماخوذ ہے، جو اعتدال و توازن، عدل وانصاف اور حقیقت بیانی میں سیرت وسوانح پر لکھی گئی کتابوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

"اتباع شریعت، پیروی سنت اور سلوک و معرفت میں بڑے بلند مرتبہ کے مالک اور بڑی خصوصیات کے حامل تھے، بدعت کی مخالفت، شعائر اسلام کا احترام، سنت کی ترغیب، حکم شرعی کی تلقین اور عزیمت پر عمل کرنے میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، حق کے معاملہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے، منکرات پر کبھی خاموش نہ رہتے، دین کے مسئلہ میں ادنیٰ تحریف برداشت نہ کرتے، شریعت کے معاملہ میں مداہنت کبھی گوارہ نہ کرتے۔

تواضع ان کی فطرت، حق ان کی علامت اور نرمی ان کا خاصہ تھی، صحیح بات معلوم ہونے پر اپنی رائے واپس لینے میں انھیں کوئی بار محسوس نہ ہوتا تھا، علم وعمل، تعلیم وتربیت، تزکیہ نفس، احیاءِ سنت اور محوِ بدعت میں وہ ہمیشہ آگے رہتے تھے" (۱۳)

۹ر جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ (مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۸ء) کو وفات ہوئی۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

دار العلوم دیوبند کے سرپرستوں اور اس سے انتساب رکھنے والے علماء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی امتیازی مقام رکھتے ہیں، ان کے تذکرے اور تعارف میں ہم "**نزہۃ الخواطر**" ہی کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔

"آپ ہندوستان کے نامور عالم اور عظیم مصلح تھے، تعلیم و تربیت ارشاد و توجیہ، تزکیہ نفس اور اصلاح احوال میں آپ مرجع خلائق تھے، لوگ اپنے مسائل لے کر آپ کے یہاں حاضر ہوتے اور آپ کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہو کر واپس جاتے، دلوں کا روگ اور باطنی امراض لے کر آپکے حکیمانہ ارشادات سے شفایاب ہو کر اپنے گھروں کو لوٹتے، ہزار ہا انسانوں کو آپ کے پند و نصائح، مواعظ و مجالس اور کتب و رسائل سے سنت کی پیروی اور شریعت کی اتباع کی توفیق ملی، اور جاہلی عادات، مشرکانہ اعتقادات اور غیر اسلامی رسم و رواج سے جو ہندوؤں سے قدیمی روابط کی بنا پر مسلم معاشرہ میں سرایت کر گئے تھے، اور غم و مسرت کے مواقع پر ان کے مظاہر کثرت سے دیکھنے میں آتے تھے، نجات حاصل ہوئی۔

آپ نے تصوف و طریقت کو عام فہم اور آسان زبان میں پیش کیا، زندگی پر اس کی تطبیق کی اور مقاصد اور وسائل کا فرق واضح کیا، آپ کے چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم و مختصر تصانیف کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچتی ہے، ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ میں

آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مصلح امت، محدث جلیل مولانا حسین احمد مدنی بن حبیب اللہؒ ۱۹ شعبان ۱۲۹۶ھ میں اناؤ کے جوار میں "بانگر مئو" نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ٹانڈہ میں حاصل کر کے دیوبند تشریف لے گئے، سات سال وہاں قیام کیا اور سند فراغت حاصل کی، حدیث کا درس آپ نے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے لیا، اور ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہے، پھر مدینہ منورہ گئے اور صدق و اخلاص، توکل و قناعت، زہد و تقشف کے ساتھ وہاں کچھ عرصہ گزارا، پھر ہندوستان تشریف لائے اور کچھ ہی مدت کے بعد ۱۳۲۰ھ میں پھر حجاز مقدس روانہ ہو گئے۔

مدینہ منورہ میں آپ نے رضاکارانہ طور پر حدیث نبویؐ کی تعلیم دی، اور حدیث نبوی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کو وہاں تفسیر و فقہ کی تدریس کی سعادت حاصل ہوئی، ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کی پوری مدت آپ نے مالٹا میں جلاوطنی میں گزاری، اور صبر و استقامت کی ایک مثال قائم کی۔

علامہ انور شاہ کشمیری کے دارالعلوم چھوڑنے اور ڈابھیل منتقل ہو جانے کے بعد آپ صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے، اور دارالعلوم میں شیخ الحدیث کے منصب کے لئے بھی آپ ہی کا انتخاب عمل میں آیا، تدریسی خدمات کے ساتھ آپ صدر مدرسی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، آپ نے دارالعلوم کی شہرت اور مرکزیت کو برقرار رکھا اور اس پر مسلمانوں کے اعتماد میں اضافہ کیا، حدیث کی تعلیم دینے، جہاد و سرفروشی کا جذبہ پیدا کرنے اور غیرت و خودداری کی روح

مسلمانوں میں پھونکنے کے لئے آپ ہمیشہ سر گرداں رہے، اپنی قوت ارادی، بلند ہمتی اور اولوالعزمی سے آپ تعلیمی وسیاسی دونوں میدانوں میں سرگرم عمل رہے۔

۸ رجمادی الآخری ۱۳۶۱ھ میں آپ کو گرفتار کیا گیا، تین سال آپ نے قید وبند میں گزارے، قید خانہ میں آپ کو طرح طرح کی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن صبر کا دامن آپ نے کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور اجر وثواب کی امید اور رضائے الہی کی خاطر یہ سب ہنسی خوشی برداشت کیا۔

قید خانہ میں آپ قیدیوں میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے اور اوراد واذکار میں اپنا وقت صرف کرتے، یہاں تک کہ آپ کی رہائی عمل میں آئی، قید خانہ سے نکلنے کے بعد تعلیم وتدریس، ارشاد و توجیہ اور جہاد وسر فروشی کی زندگی کا پھر سے آغاز کیا، ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا، اور تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا اور اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہندوستان کے شہر تو شہر دیہات تک میں خوں ریز واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور دینی تعلیمی مراکز پر نہ صرف یہ کہ خطرات کے بادل منڈلانے لگے بلکہ ان کا وجود تک خطرہ میں نظر آنے لگا تو مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مسلم عوام کی ہمت وحوصلہ بلند رکھنے کے لئے اور صبر واستقامت پر عمل کرنے کے لئے عوام کے سامنے آئے اور اپنے دینی مواعظ کے ذریعہ مسلمانوں کو دینی ذمہ داری سے آگاہ کیا، آپ ہی کے مواعظ وارشادات سے لوگوں کے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا ہوئی، خدا کی قدرت پر اعتماد حال ہوا، دین پر فخر کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، لڑکھڑاتے قدموں کو ثبات حاصل ہوا، دلوں پر چھایا خوف وہراس دور ہوا، دینی تعلیمی مراکز کو

ایک نئی زندگی ملی، اور مسلمانوں کو پورے اعتماد ووثوق کے ساتھ اس ملک میں اپنی دینی ودعوتی کوششوں کو جاری رکھنے کا حوصلہ ملا۔

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ملک کی آزادی کے بعد سیاست سے عملی طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی، اور تعلیم وتدریس، دعوت و تبلیغ اور تربیت وتزکیہ کو اپنی کوششوں کا محور بنالیا، ارباب حکومت سے آپ نے کوئی تعلق نہیں رکھا، حتی کہ صدر جمہوریہ کی طرف سے دیا جانے والا اعزاز بھی قبول کرنے سے معذرت کردی، آپ حدیث شریف کا درس دیتے اور ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے، جس میں لوگوں کو دین کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے، سنت کی پیروی کرنے، شریعت کے احکام پر عمل کرنے اور اپنے لئے صحابہ کرام کی حیات طیبہ کو نمونہ بنانے کی تلقین کرتے تھے۔

۱۳ ارجمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷ء میں آپ نے وفات پائی، عمر کے آخری دور میں آپ پر سنت نبویؐ اور غیرت دینی کا ایسا غلبہ ہوگیا تھا کہ سنت کی ادنیٰ مخالفت اور دینی امور میں ذرا بھی غفلت برداشت نہیں کرسکتے تھے، اور شعائر اسلام کی بے حرمتی واہانت کرنے والے کی سخت نکیر فرماتے تھے۔

مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کے ان چیدہ علماء، نامور فقہاء، اور محدثین عظام میں مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کا بھی نام نامی قابل ذکر ہے، آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۶۹ھ میں ہوئی، دینیات کی تعلیم آپ نے اپنے ماموں مولانا یعقوب بن مملوک علی نانوتوی اور شیخ مظہر نانوتوی اور دوسرے ممتاز علماء وفضلاء سے دارالعلوم دیوبند اور

مظاہر العلوم سہارنپور میں حاصل کی، زبان وادب کے لیے آپ نے لاہور کا سفر کیا، اور ادیب کبیر مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، تعلیم سے فراغت کے بعد مظاہر العلوم میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور ۱۳۰۸ھ میں دار العلوم دیوبند میں بحیثیت استاد آپ کا انتخاب عمل میں آیا، دار العلوم دیوبند میں آپ نے چھ سال تدریسی خدمات انجام دیں اور ۱۳۱۴ھ میں آپ مظاہر العلوم منتقل ہوگئے اور صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے، ۳۰ سال سے زائد عرصہ تک آپ نے اس خدمت کو انجام دیا، ۱۳۲۵ھ میں آپ کا مظاہر العلوم کے مہتمم (صدر مدرس) کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور آپ نے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کردی، آپ کی وجہ سے اس مدرسہ کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی، اور دوردراز علاقوں سے طلبہ بغرض تعلیم وہاں پہنچنے لگے، ۱۳۴۲ھ میں آپ ہندوستان چھوڑ کر حرمین شریفین روانہ ہوگئے اور وفات تک وہیں مقیم رہے۔

آپ نے حدیث شریف کا علم پورے اتقان وتدبر کے ساتھ حاصل کیا تھا، اور مولانا مظہر نانوتوی، مولانا عبد القیوم برہانوی، شیخ احمد دحلان (مفتی شافعیہ) شاہ عبد الغنی بن ابو سعید مجددی اور سید احمد برزنجی جیسے بڑے پایہ کے محدثین سے حدیث کی سند حاصل کی، حدیث کی تعلیم وتدریس، مطالعہ وتحقیق اور اس فن میں کتابوں کی تصنیف وتالیف سے آپ کو خاص شغف تھا۔

آپ کی ایک بڑی آرزو یہ تھی کہ آپ سنن ابو داؤد کی شرح لکھیں، چنانچہ آپ نے ۱۳۳۰ھ میں اس مبارک کام کا آغاز کیا، اور آپ کے شاگرد رشید شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے اس مبارک کام میں آپ کا تعاون کیا، مولانا

خلیل احمد سہارن پوری نے اپنی ساری توجہ مواد جمع کرنے، اس کی تنقیح کرنے اور املا کرانے پر مبذول کر رکھی تھی، اس کے علاوہ آپ کو نہ تو کسی کام کا خیال آتا تھا اور نہ کسی کام میں لطف و مزہ، ۱۳۴۴ھ میں حجاز مقدس کے اپنے آخری سفر تک آپ اسی کام میں منہمک رہے۔ نصف محرم الحرام ۱۳۴۵ھ میں آپ نے مدینہ منورہ کی مبارک سرزمین پر قدم رکھا، اور کتاب کی تکمیل میں مشغول ہو گئے شعبان ۱۳۴۵ھ میں آپ اس کام سے فارغ ہوئے، سنن ابوداؤد کی یہ شرح پانچ بڑی جلدوں میں مکمل ہوئی، اور ''**بذل المجهود فی سنن ابی داؤد**'' کے نام سے منظر عام پر آئی، حدیث سے اشتغال رکھنے والوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں اس سے بہت استفادہ کیا، یہ کتاب آپ کے علم و مطالعہ کا نچوڑ اور آپ کے ذوق و شوق کی آئینہ دار ہے، اس کتاب کی تالیف میں آپ نے سخت محنت و جاں فشانی، اور علمی جستجو کی مشقت برداشت کی، اور اس میں اپنی جان کھپائی بالآخر عبادت، تلاوت اور ذکر و مراقبہ میں ہمہ تن مشغول رہ کر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے تحقیق و مطالعہ، تصنیف و تالیف، عبادت و ریاضت میں طاقت سے زیادہ اپنے اوپر بوجھ ڈالا تھا جس کی وجہ سے آپ کے قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اور صحت متاثر رہنے لگی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ ایک بڑی مخلوق کو فائدہ پہنچایا اور آپ کی کوشش و تربیت کے نتیجہ میں علماء و مشائخ اور مصلحین و مرشدین کی ایک جماعت تیار ہو گئی جس کے ہاتھوں ہندوستان میں علوم دینیہ کی اشاعت، عقائد کی تصحیح، معاشرہ کی اصلاح اور دعوت و تبلیغ کا بڑا کام

ہوا۔

ان حضرات میں سب سے نمایاں نام تبلیغی جماعت کے بانی اور ہندوستان کے عظیم مصلح مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کا ہے، دوسرا مشہور نام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا۔

مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ بڑے ذکی الحس اور رقیق الشعور تھے، نرم گفتار تھے لیکن صاف گو تھے، متبعِ سنت اور بدعت سے سخت متنفر تھے، مہمانوں کا اکرام کرتے، ساتھیوں کے ساتھ نرم روی کا معاملہ کرتے، مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرتے، وقت کی پابندی سے خوش ہوتے، افادۂ خلق کے لئے سرگرداں رہتے، آخرت کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی، دینی معاملات میں ہمیشہ اپنا محاسبہ کرتے رہتے، سیاسی امور سے بچتے لیکن مسلمانوں کے معاملات سے کبھی پہلو تہی نہ برتتے، آپ دینی غیرت وحمیت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے، سات مرتبہ حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۴۴ھ میں آپ نے آخری حج فرمایا، ۱۶/ربیع الآخر ۱۳۴۶ھ میں مدینہ منورہ میں داعی اجل کو لبیک کہا،

آپ کے جنازہ میں ایک جم غفیر نے شرکت کی اور تعلق رکھنے والوں نے اچھے خواب دیکھے، اہل بیت کے قبرستان کے قریب آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے لائق ترین شاگردوں میں سب سے نامور ومقبول مظاہر علوم کے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی شخصیت ہے، آپ کی پوری زندگی حدیث کی تعلیم، کتب حدیث کی تحقیق وتشریح اور شارحین وتحقیق

کے پیش کردہ نتائج و مضامین کا تجزیہ کرنے میں گزری، آپ کی ذات ایک مستقل وسرگرم مجلس علمی (اکیڈمی) کے مترادف تھی، آپکی زندگی کا کوئی لمحہ عمل سے خالی نہ تھا، آپ کی طبیعت تدریس حدیث کے علاوہ کسی کام کی طرف راغب نہ تھی، اور تصنیف و تالیف کے سوا کسی چیز میں آپ کے لئے کوئی لذت نہ تھی، کتب حدیث کی جو شروح آپ کے قلم سے نکل کر مقبول خاص و عام ہوئیں، اور حدیث کے اساتذہ اور اس موضوع پر تحقیقی و تصنیفی کام کرنے والوں کے لیے بڑا اسہارا ہئیں وہ درج ذیل ہیں :

۱ اوجز المسالك فی شرح مؤطا الامام مالكؒ

۲ حجة الوداع وعمرات النبی صلی الله علیه وسلم

۳ الخصال النبویة

٤ لامع الدراری فی تقریرات البخاری

٥ الابواب والتراجم للبخاری

یکم شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴ر مئی ۱۹۸۲ء کو مدینہ منورہ میں آپ کی وفات ہوئی اور جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی۔ (۱۴)

بدعتی حلقه اور کفر کا فتویٰ لگانے والوں کا اصل نشانه

دیوبندی حضرات شروع سے بریلویوں کی تکفیر و تضلیل کا نشانہ بنے رہے ہیں، دیوبندی حلقۂ فکر سے نسبت رکھنے والوں کو بریلوی حضرات وہابی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، اپنی مسجدوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیتے ہیں اگر غلطی سے وہ پہنچ بھی جائیں تو نکال کر ہی دم لیتے ہیں، ان کے دینی پروگراموں میں

شرکت کو جرم گردانتے ہیں، خاندانی معاملات میں ان سے تعلق نہ رکھنے کی دعوت دیتے ہیں، اور ان کا سوشل بائی کاٹ کرنے کی تحریک چلاتے ہیں۔

ان مدارس کی کامیابی کا راز

علم دین عام کرنے، دینی ماحول پیدا کرنے، دینی شعور بیدار کرنے اور اسلامی جذبہ سے دلوں کو سرشار کرنے میں دارالعلوم دیوبند و مظاہر العلوم اور اس ملک کے دوسرے مدارس کو جو تعجب خیز کامیابی حاصل ہوئی اس کا راز یہ ہے کہ انھوں نے کبھی حکومت کی مدد اور سرپرستی قبول نہیں کی اور سادگی و قناعت، ایثار و قربانی اور زہد و مجاہدہ کی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر اپنی عمارت تعمیر کی اور اسی پر قائم رہے، اور یہ وہ بنیاد تھی جس نے ان کے اندر قوت عمل اور مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی، اسی کے ساتھ ساتھ طبعی طور پر ان مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے اور اعلیٰ تنخواہیں پانے کی لالچ سے محفوظ رہے، کیوں کہ وہ ان مدارس کی سند رکھتے تھے جن کی سند سرکاری محکموں میں تسلیم شدہ نہیں تھی، چنانچہ ان طلبہ نے سرکاری ملازمتوں سے بے نیاز اور اعلیٰ تنخواہوں سے بے پرواہ ہو کر دین کی دعوت و تبلیغ اور عوام کی فلاح و بہبود کو اپنا میدان عمل بنایا، اس طرح دین کے وہ داعی سامنے آئے جن کا مقصد صرف دین کی دعوت، جن کی آرزو صرف رب کی خوشنودی، اور جن کا نصب العین صرف آخرت کی کامیابی تھا، یہ جو کام کرتے تھے رضاکارانہ کرتے تھے، کفاف پر قانع رہتے تھے، دعوت و تبلیغ کے علاوہ کوئی خیال دل میں نہ لاتے تھے، عوام سے ان کا براہ راست تعلق تھا اور مدارس و مساجد ان کی دعوت و افادہ کا مرکز، انھوں نے اپنے اخلاص کی برکت، ایثار

کی طاقت اور جذبہ کی قوت سے وہ اصلاحی کارنامے انجام دیئے جو بڑے بڑے ادارے تو کجا بڑی بڑی سلطنتیں بھی اپنے جملہ وسائل استعمال کرنے کے بعد بھی انجام نہیں دے سکے۔

انگریزی حکومت کے خلاف تحریک آزادی کی قیادت اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا محمود حسن جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے، ہندوستان کی جنگ آزادی، انگریزی حکومت کے خلاف صف آرائی اور ایک آزاد، منصفانہ اور دستوری حکومت کے قیام کے لیے ایثار وقربانی دینے والوں میں پیش پیش تھے، سلطان ٹیپو کو مستثنیٰ کر کے انگریز دشمنی میں کوئی دوسرا ان کا سہیم وشریک نظر نہیں آتا، وہ خلافت عثمانیہ کے جو اس وقت عالم اسلام کی قیادت کر رہی تھی، اور خلافت کا جھنڈا بلند کئے تھی، پرزور حامی اور بڑے مؤید تھے، آپ نے افغانستان کی حکومت کے ذمہ داروں اور عثمانی سلطنت کے فرماں رواؤں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، ۱۹۱۶ء میں شریف حسین کی حکومت نے مدینہ منورہ میں آپ کو گرفتار کر کے انگریزی حکومت کے حوالہ کردیا، جس نے ۱۹۱۷ء میں ان کو اور ان کے رفقاء اور بعض تلامذہ (مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حکیم نصرت حسین، مولوی سید وحید احمد) کو جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا، ۱۹۲۰ء تک ان حضرات نے مالٹا میں جلاوطنی کی زندگی گزاری، جمعیۃ العلماء کے بانی مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس قومی مسئلہ کے پرجوش داعی اور تحریک

خلافت کے سرگرم رہنما تھے۔

اس انقلاب بلکہ حقیقت میں جنگ آزادی میں جس کو بھرپور عوامی تائید حاصل تھی، اور ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ انگریزی حکومت کے خلاف بر سر پیکار تھے اور ہندوستان کی تاریخ میں ایسا جوش وولولہ، ایسا قومی اتحاد، اتنی پرزور عوامی تائید، اور ہندواور مسلمانوں میں ایسی وحدت واجتماعیت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، مسلمان قائدانہ رول ادا کر رہے تھے، اور انگریزی حکومت کے خلاف عوام کو صف آرا کرنے اور ایک مضبوط مستحکم محاذ کی تشکیل کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔(۱۵)

مشہور انگریز مؤرخ مسٹر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب INDIAN MUSAL-MANS میں ہندوستان کی جنگ آزادی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جہاد کی جو چنگاری سید احمد شہیدؒ نے بھڑکائی تھی وہی چنگاری تھی جو اس جنگ آزادی میں کام کر رہی تھی، اس جنگ آزادی میں قیادت کی باگ ڈور سنبھالنے والے علماء ومشائخ میں سر فہرست مولانا احمد اللہ، مولانا لیاقت علی، جنرل نجیب خاں، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حافظ محمد ضامن شہید نامی ہیں، ان حضرات کے علاوہ بھی علماء ومشائخ کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور اس کے مختلف معرکوں میں شریک ہوئے۔

ندوۃ العلماء

جب علماء نے یہ محسوس کیا کہ عصری تعلیم اور دینی تعلیم کے درمیان خلیج

بڑھتی جارہی ہے، عربی مدارس اور انگریزی اسکولوں سے نکلنے والے طلبہ کے درمیان اجنبیت کی دیوار مسلسل اونچی ہورہی ہے، دونوں حلقے نہ صرف ایک دوسرے سے ناآشنا بلکہ ایک دوسرے سے بیزار نظر آرہے ہیں، اور ایک ملک کے باشندے ہوتے ہوئے بھی دونوں کی زبان الگ، تہذیب جدا اور نفسیات میں نمایاں اختلاف نظر آتا ہے، اور ان کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک اگر زمین کی مخلوق ہے تو دوسرا کسی آسمانی سیارہ کی۔

جب علماء کو اندازہ ہوا کہ اس دور میں دعوت و تبلیغ کے عمل کو تیز کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو زمانہ کے مزاج اور اس زمانہ کے پروردہ افراد کی نفسیات سے قریب تر ہو اور اس تحریک سے منسلک لوگوں کو ان علوم وفنون سے روشناس کرایا جائے جو اس زمانہ میں رائج اور مقبول ہیں تو ندوۃ العلماء کے بانیوں نے جن میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ پیش پیش تھے، ۱۳۱۶ھ میں لکھنؤ میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم صالح اور جدید نافع کو باہم مربوط کیا جائے، عقیدہ و توحید میں مضبوطی اور دین کے اصول و مبادی میں پختگی کے ساتھ جزئی و فروعی مسائل میں توسع اختیار کیا جائے، اس مدرسہ نے ایسے علماء و اہل قلم پیدا کئے جو دونوں ثقافتوں (CULTURES) کے جامع تھے، اور دو مختلف الخیال حلقوں کو یکجا کرنے میں مؤثر رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، دارالعلوم میں شروع سے مختلف فقہی مسالک کے قائل وعامل اور اہل حدیث جماعت اور گھرانوں کے نوجوان بھی تعلیم پاتے تھے، اور بعض نے معلمی کا فرض بھی انجام دیا۔

ندوۃ العلماء نے اپنے مدرسہ کے لئے جو اصول و ضوابط مقرر کیئے، ان میں سب سے زیادہ بنیادی اصول یہ تھا کہ یہ مدرسہ حکومت کی کوئی امداد قبول نہیں کرے گا، اور اس کا دارومدار عوام کی تائید، ان کی مالی امداد، اساتذہ کی قربانی اور ان کے اخلاص وللّٰہیت پر ہوگا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت امتیازی حیثیت کی مالک ہے، عالم اسلام کے چوٹی کے علماء اور اپنے عہد کی چیدہ شخصیتوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے، آپ فکر اسلامی کے ممتاز شارح، تحریک آزادی کے مؤید و معاون، اپنے دور کے بلند پایہ ادیب اور اہل قلم اور ایک نابغۂ روزگار ہستی تھے۔

عربی زبان و ادب میں آپکو امتیازی رسوخ اور اس کا اعلیٰ ذوق حاصل تھا، فن تاریخ پر آپکی ماہرانہ و مجتہدانہ نظر تھی، قرآنی علوم پر اور علم کلام و اجتماعیات میں آپ کی معلومات وسیع اور عمیق تھیں۔

آپ اردو کے صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز تھے، عربی پر پوری قدرت رکھتے تھے، شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے، نفس پر قابو رکھنے والے، مخالفین سے تسامح برتنے والے، سخت سے سخت بات برداشت کرنے والے اور ذاتی معاملات میں صف آرائی سے بچنے والے تھے، ایک عرصہ تک آپ نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی سرپرستی فرمائی، اور آپ کے قلم سے "**خطبات مدراس**" "**سیرتِ**

عائشہ" "**حیات مالک**" "**ارض القرآن**" اور "**عرب و ہند کے تعلقات**" طاقت ور اور مؤثر کتابیں نکلیں، جن کی مثال کسی بھی زبان میں مشکل ہے اس سے بڑھ کر "**سیرت النبی**" اس شہرۂ آفاق سلسلہ (جس کا آغاز ان کے استاد علامہ شبلی نعمانیؒ نے کیا تھا) آخر پانچ جلدیں جو شریعت اسلامی اور نظام دینی کے بنیادی و اہم شاخوں اور شعبوں کی تفصیل و تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہیں، آپ کے قلم سے ہیں۔

آپ اپنے علمی تفوق، گہرے مطالعہ، وسیع معلومات، تصنیف و تالیف پر عبور اور منفرد نگارش کے ساتھ ساتھ جس کا اعتراف خود علامہ اقبال اور بعض دوسرے چوٹی کے علماء و ادباء نے کیا ہے، پختہ دین دار، متقی و پرہیزگار، متبع شریعت، اللہ سے لو لگانے والے، اسی کی طرف رجوع کرنے والے اور اسلام کی بلندی کے لئے بے چین و مضطرب رہنے والے تھے۔

۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں آپ کی وفات ہوئی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں لاکھوں سوگواروں کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔

ندوۃ العلماء کا مسلک و منہج

دین و عقائد کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دست رس سے دور اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور

صاف و شفاف سر چشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال و اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر و مغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل، حقیقت دین اور روح دین سے زیادہ قربت اور تقویٰ و صلاح باطن پر ہے۔

تصور تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور ہے، اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت اور درسگاہ رسالت میں تربیت پائی اور قرآن و ایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی، سب سے زیادہ مثالی اور قابلِ تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت و نجات اور فلاح و کامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم و فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک اکائی ہے جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی، اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی۔

استفادہ اور افادہ اور ترک و قبول کے شعبہ میں اس میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ **"حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے"** نیز حکیمانہ اصول **"خذما صفا ودع ماکدر"** (یعنی جو صاف و نظیف ہو اس کو لے لو اور جو آلودہ و کثیف ہو اس کو چھوڑ دو)۔

اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے۔

واعد والهم ما استطعتم من قوة (الانفال. ٦٠) ان کے مقابلہ کے لئے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے تیار کرلو۔ دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن وفضائل کی تشریح اور ذہن وعقل کو اس کی حقانیت وصداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے۔

"کلموا الناس علی قدر عقولهم أتریدون أن یکذب الله ورسوله" (لوگوں سے ان کی عقلوں کی سطح کے مطابق گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے)۔

عقائد واصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی اور سلف کی آراء وتحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی وفقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک واصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے، اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسنِ ظن رکھا جائے، اور ان کے لئے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحت اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔ مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۶۲ء ۱۱۷۶ھ) کے علمی وفکری اور کلامی وفقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے۔ اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستانِ فکر اور مکتبِ خیال ہے۔

عالم عربی میں پیدا ہونے والے تغیرات وتحریکات پر نظر اور ان کی فکر

دار العلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء کو عالمِ عربی سے قریبی تعلق رکھنے ،وہاں کے سیاسی رہنماؤں کے افکار وخیالات اور تعلیم یافتہ طبقہ کے تصورات و نظریات سے واقف ہونے ،وہاں کے ادباء اور اہل قلم کی مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا کرنے والی اور اسلام کی قائدانہ صلاحیت پر سوالیہ نشان لگانے والی اور علم وفن، تہذیب وتمدن اور صنعت واختراع میں اسلام کی عاجزی کا تصور پیش کرنے والی تحریروں سے آگاہ ہونے، قوموں میں نت نئے حوادث اور ملکوں میں نئے نئے انقلابات رونما ہونے، عرب قائدین اور اہل قلم کا عرب قومیت کا نعرہ لگانے،اور قومیت کو اپنی شناخت قرار دے کر جاہلی عہد سے اپنا رشتہ جوڑنے کی مساعی و تحریکات سے براہ راست واقفیت کی بنا پر یہ توفیق ملی کہ وہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں، اس پر ٹوٹتے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کریں، عرب قومیت کا طلسم توڑنے اور نسل پرستی کی بنیاد پر بکھرتی امت میں کلمہ کو اساس بنا کر وحدت پیدا کرنے کے لیے اپنی لسانی و قلمی صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔

چنانچہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک طرف عربی ماہنامہ **"البعث الاسلامی"** پندرہ روزہ عربی اخبار **"الرائد"** اور ایک پندرہ روزہ اردو رسالہ **"تعمیر حیات"** کا اجرا عمل میں آیا،اور راقم اور ندوۃ العلماء سے انتساب رکھنے والے دوسرے فضلاء کے قلم سے ایسی کتابیں نکلیں جو عرب دنیا میں بہت مقبول ہوئیں،اور عرب فضلاء واہل قلم نے ان کا کھل کر اعتراف بھی کیا،دوسری

طرف ایک ایسے علمی تحقیقی ادارہ (۱۶) کی بنیاد پڑی جہاں سے ایسی کتابوں کی اشاعت ہو سکے جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے بارے میں پائی جانے والی بے اعتمادی دور کرتی ہوں اور ہر دور میں اسلامی فکری، اعتقادی اور نفسیاتی قائدانہ صلاحیت پر اعتماد بحال کرتی ہوں اور دعوت و تبلیغ کے وہ روشن نمونے پیش کرتی ہوں جو تاریک دلوں میں اسلام کی قندیل جلاتے ہوں اور اسلام کے ابدی ہونے اور ہر عہد میں اس کے مصلحین و مجددین اور باکمال اشخاص پیدا ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہوں۔(۱۷)

اسی کے ساتھ ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو عربی زبان وادب کا ایسا نصاب تیار کرنے کی توفیق ملی جو دین وادب دونوں کا جامع ہو، جس میں دینی روح بھی ہو اور دین آموزی کی صلاحیت بھی، جو اسلام کے بنیادی عقائد و تعلیمات (توحید، رسالت، معاد اور انبیائے کرام کی سیرت و شخصیت) کو حکایات کے ذریعہ اس طرح ذہن نشیں کرتا ہو کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ذہنوں پر ذرا بھی بار نہ پڑتا ہو۔

عربی زبان وادب کے اس سلسلۂ نصاب کی اہم کڑی **قصص النبیین للاطفال** پر مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ **"یہ بچوں کا علم کلام ہے"** اور مشہور عرب مفکر و مجاہد اہل قلم سید قطب شہیدؒ نے اس پر اپنے مقدمہ میں یہ اعتراف کیا تھا کہ یہ سلسلہ مصر کی وزارت تعلیم کے مرتب کئے ہوئے سلسلۂ قصص انبیاء سے زیادہ مفید ہے، جس کی ترتیب میں وہ خود شریک ہو رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت

حضرت مولانا محمد الیاسؒ (م ۱۹۴۴ء ۱۳۶۴ھ) نے جب مسلمانوں میں دینی شعور کو کم، بے دینی کے رجحان کو عام اور مغربی تہذیب، عصری تعلیم اور انگریزی حکومت کے مہلک اثرات کو بڑھتے دیکھا اور بہت سے علماء کو مادیت کا شکار، عیش و تنعم کا دل دادہ، اور دعوت دین کے فریضہ سے غافل دیکھا، جب انھوں نے مدارس کو اس حال میں پایا کہ وہ سمندر میں ایک جزیرہ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، ان میں اثر انگریزی کی طاقت کم اور اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو گئی ہے، عوام سے ان کا ربط کمزور اور زندگی سے ان کا تعلق ٹوٹ چکا ہے تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان نازک حالات میں گوشہ نشینی اختیار کرنا، عافیت پسندی کو ترجیح دینا اور محدود مدرسی، تعلیم و تدریس پر اکتفا کرنا، کسی طرح بھی کافی نہیں، بلکہ اس صورت حال کو بدلنے کے لئے عوام سے رابطہ ضروری ہے اور اس میں اب ذرا بھی تاخیر مہلک ثابت ہو سکتی ہے، کیوں کہ بیماروں کو اپنی بیماری کی سنگینی اور اپنے مرض کی ہلاکت خیزی کا اندازہ نہیں ہے۔

چنانچہ مولانا محمد الیاسؒ نے سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا کہ عوام سے رابطہ قائم کر کے ان کے دلوں میں ایمان کی آبیاری کی جائے، اور عقیدۂ توحید اور دین کے بنیادی و ضروری مسائل کو ان کے دل و دماغ میں پیوست کیا جائے، پھر ارکانِ اسلام، علم دین اور اوراد واذکار کی طرف توجہ کی جائے اور اس کام میں ان آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے جو اس دعوتی عمل کو مؤثر بنانے اور اس کو فتنوں اور آزمائشوں سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور جن میں اکرام مسلم، لایعنی باتوں

سے پرہیز، اور غیر متعلق امور سے اجتناب بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا محمد الیاسؒ نے اپنی دعوت و تحریک کا آغاز ہندوستان کے اخلاقی لحاظ سے سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ سے کیا جو جہالت و گمراہی اور دین سے ناواقفیت میں سب سے بڑھا ہوا تھا، یہ علاقہ میوات کے نام سے مشہور ہے اور دہلی کے جنوب میں واقع ہے۔

مولانا محمد الیاسؒ نے وہاں کے لوگوں کو اپنا کاروبار اور علاقہ چھوڑنے اور کچھ مدت کے لئے دوسرے علاقوں میں جاکر دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کی دعوت دی، کیوں کہ مولانا کا یہ خیال تھا کہ جب تک یہ لوگ اس بگڑے ہوئے ماحول سے جس میں وہ زندگی گزار رہے ہیں، نکلیں گے نہیں، اس وقت تک ان کے لئے دین کو سیکھنا اور سمجھنا، اخلاق کو بنانا اور سنوارنا، اور ایک پاکیزہ اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنا ممکن نہیں۔

اس علاقہ کے سیکڑوں نہیں ہزاروں باشندوں نے مولانا محمد الیاسؒ کی دعوت پر لبیک کہا، اور دنوں اور ہفتوں کے لئے نہیں، مہینوں اور سالوں کے لئے راہ خدا میں اپنا گھربار چھوڑ کر دور دراز علاقوں کا سواری اور پیادہ پا سفر کیا، دین سیکھا، اخلاق کی اصلاح کی اور دینی جذبہ اپنے اندر پیدا کیا۔

مولانا محمد الیاسؒ کی یہ دعوت دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئی، اس کے اس تیزی کے ساتھ پھیلنے اور دلوں پر اثر انداز ہونے کے پیچھے نہ تو پروپگنڈہ کی طاقت تھی نہ اخباری اشتہار کی، نہ سرکاری خزانہ کی کارفرمائی تھی، اور نہ عوامی چندہ کی، اس کے پس پشت اگر کوئی طاقت تھی تو وہ صرف یہ کہ اس کا طریق

کار اسلام کے ابتدائی عہد کے دعوتی واصلاحی طریقہ کار سے مشابہ اور قریب تر تھا اور اس جماعت سے منسلک لوگوں میں اخلاص اور رضائے الہی کا جذبہ موجزن تھا، جو ان مخلص بندوں کی یاد دلاتا تھا جنہوں نے دعوت وجہاد کی راہ میں پیش آنے والی ہر تکلیف ہنسی خوشی برداشت کی اور کام میں خوشنودی رب کے علاوہ کبھی کسی چیز کی خواہش نہ کی۔

آہستہ آہستہ اس تحریک کے اثرات دوسرے براعظموں اور دوسرے ملکوں میں پھیلنے لگے ،امریکہ ،یورپ،افریقہ اور آسٹریلیا میں جماعتوں کی نقل وحرکت شروع ہوگئی جس سے کام کرنے والوں کی زندگی میں تبدیلی آئی، اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہوئی اور اس کے لئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہوا۔(۱۸)

بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان کے طول وعرض میں تبلیغی جماعت کی شہرت ایک "وہابی جماعت" کی حیثیت سے ہے، جو مشرکانہ رسم ورواج کے خلاف آواز اٹھاتی اور جاہلی عادات واطوار کے خلاف برسرپیکار نظر آتی ہے، اس جماعت کی مخالفت میں سب سے آگے بدعتی حلقہ تھا، جو مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتا تھا، اس حلقہ نے تبلیغی جماعت کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا، اور اس کو وہابی تحریک کا ایجنٹ قرار دیا، مولانا اسماعیل شہیدؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف "**تقویۃ الایمان**" کی کھل کر مخالفت کی اور تبلیغی جماعت کے اثرات محدود کرنے کے لئے وہی حربے استعمال کئے جو جاہلی عہد کے کفار ومشرکین استعمال کیا کرتے تھے، جو کہتے تھے،لاتسمعوا لهٰذا القرآن والغو فيه لعلكم

تغلبون(حم سجدہ آیت ۲۶)اس قرآن کو نہ سنو (اور اس کی تلاوت کے وقت)اتنا شور مچاؤ کہ تمھارے اس شور ہنگامہ سے وہ دب جائے۔

لیکن خدا گواہ ہے کہ غلط اتہامات، بے بنیاد الزامات اور ایذا رسانی کے ان واقعات سے ان حضرات کے پائے استقامت میں لغزش تو در کناران کے صبر وضبط اور عزم وثبات میں اور اضافہ ہو گیا، اور ان کی بُردباری، نرم گفتاری اور سخت سے سخت بات پر خاموشی کا یہ اثر پڑا کہ ان کے بہت سے مخالفین ان کے ہم نوا بن گئے، اور ایک بڑی تعداد جو شرک وبدعت میں مبتلا تھی اس نے شرک وبدعت سے توبہ کی اور توحید خالص کی دعوت قبول کی اور گمراہی سے نکل کر ہدایت کی راہ پائی اور اس کی گواہی ہر وہ شخص دے سکتا ہے جس نے ان علاقوں کو دیکھا ہو جہاں تبلیغی جماعتوں کی آمد رفت ہوئی ہو۔

اب اگر ان دعوتی واصلاحی کوششوں، اس راہ میں دی جانے والی عظیم قربانیوں اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی اہم اور نمایاں کامیابیوں کے ساتھ اس جماعت سے وابستہ بعض افراد سے اعتقادی نہیں، عملی، دانستہ نہیں نادانستہ کوئی قابل مواخذہ عمل سرزد ہوتا ہے تو یہ چند افراد کی اپنی کوتاہی، اور جماعت کے اصول ومنہج کو سمجھنے میں اس کی اپنی تقصیر ہے اور اس کا الزام جماعت پر عائد کیا جانا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہو سکتا۔

آخر میں اس تعارف وتبصرہ کو علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اس مقدمہ کی آخری سطروں پر ختم کیا جاتا ہے جو انھوں نے راقم کی کتاب **"حضرت مولانا محمد الیاس**ؒ اور ان کی **دینی دعوت"** پر تحریر

فرمایا تھا۔

"اوپر کی سطروں میں تبلیغ ودعوت کے اصول پر جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کے تبلیغی اصول اور دعوت کے طریق کیا ہیں، اور جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں، آئندہ اوراق میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس دعوت و تبلیغ کے علمی و عملی اصول وآئین کا تذکرہ ہے وہ موجودہ ہندوستان کی تمام دینی تحریکوں میں اصل اول سے زیادہ قریب ہے۔

حکیمانہ دعوت و تبلیغ، **امر باالمعروف ، نہی عن المنکر** اسلام کے جسم کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس پر اسلام کی قوت، اسلام کی وسعت اور اسلام کی کامیابی منحصر ہے، اور آج سب زمانوں سے بڑھ کر اس کی ضرورت ہے اور غیر مسلمانوں کو مسلمان بنانے سے زیادہ اہم کام مسلمانوں کو مسلمان، نام کے مسلمانوں کو کام کا مسلمان اور قومی مسلمانوں کو دینی مسلمان بنانا ہے، حق ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت دیکھ کر قرآن پاک کی یہ ندا

یاایھا الذین امنوا امنوا اے مسلمانو! مسلمان ہو۔

کو پورے زور و شور سے بلند کیا جائے، شہر، شہر، گاؤں، گاؤں اور در در پھر کر مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کام کیا جائے اور اس راہ میں وہ جفاکشی، وہ محنت کوشی، اور وہ ہمت اور وہ قوت مجاہدہ

صرف کی جائے جو دنیا دار لوگ دنیا کے عزو جاہ اور حصول
طاقت میں صرف کر رہے ہیں، جس میں حصول مقصد کی خاطر
ہر متاع عزیز کو قربان کرنے اور ہر مانع کو بیچ سے ہٹانے کے
لئے ناقابل تسخیر طاقت پیدا ہوتی ہے۔ کشش سے، کوشش
سے، جان ومال سے، ہر راہ سے اس میں قدم آگے بڑھایا جائے
اور حصول مقصد کی خاطر وہ جنون کی کیفیت اپنے اندر پیدا کی
جائے جس کے بغیر دین ودنیا کا کوئی کام ہوا ہے اور نہ ہوگا۔
اس جنون کی اس عہد میں مثالیں آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اصل
کتاب کو شروع کریں۔"

اصل خطرہ جو توجہ کا طالب ہے

اس وقت مسلمان جن خطرات میں گھرے، جن مسائل میں الجھے، جن چلینجوں سے نبرد آزما اور تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گزر رہے ہیں وہ ہر گز اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی طاقت وتوانائی ان فروعی مسائل میں صرف کریں جو بحث وتحقیق کے مراحل سے گزر چکے ہیں، اور صدیوں سے ان پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے، یا کسی فقہی مسلک کی کسی ایسے مسئلہ کی وجہ سے مخالفت کریں جو کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا، اس سے امت کی کوئی خدمت نہیں ہوتی، اس لئے ضرورت ہے کہ اپنی توانائی صرف تعمیری کاموں میں صرف کی جائے اور اپنی کوششوں کا محور اخلاقی بگاڑ، مشرکانہ عقائد، جاہلی رسم ورواج اور غیر اسلامی بود وباش کی اصلاح کو بنایا جائے۔

توحید اور شریعت اسلامی پر عمل کرنے والوں اور محرمات سے بچنے والوں کو صرف فقہی اختلاف کی بنیاد پر جو ہمیشہ قائم رہا ہے، ہدفِ تنقید بنانا ایسا ہی ہے جیسا راقم نے اپنے ایک عربی رسالہ میں لکھا ہے **"بے مقصد جہاد اور بغیر دشمن کے جنگ کے مرادف ہے"۔**

اکثریتی فرقہ کے ارادوں اور عزائم سے جو شخص بھی واقف ہے وہ بخوبی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اس ہندوستان کو جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکمرانی کی اور تہذیبی، ثقافتی، انتظامی اور اقتصادی حیثیت سے اس کو بام عروج پر پہنچایا، ایک دوسرا اندلس (اسپین) بنانے کی پوری تیاری کی جاچکی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی فکری، ثقافتی، اجتماعی، تہذیبی اور لسانی اور اس کے بعد دینی و اقتصادی نسل کشی کی کوشش کا سلسلہ جاری ہے اور اس کی علامتیں نصاب تعلیم میں تبدیلی، ہندی کی جبری تعلیم، پرسنل لاء میں مداخلت، یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر اصرار، اردو زبان کی بیخ کنی، انگریزی و ہندی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین، فرقہ وارانہ جماعتوں کے قائدین حتیٰ کہ بعض وزراء کے بیانات و اعلانات اور ان کی پیش کردہ تجاویز، اور ان کی تیار کی ہوئی اسکیموں کی شکل میں ظاہر ہونے لگی ہیں، تو ایسے نازک وقت میں آپس میں دست و گریباں ہونا ایک بڑی ناعاقبت اندیشی اور کوتاہ نظری ہے۔

حواشی :

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صاحب مقالہ کی کتاب **"تاریخ دعوت وعزیمت"** حصہ چہارم

(۲) شیخ محی الدین ابن عربی مراد ہیں جو شیخ اکبر کے نام سے مشہور ہیں مرسیہ اندلس کے رہنے والے تھے ۵٦۰ھ میں ولادت ہوئی، ٦۳۸ھ میں ان کا انتقال دمشق میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

(۳) نص سے مراد نص شرعی ہے، فص سے اشارہ شیخ اکبر کی کتاب **"فصوص الحکم"** کی طرف ہے۔

(۴) شیخ ابن عربی کی کتاب **"فتوحات مکیہ"** متصوفانہ تحقیقات و نکات کی ایک شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس میں وحدۃ الوجود کا عقیدہ اور نظریہ ہے، اور بہت سی ایسی تحقیقات و مکشوفات ہیں جو شریعت اور جمہور اہل سنت کے عقائد سے مختلف اور متصادم ہیں۔

(۵) مکتوب (۱۰۰) دفتر اول بنام ملا حسن کشمیری۔

(۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو **"تاریخ دعوت وعزیمت"** حصہ پنجم مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔

(۷) ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول ص ۲۵۸۔۲۶۲۔

(۸) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" از مصنف جلد اول۔

(۹) الحطۃ بذکر الصحاح الستۃ (علامہ نواب سید صدیق حسن خاں) ملاحظہ ہو تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔

(۱۰) مصنف نزہۃ الخواطر (ا۔۸) والثقافۃ الاسلامیہ فی الہند مطبوعہ دمشق اکیڈمی و ناظم ندوۃ العلماء متوفی ۱۳۴۱ھ۔

(۱۱) نزہۃ الخواطر ج ۷ مولانا نذیر حسین صاحبؒ کے تلامذہ و مستفدین میں سے دو شخصیتوں کا ذکر کرنا بھی علمی و اخلاقی فرض معلوم ہوتا ہے۔ جنہوں نے دو بلند مرتبہ کتب حدیث کی جو صحاح میں شامل ہیں، قابل قدر خدمت انجام دی اور فاضلانہ شرح لکھی، ایک مولانا شمس الحق ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ) صاحب غایۃ المقصود شرح سنن ابی داؤد، و عون المعبود شرح سنن ابی داؤد۔ دوسرے مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری (م ۱۳۵۳ھ) صاحب تحفۃ الاحوذی شرح سنن ترمذی۔

(۱۲) علامہ رشید رضا مصری ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کی دعوت پر اس کے اجلاس سالانہ کی صدارت کے لئے جو ۱۳۳۰ھ ۔ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں منعقد ہو رہا تھا، شرکت و صدارت کے لئے تشریف لائے تھے، (ملاحظہ ہو تاریخ ندوۃ العلماء)۔

(۱۳) نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر ج ۸ (یہ کتاب حال میں دار عرفات رائے بریلی کی جانب سے "الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام (ا۔۸) کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

(۱۴) حضرت شیخ الحدیث کے متعدد رسائل اور کتابیں اردو میں دعوتی و اصلاحی موضوع اور فضائل میں ہیں یہاں صرف عربی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۵) حضرت شیخ الہند کی سوانح و سیرت اور حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو **"نزہۃ الخواطر"** یا الإعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام (عربی) جلد ۸ یا اسیر مالٹا از مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ۔

(۱۶) اس مجلس کا نام عربی میں المجمع الاسلامی العلمی، اردو میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور انگریزی میں Academy of Islamic Research and Publication

(۱۷) عالم عربی کی مخالفِ اسلام تحریکات، قومیت عربیہ اور دین سے آزادی ومغربیت کی دعوت کے خلاف راقم کے جو دعوتی واصلاحی رسائل شائع ہوئے اور ممالک عربیہ میں پھیلے ان کی تعداد ستر رسائل سے زیادہ ہے۔ اسی کے ساتھ جواں سال ادیب وصاحب قلم سید محمد الحسنی مرحوم کے قلم سے بھی بڑے قوی ومؤثر عربی رسائل ومقالات نکلے اور شائع ہوئے۔

(۱۸) اس انقلاب انگیز دینی دعوت اور اس کے داعی وقائد حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے حالات وسوانح کے لئے ملاحظہ ہو "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت" مؤلفہ صاحب مضمون ابوالحسن علی ندوی۔ واضح ہو کہ تبلیغ کے لئے گھر سے نکلنے اور وقت دینے کا مقصد ونتیجہ صرف دوسروں تک دین کی دعوت پہنچانا نہیں، بلکہ خود دین سیکھنا اور اپنی اصلاح وترقی کا وہ کام بھی ہے، جو اکثر اوقات اپنے مسکن سے نکلے اور مشاغل سے فارغ ہوئے بغیر انجام نہیں پاتا۔

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

پندرہویں صدی ہجری
ماضی وحال کے آئینہ میں
(ایک تبصرہ، ایک جائزہ، ایک پیغام)

یہ مقالہ ابتداءً ایک چھوٹی سی تقریر تھی۔ جو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں کی گئی تھی۔ نظر ثانی کے بعد اس نے مقالہ کی شکل اختیار کرلی۔

مذکورہ بالا عنوان پر مولانا موصوف کا ایک شاہکار وشاندار مقالہ۔ جو اپنے اندر ایک خاص پیغام رکھتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں

(ایک تبصرہ، ایک جائزہ، ایک پیغام)

الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس وقت دنیا میں پندرہویں صدی ہجری کی آمد آمد کا چرچا ہے، اس صدی کا آغاز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے، عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے، (۱) اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے، لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ پیغام پر رکھا ہے، اسلام کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، اسلام ایک فیصلہ اور طرز عمل کا نام ہے، یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا یہی خصوصیت اس صدی کی ہے، اس صدی کا آغاز بھی، کسی بڑی شخصیت، یہانتک کہ آنحضرت ﷺ کی محبوب ومحترم شخصیت سے بھی نہیں ہوتا، جو مسلمانوں کے

عقیدہ اور نظر میں اللہ کے بعد سب سے محبوب و محترم شخصیت ہے۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن نہ آپ ؐ کی پیدائش سے اس صدی کا تعلق ہے، اور نہ آپ ؐ کی وفات سے، حالانکہ دونوں دنیا کے اہم واقعات ہیں، بلکہ آپ کے واقعۂ ہجرت سے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی اسلامی صدی شروع ہو گی تو ایک پیغام لیکر آئے گی، وہ محض ایک شخصیت یا جماعت کی یاد تازہ نہیں کرتی، بلکہ ایک پیغام کی یاد تازہ کرتی ہے، یعنی یہ کہ آپ نے ایک عظیم مقصد کیلئے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہا، اور ایک نئے شہر میں بودوباش اختیار کی، یہ بات ایک پیغام، اور ایک بڑے اقدام کو یاد دلاتی ہے، آپ نے اتنا بڑا اقدام اپنی یا اپنے چند دوستوں اور ساتھیوں کی جان بچانے کیلئے نہیں کیا تھا، بلکہ خدا کے پیغام کو محفوظ کرنے اور اسکو ساری دنیا تک پہونچانے کا موقعہ مہیا کرنے کیلئے کیا تھا، تو یہ صدی ہم کو یاد دلاتی ہے کہ کسی عظیم مقصد کیلئے عزیز سے عزیز چیز کو چھوڑا جاسکتا ہے، اور اتنا بڑا اقدام کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہمت افزا اور حیات آفریں پیغام ہے، جو ہمت دلاتا ہے کہ کوئی چیز خواہ کیسی ہی نرالی اور کیسی ہی اجنبی ہو، اور اس کی راہ میں کیسی ہی شدید رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں اور کیسے ہی ناسازگار حالات ہوں، اور اس کو کیسی ہی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے، اگر اس سے انسانیت کی فلاح مقصود ہے، نیت میں خلوص ہے اور ارادہ میں عزم و پختگی، تو ساری مخالفتوں کے باوجود وہ پیغام زندہ رہے گا، اسکی قسمت میں کامیابی و کامرانی لکھی ہوئی ہے۔

اسلئے یہ پندرہویں صدی صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتی، بلکہ پوری نوع انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید

دعوت کے علمبردار ہیں، کسی اچھی بات کیلئے جدو جہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کیلئے وہ کھڑے ہوئے ہیں، ان سب کیلئے حیات نو کا پیغام ہے۔

لیکن یہ پندرہویں صدی مسلمانوں اور بالواسطہ انسانیت کے حق میں مبارک ثابت ہوگی ،یا(خدا نخواستہ) منحوس و نا مبارک ؟اسکا فیصلہ ابھی نہیں ہوسکتا، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں ، اور قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں ، ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ:وان لیس للانسان الا ما سعیٰ (سورۃ النجم ۳۹) اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

انسان کو اپنی زندگی اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے جسکی اس نے کوشش کی، اسکے حصے میں اسکی سعی آئے گی اور سعی کے نتائج آئیں گے ،اسکے بعد فرماتا ہے :وان سعیه سوف یریٰ (سورۃ النجم ٤٠)اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی،

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے ، تمام انسانی نسلوں ، اور تاریخ کے تمام دوروں کیلئے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور بر آمد ہوگا، اور اسکے اثرات و نتائج مشاہدات میں آئیں گے۔ثم یجزٰہ الجزاء الا وفی (سورۃ النجم ٤١) پھر اسکو اس کی کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

انسانی سعی کی جس نتیجہ خیزی ، اور بار آوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے، اسے اقبال نے انسان کیلئے کہا تھا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے ، جنت بھی جنہم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

میں صدی کے متعلق یہی شعر پڑھوں گا" خاکی " کی جگہ آپ " صدی " کہہ لیجئے ، یہ پندرہویں صدی ، اور وہ صدیاں جو گذر چکی ہیں ، سب کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت میں نہ مبارک ہیں ، نہ منحوس ، اسکے مبارک و منحوس ہونے کا فیصلہ انسانوں کی کوششوں کے صحیح رخ پر ہونے ، اور صحیح طریقہ پرانجام پانے پر منحصر ہے ، ہم کسی صدی کے متعلق ، بلکہ کسی سال ، کسی مہینہ ، کسی دن ، کسی ساعت کے متعلق بھی پہلے سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ مبارک ہو گی یا منحوس ؟ اسلام میں برکت و نحوست کے اس بے لچک نظریہ کا وجود نہیں ، جو بعض جاہلی قوموں میں (جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے محروم رہی ہیں) اب بھی پایا جاتا ہے ، ہم یہ کہیں کہ آنیوالی صدی بہت مبارک ہے ، اور یہ ملت کی اقبال مندی کا دور ہو گا ، یا یہ صدی کسی ملت یا تقدیر انسانی کے حق میں منحوس ثابت ہو گی ، یہ بالکل اسلامی طرز فکر نہیں ہے ، اور کتاب وسنت سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی ، اسلئے کہ یہ تخیل کہ فلاں وقت دائمی طور پر اپنی جگہ پر مبارک ہے یا منحوس ، انسانی قوت عمل کو سخت نقصان پہنچانے والا ہے ، اگر انسان پہلے سے یہ سمجھ جائے کہ کوئی ساعتِ نحس آنے والی ہے ، یا فلاں گھڑی منحوس ہے ، تو اسکے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے اور اسکی قوت عمل کیا بلکہ قوت فیصلہ بھی جواب دے جائے گی ۔

رسول اللہ ﷺ نے وہم پرستی ، بلکہ غالیانہ خوش عقیدگی ، اور شخصیت پرستی کی جڑ پر تیشہ چلایا ، ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا ، خدا کو اس امت کی تربیت مقصود تھی ، اس سے کچھ پہلے ہی فرزند رسول سیدنا ابراہیم کا انتقال ہوا تھا ، (۲) عرب جاہلیت سے قریب العہد تھے ، اور اسکے اثرات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے ، واقعہ ایسا بھی غیر معمولی اور ایسا جذباتی تھا کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ

کیوں نہ ہو، اللہ کے پیغمبر کے فرزند کا انتقال ہو اور سورج اس سے متأثر نہ ہو ؟ دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علم بردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اگر اسکی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے، میں نے تو کہلوائی بھی نہیں خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن اللہ کے رسول ﷺ کے بیٹے کے انتقال پر ہوا ہے، اسکی تردید کچھ ضروری نہیں ہے! یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقے پر پیش آئے ہوں) پیغمبر دین کا نقصان کر کے ان سے فائدہ اٹھانا حرام، اور کفر کے مرادف سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس امتحان میں محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی پورا اترا ہو، پیغمبروں کی جماعت میں بے شک اسکی مثال مل سکتی ہے، لیکن بانیانِ جماعت، اور سیاسی رہنماؤں کے یہاں نہیں مل سکتی، آپ نے اس پر مستقل خطبہ دیا، اور فرمایا۔

إن الشمس والقمر آيتانِ من ا يا ت الله لا يخسفان لموت أحد ولا لحياته (۳) سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، انکو کسی موت یا زندگی پر گرہن نہیں لگتا۔

گویا آپ نے فرمایا: تم نے کیا کہا؟ سورج اور چاند میں کسی کے مرنے اور کسی کے جینے پر کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا، یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں اور ان کا قانون دوسرا ہے، وہ اسی قانون کے پابند ہیں، ان پر کسی بڑی ہستی کے دنیا سے چلے جانے، یا کسی بڑی شخصیت سے تعلق رکھنے والے کسی واقعہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اس موقعہ پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد

پیدا ہونے والا نہیں تھا، بس ایک غلط خیال جو خوش عقیدگی، اور محبت وعظمت پر تھا، پیدا ہوا تھا، اور اضطراری طور پر پیدا ہوا تھا، اللہ کا رسول اسکو بھی برداشت نہ کر سکا، اور کہا کہ نہیں، نہیں، میرے خاندان یا میری اولاد سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں، کائنات اس سے زیادہ وسیع اور اللہ کی ذات اس سے غنی ہے، اللہ کا قانون ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے، یہ ایک اصولی رہنمائی تھی، جو پوری نسل انسانی، بلکہ ذہن انسانی کو دی گئی، ذہن انسانی نسل انسانی سے بھی زیادہ قیمتی اور قابل لحاظ ہے، وہ ساری نسل انسانی پر حکومت کرتا ہے نسل انسانی ذہن انسانی پر حکومت نہیں کرتی، یہ ذہن انسانی کا انحراف تھا جو بہت خطرناک ہے، اور اسکا علاج اور سدباب ضروری تھا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کوئی صدی اپنی جگہ پر نہ مبارک کہی جاسکتی ہے نہ منحوس، میں گلاس کی مثال دوں گا، گلاس اگر خالی ہے، تو آپ اسکے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ گلاس اچھا ہے یا برا ہے، ؟ اس کا انحصار اس "مظروف" پر ہے، جس کا یہ گلاس ظرف ہے، یہ پانی کا گلاس ہے، خدانخواستہ اگر شراب ہوتی، تو یہ شراب کا جام ہوتا، اگر اسکے اندر زہر بھرا ہوتا تو یہ زہر کا پیالا ہوتا، یہ گلاس اپنی جگہ پر ایک معصوم، ایک بالکل غیر جانبدار چیز ہے، آپ پر منحصر ہے کہ آپ اسکو کس چیز سے بھرتے ہیں ؟ آپ اسکو زمزم سے بھرتے ہیں تو یہ زمزم کا گلاس ہے، اگر خدانخواستہ اسے شراب سے بھرتے ہیں تو یہ شراب کا پیمانہ ہے اسلئے نسل انسانی کے حق میں یہ صدی کیا ثابت ہوگی، مبارک ہوگی، یا منحوس ہوگی ؟ اس کا سراسر انحصار ہماری اور آپ کی اور امت کی سعی پر ہے، جس کو خدا نے اپنے آخری پیغام کا حامل بنایا ہے۔

اس سلسلہ میں میں تین مثالیں دوں گا، دو مثالیں ان صدیوں کی جن کا آغاز نہایت ہولناک، مایوس کن، ہمت شکن، اور حوصلہ فرساواقعات سے ہوااس وقت کے مورخوں اور اہل نظر نے اس صدی کااستقبال ناگواری سے نہیں، بلکہ جگر کے زخموں، دل کے داغوں، اور آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے کیا، ابن اثیر وابن کثیر کی شہادت موجود ہے کہ اسلامی حلقوں نے ساتویں صدی کااستقبال کس طرح کیا؟ تمام آثار و قرائن بتاتے تھے کہ یہ صدی مسلمانوں کے حق میں نہیں، ملت اسلامیہ کے حق میں نہیں، اسلام کے حق میں نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے حق میں منحوس ترین صدی ثابت ہوگی، اس کا آغاز ایسے غیر معمولی واقعہ سے ہوا تھا، جس طرح کا واقعہ (مورخ ابن اثیر م ۶۳۸ھ) کے بقول "اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا، تو وہ کچھ غلط نہ ہوگا، اسلئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا"۔(۴)

میری مراد تاتاریوں کے اس حملہ سے ہے، جو ۶۱۶ھ میں اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی (EMPIRE) علاءالدین خوارزم شاہ کی سلطنت پر ہوا، یہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا، اور تیرہویں صدی مسیحی چل رہی تھی تاتاری مور وملخ کی طرح اٹھے اور عالم اسلام پر چھاگئے، ترکستان اور ایران کو زیروزبر اور پورے پورے شہروں کو انھوں نے تاراج و بے چراغ بنادیا، انسانی سروں اور لاشوں کے مینارے بنائے گئے، جن پر چڑھ چڑھ کر انھوں نے صدا لگائی، پورے پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہوگئے، اس واقعہ کی ہولناکی کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب "سقوط و زوال روما" (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھا ہے کہ: "سویڈن

کے باشندوں نے رُوس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کیلئے نہیں نکلے"(۵)

خیال کیجئے کہ سوڈان کہاں واقع ہے؟ انگلستان کا ساحل اس علاقے سے جس پر تاتاریوں کی تاخت ہوئی تھی، جغرافی طور پر کتنی دور تھا، سویڈن کے ماہی گیر جن کا پیشہ ہی ماہی گیری تھا، کچھ عرصہ انگلستان کے ساحل پر شکار کھیلنے خوف دہشت کے مارے نہیں آئے، کیمبرج کی "**تاریخ عہد وسطی**" کے لکھنے والے کو اس واقعہ کی ہولناکی کی تصویر کھینچنے کیلئے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملے کہ

"**آسمان نے زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دیا**"۔(۶)

یہ دونوں ان مغربی مصنفین کے بیانات ہیں، جو جذبات اور گردوپیش کے حالات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے، اور جن پر براہ راست تاتاری حملہ کی زد نہیں پڑی تھی، مسلمانوں نے اس واقعہ کو کس نظر سے دیکھا، اسکا اندازہ اس مشہور مقولہ اور کہاوت سے کیا جاسکتا ہے، جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی زبان زد تھی،

"**اذا قيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق**"(ہر بات مان لینا، لیکن جب یہ کہا جائے کہ معرکہ میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس کو باور نہ کرنا) وہ مسلمان قوم جو یاس کے مفہوم سے ناآشنا تھی، جس سے کہا گیا تھا:۔

لا تقنطوا من رحمة الله (الزمر ۵۳) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو

وہ مسلمان جنھوں نے قرآن مجید میں پڑھا تھا:۔

انه لا يايئس من روح الله الا القوم الكفرون (سورۂ یوسف ۸۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی لوگ ہوتے ہیں۔

اسوقت مسلمانوں پر ایسی مایوسی طاری تھی کہ ان کے لیے یہ کہاوت بن گئی تھی کہ ہر بات قابل تسلیم ہے، قرین قیاس ہے، کوئی بات دنیا میں ناممکن نہیں، ناممکن بات صرف یہ ہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی۔

علاء الدین خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے تاتاری اپنے صدیوں کے "**حصار**" سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آپ تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں، نشانہ مسلمان تھے، اور انھوں نے وہاں سے نکل کر پورے ترکستان، اور ایران و عراق کا تختہ الٹ دیا تھا، اور ان ملکوں کی حکومت، اور تہذیب و تمدن کا چراغ گل کر دیا تھا، یہی وقت ہے، جب ذہین انسانوں کے قافلے تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آئے، اور ان کو یہاں پناہ ملی، یہ تیرہویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے، آرنلڈ نے اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں مسلمانوں کی مایوسی، اور شکستہ دلی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، اسوقت ہر حساس آدمی جسکو خدا نے دیکھنے کے لئے دو آنکھیں دی تھیں، اور مقدمات واسباب سے نتائج نکالنے کی صلاحیت عطا کی تھی، پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ اسلام کے دن پورے ہو چکے ہیں، مسلمانوں کا ستارۂ اقبال اب ہمیشہ کے لئے غروب ہو رہا ہے، اس عالم آشوب واقعہ سے مسلمانوں کو اصل نقصان پہونچا تھا، کیونکہ وہی اصل نشانہ تھے، اس لئے سب سے زیادہ مسلمانوں کے لئے کام کرنے کا میدان تنگ تھا، اور سب سے کم امیدان کے لئے تھی، آرنلڈ لکھتا ہے :۔

"(اسلام کے علاوہ) وہ مذہب اور اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنائیں، وہ حالت بھی عجیب وغریب، اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی، جس

وقت بودھ مذہب اور عیسائی مذہب، اور اسلام اس جدوجہد میں
ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے تین بڑے
مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔
اسلام کے لئے ایسے وقت میں بودھ مذہب اور
عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے
بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا، جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم
ہوتی تھی"۔(۷)

سارے قرائن اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ عیسائیت کو کامیابی ہوگی، اسلئے بھی کہ اس جنگ میں عیسائیت اصل فریق نہیں بنی تھی، اور دوسری مشکل یہ تھی کہ چنگیز خاں کے شہزادوں کے گھر میں عیسائی عورتیں تھیں، اور ان کے پادری ان کے درباروں میں تھے، اسلئے اگر قبول مذہب کا سوال ہوتا، تو حتمی طور پر یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ وہ تنہا عیسائیت کو قبول کریں گے، لیکن آپکو معلوم ہے کیا ہوا؟ آرنلڈ کو یہ الفاظ لکھنے پڑے کہ :۔

بالآخر اپنی گذشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے
اسلام اٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں
نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا مسلمان کرلیا۔"(۸)

آرنلڈ مزید لکھتا ہے :۔

"باوجود ان مشکلات کے، مغلوں اور وحشی قوموں
نے جو بعد میں آئیں، انھیں مسلمانوں کا مذہب قبول کیا، جن
کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔"(۹)

وہ صدی جس کا آغاز نحوست سے ہوا تھا، (اگر نحوست کا کوئی لفظ اسلام کی ڈکشنری میں ہے) وہ صدی جس کا آغاز عالمگیر تاریکی، اور عالمگیر مایوسی سے ہوا تھا، وہ صدی اسلام کی "فتح مبین" کی صدی بن گئی، اور دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں بلکہ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ وہ تاتاری جن کی تلواروں سے ابھی مسلمانوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے، ہوورتھ لکھتا ہے کہ :۔

> "مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کیے کہ چینی تماشے والے جو پردے پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہونچائے"۔(۱۰)

لیکن دنیا نے یہ دیکھا کہ اس اسلام نے فاتح تاتاریوں کو فتح کر لیا۔

بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے سب کچھ کھو دیا تھا، ایمان و عقیدہ نہیں کھویا تھا، روحانی طاقت نہیں کھوئی تھی، شکست کس نے کھائی تھی؟ شکست کھائی تھی، (مجھے بہت تکلیف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) نالائق مسلمان بادشاہوں نے، ایک کمزور و مریض معاشرہ نے، اسلام اپنی جگہ پر تھا، اسلام کے شیشہ پر کوئی بال بھی نہیں پڑا تھا، مسلمانوں نے اسوقت یہ سمجھ لیا تھا کہ تاتاریوں کو تلوار سے زیر کرنا ممکن نہیں، اسلام کی تلوار کند ہو چکی ہے، تقریباً ٹوٹ چکی ہے، یا نیام میں جا چکی ہے، تاتاری یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان کے پاس مسلمانوں سے بہتر فوجی طاقت

ہے ،وہ دولت و حکومت، اور تمدن و تہذیب کی خرابیوں اور بیماریوں سے دور ہیں، ان کے اندر مشقتوں اور دشواریوں کو برداشت کرنے کی وہ طاقت ہے، جو کبھی تازہ دم عربوں اور فاتحین اسلام میں تھی، وہ صدیوں کے بعد صحرا سے نکلے ہیں، انکی ساری توانائی (ENERGY) ان کے اندر محفوظ ہے، ان کا مقابلہ تلوار سے نہیں کیا جاسکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ پھر کس نے تاتاریوں کو فتح کیا؟ کس نے تاتاریوں کو اسلام کا کلمہ پڑھایا؟

اس نازک گھڑی اور گھٹاٹوپ اندھیرے، میں اہل دل سامنے آئے، جنکے اندر روحانی طاقت تھی اور تقریباً نصف صدی کے اندر اندر انھوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنالیا، قبول اسلام کے واقعات پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں، افراد کے قبول اسلام کے، خاندانوں کے قبول اسلام، شہروں کے قبول اسلام کے، لیکن قوموں کے من حیث القوم قبول اسلام کی مثالیں ہمارے علم میں تین یا چار سے زیادہ نہیں، عربوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا، افغانوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا (افسوس ہے کہ وہ بھی آج ابتلاء و آزمائش میں ہیں) تاتاریوں اور ترکوں نے انفرادی طور پر نہیں، من حیث القوم سو فیصدی اسلام قبول کیا، تاریخ کا یہ معمہ ہے، اور میں بھی اس آزمائش سے گذر چکا ہوں، یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ یہ تاریخ ساز اور ساری دنیا کے مستقبل پر اثر ڈالنے والا واقعہ (تاتاریوں کے قبول اسلام کا واقعہ) پیش آئے، اور ہمیں ان لوگوں کے نام بھی نہ ملیں جن کے سر تاتاریوں کے قبول اسلام کا سہرا ہے، یہ کیا بات ہے؟

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آیا کہ جب مدائن کی فتح میں ایک

مسلمان سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج لگا، اور وہ اس کو اپنے دامن میں چھپا کر امیر افواج اسلامی سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس لایا، جیسے کوئی چوری کا مال چھپا کر لاتا ہے "ایھاالامیر! یہ کوئی بہت قیمتی چیز معلوم ہوتی ہے، یہ میں آپ کے حوالہ کر رہا ہوں، تاکہ بیت المال میں داخل ہو جائے" پہلے تو مسلمان امیر نے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، سپاہی کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اور حیرت کے دریا میں ڈوب گئے کہ اللہ اکبر! اتنا قیمتی جواہرات سے مرصع تاج زریں اور اس غریب سپاہی اور عرب کے بدو کی نیت خراب نہیں ہوئی، اسکو کسی وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ بجائے یہاں لانے کے اسکو اپنے خیمہ میں لے جاکر رکھ دے، کہا کہ آپ کا نام؟ اس نے دروازہ کی طرف منھ کر کے اور پیٹھ پھیر کر کہا "جس کیلئے میں نے یہ کام کیا ہے، وہ میرا نام جانتا ہے" اور یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک فرد کا واقعہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تاتاریوں کو کلمہ پڑھانے والوں کا یہی طرز عمل تھا، انھوں نے اپنے نام کو چھپایا، مجھے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد جب میں اس موضوع پر لکھ رہا تھا دو آدمیوں کے نام ملے ہیں، ایک درویش صفت وزیر امیر توزوں کا نام (۱۱) جو عراق پر حکومت کرنے والی تاتاری نسل کے بادشاہ کے وزیر آعظم تھے، وہ صوفی منش، اور عابد و زاہد وزیر تھے اور ان کا عمل اس پر تھا کہ۔ع

درویش صفت باش وکلاہ تتری دار

تاتاری بادشاہ کے کان میں وہ اچھی بات ڈالتے رہے حتیٰ کہ بغداد والوں نے اچانک ایک دن یہ دیکھا کہ جمعہ کا مبارک دن ہے، اور تاتاری حکمران سلطان غازان اور اس کے وزراء ہاتھ میں تسبیحیں لئے ہوئے مسجد کو جا رہے ہیں۔ (۱۲)

دوسرا کارنامہ شیخ جمال الدین کا ہے، جنکے خلوص بے پایاں، سچی روحانیت، اور دلی دردمندی کی برکت سے تاتاریوں کی چغتائی شاخ میں جو بلاد متوسطہ میں (جسکا مرکز کاشغر تھا) اسلام پھیلا، اور پوری شاخ مسلمان ہوگئی، واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین کہیں جارہے تھے، ایرانی تاتاریوں کی نگاہ میں سب زیادہ بے وقعت تھے، وہ انکو طعنہ دیتے تھے اور چڑھاتے تھے کہ ایرانی بھی کوئی آدمی ہوتے ہیں، اتفاق سے وہ ایرانی بھی تھے، یہ تغلق تیمور شہزادہ کے شکار کا دن تھا، جو چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، اور اس کی تاج پوشی میں کچھ مہینے یا کچھ سال باقی تھے، شکار کے بہت سے توہمات ہوتے ہیں، اور یہ لوگ تو سخت وہم پرست تھے، شیخ جمال الدین کو دیکھا کہ وہ شکار گاہ میں داخل ہوگئے، فوراً سپاہی نے پکڑا اور مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے لایا، شہزادہ بڑا ہی مکدر ہوا، اس نے کہا کہ آج تو میرا سارا شکار غارت گیا، کس منحوس کی مین نے صورت دیکھ لی، یہ ایرانی کمبخت یہاں آگیا اس کا کتا پاس تھا، غصہ میں کہا کہ تم اچھے ہو کہ میرا یہ کتا اچھا ہے؟ خیال کیجئے اور اس منظر کو سامنے لائیے، اور دیکھئے کہ خدا کے بندوں نے کس طرح کام کیا ہے، ان کے چہرہ پر کوئی رنگ نہیں آیا، کوئی شکن پیشانی پر نمودار نہیں ہوئی، نہایت اطمینان کے ساتھ کہا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا! شہزادہ نے کہا کیا مطلب؟ یہ کون مشکل بات ہے؟ انھوں نے کہا کہ اسکا انحصار کسی اور چیز پر ہے، اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو میں اچھا ہوں ورنہ یہ کتا اچھا ہے۔

تغلق تیمور کے پتھر دل پر ضرب لگی، محض کچھ کہہ دینے سے ایسی ضرب نہیں لگتی، لیکن

ہرچہ از دل می خیزد، بر دل می ریزد

جو چیز دل سے اٹھتی ہے دل پر گرتی ہے، انھوں نے جس وقت یہ جملہ کہا ہو گا، اس کے ساتھ کتنی دعائیں، کتنے آنسو، کتنی آہیں رہی ہوں گی، خدایا! کہنے کو تو میں یہ جملہ کہتا ہوں اثر تو پیدا کر، یہ وقت ہے. اسلام کی قسمت کے فیصلہ گا! اگر اس شخص کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو مسلمانوں کی قسمت بدل جاتی ہے، انھوں نے کہا کہ اسکا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا، اسکا فیصلہ اسوقت ہو گا، جب میں کلمہ پڑھتا ہوا، اللہ اور اسکے رسول پر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، اسوقت یقیناً میں اشرف المخلوقات ہوں، میں افضل ہوں، ورنہ یہ کتا ہزار درجہ مجھ سے بہتر رہے گا، یہ واقعہ جو فارسی تاریخوں سے ماخوذ ہے آرنلڈ کی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔(۱۳)

تغلق تیمور نے کہا کہ اچھا اسوقت تو میں کچھ نہیں کہتا، ولی عہد سلطنت ہوں آپ کہیں بھی ہوں، جب یہ سنیں کہ میری تاج پوشی ہو گئی تو مجھ سے ملئے گا، اب وہ اللہ کے بندے دن گننے لگے کہ وہ ساعت سعید کب آتی ہے کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو، اور میں خدا کا پیغام اس تک پہونچاؤں، انکی قسمت میں نہیں تھا، وقت اخیر آگیا، مرض موت میں انھوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا، اور کہا کہ بیٹا! ایک بہت بڑی سعادت تھی جو میری قسمت میں معلوم ہوتا ہے نہیں ہے، شاید تمھاری قسمت میں ہو، جس وقت تم یہ سننا کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو گئی، اس تک میرا اسلام پہونچانا، اور کہنا کہ آپ نے میرے والد سے کچھ کہا تھا ؟ چنانچہ وہ گئے، کون ان بیچاروں کو محل میں گھسنے دیتا؟ وہ تاتاری شہنشاہ کا محل تھا، دربانوں نے ان کو روک دیا، اس وقت تو انھوں نے انتظار کیا کہ کوئی موقعہ ملے، نہیں موقعہ ملا، ایک درخت کے نیچے مصلیٰ ڈال کر وہاں بیٹھ گئے جب نماز کا وقت ہوتا اذان دیتے،

اور نماز پڑھ لیتے، خدا کو منظور تھا، ایک دن صبح کے وقت جو میٹھی نیند کا وقت ہوتا ہے، انھوں نے اذان دی، وہ محل اور خواب سلطانی میں پہونچی یا پہونچائی گئی، بادشاہ نے کہا، یہ کون باؤلا شخص ہے؟ کیا صدائے بے ہنگام لگاتا ہے؟ میں نے تو آج تک یہ آواز نہیں سنی، محل کے قریب حفاظت (SECURITY) کے بڑے انتظامات ہوتے ہیں، داروغہ نے کہا کہ حضور! ایک دیوانہ سا آدمی آیا ہوا ہے، ہم نے بھی کوئی زیادہ تعرض نہیں کیا، کہ کوئی مسکین آدمی ہوگا صدا لگاتا ہے، بادشاہ نے حکم دیا، اسے پکڑ کر لاؤ، بلایا گیا، بادشاہ نے کہا تم کون ہو؟ یہ کیا صدا لگاتے ہو؟ اس کا کیا مطلب ہے؟

شیخ رشید الدین نے کہا کہ سرکار! آپ کو کچھ یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ شکار کھیلنے کے لئے نکلے تھے، ایک مسلمان فقیر آپ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، آپ نے ان سے پوچھا تھا کہ تم اچھے ہو یا میرا کتا اچھا؟ انھوں نے جواب دیا تھا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اس کا فیصلہ ہو گیا، الحمد للہ وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔

بادشاہ نے سنا اور وزیر اعظم کو بلایا، کہا کہ ایک راز ہے جو میرے سینہ میں تھا، یہ واقعہ میرے ساتھ گذرا ہے، اس کا اثر آج تک میرے دل پر باقی ہے، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا، تمھاری کیا رائے ہے؟ وزیر نے کہا کہ حضور والا! میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، میں تو اپنے اسلام کو چھپا رہا تھا، میں ایک مرتبہ ایران گیا تھا، وہاں میں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور وزراء بلائے گئے اور جب بادشاہ کا منشا معلوم ہوا تو سب مسلمان ہو گئے۔

ان بیچارے تاتاریوں کے پاس نہ تہذیب تھی، نہ علم وادب نہ کوئی آسمانی

مذہب جس کو عقل قبول کرے، قانون بھی انھوں نے مسلمانوں ہی سے لیا تھا۔ولله جنود السموٰت والارض، (سورئه فتح. ۷) اللہ ہی کیلئے آسمان وزمین کے لشکر ہیں۔

یہ خدائی تدبیر تھی، اتنے متمدن اور ترقی یافتہ مملکت کا نظم ونسق کرنا تاتاریوں کے بس کا روگ نہ تھا، وہاں مسلمان قانون ساز موجود تھے، آب پاشی کا نظام، تحصیل وصول کا نظام، مقدمات کے فیصلے، ان کے پاس ایک مختصر و محدود قانون تعزیرات تھا، جو صحرا کی محدود زندگی اوراس کے تجربات پر مبنی تھا، پہلے سے مسلمانوں کے دست نگر تھے، مسلمان دانشور، ماہرین قانون، اور علماء پہلے ہی اپنا کام کرچکے تھے، اور انھوں نے اتنی بڑی مملکت کے نظم ونسق میں ان کی مدد کی تھی، اوراسلام کی زندگی کی رہنمائی اور معاشرہ و مملکت کی تنظیم کی صلاحیت کا نقش ان کے دماغوں پر قائم کردیا تھا، انھوں نے دیکھاکہ اب صرف عقیدہ اور ایمان کی بات باقی تھی، وہ مرحلہ یہاں طے ہوگیا۔

اسی وقت تغلق تیمور مسلمان ہوا، اور پورے ایران کے تاتاری چند دن میں مسلمان ہوگئے، ادھر امیر توزون کی کوشش سے عراق میں جو خاندان حکومت کررہا تھا، اسلام قبول کرچکا تھا، جس طرح تسبیح کے دانے گرتے ہیں، تاتاری لاکھوں کی تعداد میں اسلام قبول کررہے تھے، مسمان دانشور، مخلص علماء، واعظین، مبلغین، اور سب سے بڑھ کر اہل دل کا کارنامہ تھا، اس حقیقت میں دورائیں نہیں ہوسکتیں، پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان اہل دل نے اندر اندر کام کیاہے، اور تاتاری ان کے نامۂ اعمال میں ہیں، یہ لاکھوں انسان (جنھوں نے تاریخ پر اثر ڈالا ہے) قیامت کے دن جب اٹھیں گے تو انھیں کے حساب میں شمار ہوں گے، ان

اہل دل کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آرہا ہے ؎

اچھے وہی ہیں آج ، جو سوتے ہیں زیر گل
افسوس ہے ، انھیں کے ہزاروں گلے ہوئے

میں نے ایک ایسی صدی کی مثال دی جس کا آغاز نہایت ہولناک حالات، اور اسلام کے حق میں پیام موت سے ہوا تھا، لیکن مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری، انھوں نے سلطنت ہاری تھی، ہمت نہیں ہاری تھی، اور مسئلہ یہی ہے کہ سلطنت دس مرتبہ ہاری جائے، گیارہویں مرتبہ آسکتی ہے، ہمت ایک مرتبہ ہار دی جائے تو اکثر واپس نہیں آتی، داعیان اسلام بغیر کسی پروپیگنڈے کے خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، مجھے علم نہیں کہ مسلمانوں نے اس وقت کوئی انجمن بنائی ہو کہ تاتاریوں کو مسلمان کرنا ہے، پہلے انھوں نے یہ اشتہار دیا ہو کہ تاتاری مسلمان ہوں گے تو یہ فائدہ ہوگا، اس سے کھوئی ہوئی سلطنت ملے گی، اقتدار قائم ہوگا، کچھ نہیں، خود مسلمانوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور اچانک یہ معلوم ہوا کہ پوری کی پوری قوم اسلام کی جھولی میں ڈال دی گئی۔

میں نے ایک مثال ساتویں صدی ہجری، اور تیرہویں صدی عیسوی کی دی، جس کا آغاز ایسے مہیب، اور ہولناک حالات سے ہوا تھا، جس سے مسلمانوں کے دل دہل گئے تھے، اور خدانخواستہ اگر ان میں عقیدہ کی طاقت نہ ہوتی، تو اگر ایمانی ارتداد نہیں، تو تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو ضرور آجاتا، اس وقت نہ تہذیبی ارتداد آیا نہ ذہنی ارتداد اور ایمانی ارتداد کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

دوسری مثال میں دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) کی

دوں گا میں اس موقعہ پر عالم اسلام کی وسعتوں میں نہیں جاؤں گا، ہندوستان کا تذکرہ کرتا ہوں، دسویں صدی ہجری کا وسط اس حالت میں آیا کہ ہندوستان اسلام کی قیادت ورہنمائی بلکہ اسلام کے برکات ہی سے محروم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہو گیا تھا، بظاہر نظر آرہا تھا کہ چند دنوں کا معاملہ ہے، تفصیلات آپ بڑی کتابوں میں پڑھیے، (۱۴) اس وقت عالم اسلام میں دو سب سے بڑی سلطنتیں تھیں، ایک عثمانیوں کی سلطنت ایشیاء کوچک اور مشرق وسطیٰ میں، دوسری مغلوں کی سلطنت اس تحتی بر اعظم میں، اسکے بعد اگر نمبر تھا تو ایران کی صفوی سلطنت کا، یہاں ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ایک قوی الارادہ، صاحب عزم، ذہین، فاتح اور کشور کشا سلطانِ وقت کے ساتھ اس وقت کی نسل کے چند ذہین ترین علماء اور دانشور (جن میں ابوالفضل اور فیضی کا نام سب سے نمایاں ہے) ایک تحریک میں شامل ہو گئے، جس کا مقصد ہندوستان کا رخ اسلام سے ہٹا کر اکبر کے دین الٰہی، اور اس وحدتِ ادیان کی طرف موڑنا تھا۔ جسمیں پلڑا ہمیشہ دوسری طرف جھکا ہوا تھا۔ (۱۵)

یہ مادی طاقت اور ذہانت دونوں کا خطرناک سنگم تھا، یا اسلام کے خلاف مطلق العنان سلطنت، اور بے قید اور آزاد عقلیت کی سازش تھی، جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں، اس وقت اس بات کو برملا کہا جانے لگا تھا کہ دسویں صدی ختم ہو رہی ہے، گیارہویں صدی شروع ہونے والی ہے، کسی دین کے لئے ایک ہزار سال کی مدت بہت ہوتی ہے، ایران و ہندوستان کے بہت سے فاضلوں نے جن کو خوف خدا اور دین کا گہرا علم نہیں تھا، اور جاہ واقتدار، منصب و عہدہ کی ہوس تھی، اس کے لئے مواد فراہم کر دیا کہ فلاں مذہب کا ستارۂ اقبال اتنے دنوں تک بلند رہا،

ایک ہزار سال کے بعد دوسرا مذہب آیا، اور دوسری فکری رہنمائی اور قیادت میدان میں آئی، اب دینِ عربی کی عمر پوری ہو گئی ہے، اور رسولِ عربی ﷺ کی نبوت پر ایک ہزار سال گذر گئے ہیں، اس نسل کو نئے دین اور آئین کی ضرورت ہے، اکثر ایسے فتنے ان فلسفوں سے پیدا ہوتے ہیں، جو مذہب اور اخلاقیات کی رہنمائی سے آزاد ہوتے ہیں۔

اس خطرہ کا ذرا اندازہ کیجئے، اس تحریک کا علم بردار اور رمز (-SYM BOL)وہ شخص تھا، جس کی تلوار کی دھاک سارے ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی، جس نے ہر ناقابلِ تسخیر مہم کو سر کیا تھا، اور جو شکست و ناکامی کو جانتا نہیں تھا، جس میں جوانی کا خون تھا۔ اور اپنے جد اعلیٰ تیمور کی حوصلہ مندی، اور بابر کی مشکل پسندی، ایک طرف وہ شہنشاہ ہے، دوسری طرف وہ ذہین ترین انسان ہیں، جن کی آج بھی آپ تحریریں پڑھیں تو ان کی ذہانت کا لوہا مان جائیں گے۔

پھر کیا ہوا؟ دسویں صدی کا آخر یہ خبر لے کر آیا کہ اسلام کے قدم اس ملک سے اکھڑ رہے ہیں، اب ہندوستان میں سیاسی اقتدار ہی نہیں، دینی اور روحانی اقتدار بھی دوسری طاقتوں اور فلسفوں کی طرف منتقل ہو رہا ہے، یہ انقلاب ان فاتحین کی کوششوں پر پانی پھیر رہا تھا، جنھوں نے کئی صدی قبل اپنی جان کی بازی لگا کر اس ملک کو فتح کیا تھا، اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، اور ان کے پاک نہاد خلفاء کی کوششوں پر جنھوں نے اپنے اپنے گوشے میں بیٹھ کر سعید روحوں کو انسانیت اور محبت، مساواتِ انسانی اور عدلِ اجتماعی (-SOCIAL JUS TICE) کا درس دیا تھا، باہر رہ کر حکومت وقت کی دینی و اخلاقی نگرانی کی تھی، اور حکومت و معاشرہ کو صالح، قوی، اور امانت دار، خدا ترس، انسانیت دوست افراد مہیا

کئے تھے، اور ملک کی علمی و تعلیمی تحریک میں بھی نئی روح پھونک دی تھی، (۱۶)

پھر کیا ہوا؟ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی اُفق سے نہیں، کسی مادی اُفق سے نہیں، صرف اسی ایمان وروحانیت کے گوشے سے، اسی اخلاص وللّٰہیت کے گوشے سے، اسی علم و حکمت کے گوشے سے جو ہمیشہ اپنا کام کرتا رہا ہے، اور جس نے گرتوں کو سنبھالا ہے، ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے، جس کا نام شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ ۹۷۱ھ ۱۰۳۴ء ہے جس کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبر دار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفس گرم سے ہے گرمئ احرار

اسلام کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لئے جس میں اسوقت کے ذہین ترین انسان شریک تھے، ایک فقیر بے نوا سرہند کے گوشہ میں بیٹھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا ہے، انھوں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں باعزت وآزاد طریقہ پر رہنے، اور اپنے دینی شعائر کو باقی رکھنے کے حق سے کیوں محروم کئے جاتے ہیں، اور صرف انھیں پر زندگی کا میدان کیوں تنگ کیا جارہا ہے۔؟

پھر کیا نتیجہ ہوا؟ گیارہویں صدی جب شروع ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ رنگ بالکل بدل گیا ہے، اسکے بعد سے دو تین صدیوں تک کے لئے اسلام کا مستقبل اس ملک میں بالکل محفوظ کر دیا گیا، اسوقت اللہ کا یہ بندہ سرہند میں بیٹھ گیا، نبوت ورسالت محمدی کی ضرورت وبقا اور شریعت وسنت کے مقام ودوام کے خلاف جو علمی واشراقی مغالطے تھے، ان کا پردہ چاک کیا، اور اس پر اعتماد بحال کیا، (۱۷) دوسری طرف اس خطرہ کا سدباب جو تیزی سے بڑھ رہا تھا اس کی (STRATE-GY) حکمت عملی کیا تھی؟ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، اکبر کے خلاف کسی طاقت کو

منظّم کرنے کی کوشش نہیں، اسکے تاریخی مطالعہ نے بھی، اور اس کی قرآنی بصیرت نے بھی اس کو بتایا کہ اگر حریف بن کر سامنے آؤ گے تو کچل دیئے جاؤ گے، تمہیں کام کرنے کا کوئی وقت نہیں ملے گا، اللہ سے دعائیں کرو، اپنے گرد مخلص اور لائق افراد کو اکٹھا کرو، ان کی ہمہ گیر تربیت کرو، وہ دولت اور حکومت کے دریا سے گذر جائیں، لیکن ان کا دامن بھی تر نہ ہو، وہ جاہ و حشمت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، جو مسلمان امراء دربار جہانگیری میں اعلیٰ عہدوں اور ذمہ داریوں پر فائز ہیں، ان کے دلوں کو چھوؤ، ان کو لکھو کہ "ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام اسوقت موت و زندگی کے آخری مرحلہ سے گذر رہا ہے، آپکو کچھ کرنا چاہئے، جارحانہ طریقہ سے نہیں، بالکل تعمیری، علمی اور فکری طور پر، اور دل کے اعتقاد اور یقین کے ساتھ"

مجدد صاحب نے خط و کتابت شروع کی، ان لوگوں کے ناموں کی فہرست طویل ہے جن سے انھوں نے مراسلت کی، ان میں عبدالرحیم خان خاناں، اور نواب مرتضیٰ خاں (سید فرید) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نتیجہ کیا ہوا؟ ۱۵۔۲۰ برس کے عرصہ میں ماحول بدل گیا، ہندوستانی مسلمان صرف ہندوستان کے لئے نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے مرجع و مرکز بن گئے، روحانیت میں، علم حدیث اور عربی لغت تک میں (جو خالص عرب ملکوں کی چیز تھی) یہ اسی برگزیدہ شخصیت کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی، اور علوم دینیہ کے بلند پایہ ماہر و محقق پیدا ہوئے، پھر چراغ سے چراغ جلا اور کچھ عرصہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ۱۱۱۴ھ۔۱۱۷۶ھ کی شخصیت سامنے آئی، جنھوں نے ایک نیا "**علم کلام**" پیدا کیا، نظام خلافت کی ایسی تشریح و تفصیل، اور صحیح اسلامی حکومت کا خاکہ پیش کیا جو علمی طور پر اس سے پہلے شاید

پیش نہیں کیا گیا تھا، اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کی گرتی ہوئی مسلم حکومت کو (جسکا بدل اسوقت موجود نہیں تھا) سہارا دینے اور اس کے جسم میں نیا خون پہونچانے کی کوشش کی کہ اسکی شکست وریخت سے ہندوستان میں سخت سیاسی واخلاقی انتشار کا خطرہ تھا۔ (۱۸)

ان کے باکمال اور باتوفیق فرزندوں نے (جن میں حضر شاہ عبدالعزیز پیش پیش تھے) اس ملک میں کتاب وسنت کا علم عام کیا، قرآن مجید کے مطالعہ اور فہم کا ذوق پیدا کیا، حدیث کی اشاعت کی، اور عقائد، اعمال ورسوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام انجام دیا۔

اسی سلسلۂ طلائی کی ایک زریں، اور مستحکم کڑی، اصلاح وجہاد، احیائے سنت واحیائے خلافت کی وہ عظیم الشان تحریک تھی جو حضرت سید احمد شہیدؒ ۱۲۴۶ھ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ ۱۲۴۶ھ کی قیادت میں اس برّ عظیم میں شروع ہوئی، اور جس نے انقلاب حال، اسلامی سیرت، دینی حمیت، اور آدم گیری، اور مردم سازی کے وہ نمونے پیش کئے جنھوں نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کردی، اس جماعت نے دعوت واصلاح کے اتنے وسیع اور طویل محاذ پر اپنی جدوجہد جاری رکھی، جس کی نظیر عالم اسلام کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ (۱۹)

پھر عظیم دینی مدارس کا دور آیا، اور دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور وہ دوسرے مدارس جابجا قائم ہوئے، جن کی بنیاد خالص کتاب وسنت کی تعلیم واشاعت پر تھی۔ ان مدارس کے عالی مرتبہ بانیوں، اور مخلص وراسخ العلم فضلاء کی مساعی جمیلہ سے بڑے پیانہ پر عقائد واعمال کی اصلاح ہوئی دینی ذوق اور اسلامی حمیت پیدا ہوئی۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد

نے آزادی کی تحریک، اور ملک کی علمی وادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اوران کی وجہ سے (بعض دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح) مذہب وسیاست کی تفریق کا اصول کامیاب نہیں ہونے پایا، اور ملک کے عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ، علماء واہل دین کی قیادت سے (باغی ہونے کاذکر) ان کی رہنمائی واثرات سے بھی آزاد اور مستغنی نہیں ہو سکے۔

ان علماء کی علمی کاوشوں کی بدولت ہندستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی کہ اگر یمن میں، مراکش میں، کسی شخص کو علم حدیث میں کمال پیدا کرنا مقصود ہوتا تو سیدھا ہندوستان آتا، اسی طرح اگر کسی کو روحانی پیاس بجھانے کا شوق ہوتا، اوروہ تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتا تو ہندوستان کارخ کرتا، مولانا خالد رومی پیدا ہوتے ہیں، عراق اور شام کے شمالی حصہ میں جو ترکی میں داخل ہے، ساری تعلیم وتربیت ان کی شہر زور اور دمشق کی ہے، لیکن جب ان کو اپنی روح کی پیاس بجھانے اور اللہ کی باتوں پر، غیبی حقائق پر، وہ یقین پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا، جو بدیہیات اور ریاضی کے نتائج پر ہوتا ہے تو وہ کہاں گئے؟ وہ اپنے وطن شہر زور سے سیدھے دہلی شاہ غلام علی صاحب (م ۱۲۴۰ھ) کی خانقاہ میں آئے، اوروہاں آکر پڑ گئے، اور یہاں کامیاب ہو کر گئے، اور عراق اور شام اور ترکی کے ملکوں میں انھوں نے اخلاق وروحانیت، اور معارف وحقائق کے دریا بہادیئے اور ایک نئی روح پھونک دی، جس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔

اگرچہ یہ گفتگو ہندوستان کی اصلاحی وتجدیدی تحریکوں تک محدود تھی، لیکن اس میں بیرون ہند، بلکہ مرکز اسلام (جزیرۃ العرب) کی عظیم تحریک، تطہیر عقائد، اور دعوت دین خالص کا ذکر کرنا ضروری ہے، یہ شیخ محمد بن عبد الوہاب

(۱۱۱۵ھ ۱۲۰۶ھ) کی دعوت تھی، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے معاصر ہیں، (۲۱) اس تحریک نے بعض خاص تاریخی وسیاسی اسباب کی بنا پر وہ کامیابی حاصل کی، جو کم مصلحین اور داعیوں کے حصے میں آئی تھی، اس کے نتیجہ میں ایک پوری نسل، ایک وسیع سلطنت، اور ایک مکتبِ فکر پیدا ہوا جسکے اثرات دور دور پھیلے، اسی زمانہ میں یمن میں علامہ محمد بن علی الشوکانی (۱۱۷۲ھ ۱۲۵۰ھ) عسیر میں احمد بن عبداللہ بن ادریس حسنی بانی سلسلۂ ادریسیہ، اور لیبیا میں سید محمد بن علی السنوسی (۱۲۰۶ھ ۱۲۷۶ھ) پیدا ہوئے (۲۲) جنھوں نے اپنے اپنے مقامات پر اصلاح عقائد ورسوم، اشاعت کتاب وسنت، اور مجاہدانہ تربیت وسیرت سازی کا عظیم کام انجام دیا، مغربی مستشرقین ان سب مصلحین کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت وتحریک کا خوشہ چیں اور ان کا بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اسکا ثبوت مشکل ہے، مغربی ذہن اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ قرآن وحدیث کا مخلصانہ مطالعہ ہر دور میں ایسی اصلاحی شخصیتیں پیدا کرتا ہے، جو بگڑے ہوئے حالات، اور فاسد خیالات سے نبرد آزما ہیں، اور اسکا سلسلہ قیامت تک قائم رہیگا اسی کے کچھ بعد علامہ سید جمال الدین افغانی (متوفی ۱۳۱۴ھ۔ ۱۸۹۷ء) نے اسلامی حمیت، اور اتحاد عالم اسلامی کا صور پھونکا، جس سے مصر وشام اور ترکی کے دشت وجبل اور بام ودر گونج اٹھے، انھوں نے اور ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ مصری (م ۱۳۲۳ھ۔ ۱۹۰۵ء) نے اپنے عہد کی ذہین اور بے چین نوجوان مسلم نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ (۲۳)

جہاں تک چودھویں صدی ہجری کا تعلق ہے، مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ کامیابیوں اور ناکامیوں، غلطیوں اور تلافی کی کوششوں، مسلمان قوموں کی

فریب خوردگی اور سادہ لوحی، اور اسی کے ساتھ سیاسی شعور اور بیداری، کثیر التعداد آزاد مسلم ریاستوں اور حکومتوں کے قیام اور اسی کے ساتھ متعدد طاقتور اسلامی تحریکوں کی صدی ہے، اس صدی میں واقعات وحوادث کا جو تنوع اور تضاد نظر آتا ہے، اسکی مثال پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔

اس صدی کا آغاز ہوا تو سلطنت عثمانیہ اپنی پوری وسعت اور کروفر کے ساتھ موجود تھی اور مسلمانوں کے سروں پر خلافت اسلامی کا علم سایہ فگن تھا، مسند خلافت پر سلطان عبدالحمید خاں ثانی ۱۳۲۷ھ۔ ۱۹۰۹ء-۱۸۷۶ء متمکن تھے، جن کی ذات بیسویں صدی کے وسط تک سخت تنقید واعتراض کا نشانہ بنی رہی ہے اور اور مغربی مصنفین نے تو اپنے قلم کی ساری سیاہی ان کے چہرہ کو بدنما اور تاریک دکھانے میں صرف کردی، لیکن پچھلے برسوں میں ان کے متعلق جو تحقیقی مضامین مؤقر عربی وترکی رسائل میں شائع ہوئے ہیں، نیز ان کے روزنامچے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ وہ (اپنی بعض مزاجی خصوصیات اور کمزوریوں کے باوجود جو موروثی سلطنت کا بھی خاصہ ہو سکتی ہے اور اندرونی وبیرونی مخالفتوں اور ان کے گرد پھیلی ہوئی سازشوں کا رد عمل بھی) ایک نہایت صاحبِ غیرت مسلمان حکمران تھے، جن کے عہد میں مغربی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کرنے میں اور یہودی فلسطین کے کسی حصہ پر بھی قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور جنھوں نے ممتاز یہودی وفد کی ساری پیش کشوں اور رشوتوں کو حقارت سے ٹھکرادیا تھا اور زمین سے مٹی کی مٹھی اٹھا کر کہا تھا کہ "بیت المقدس تو بڑی چیز ہے، میں فلسطین کی سرزمین کی اتنی خاک بھی دینے کے لئے تیار نہیں (۲۴)" اور جنھوں نے خلافت اسلامی کے پیکر میں ایک نئی روح اور عالم اسلام میں وحدت

اسلامی ,اور" جامعہ اسلامیہ "کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

دولت عثمانیہ جو تولیت حرمین شریفین کے شرف اور خلافت اسلامیہ کے اعزاز سے مفتخر تھی، اپنی ساری کمزوریوں اور داخلی و خارجی فتنوں اور مہیب سازشوں کے باوجود ملت اسلامیہ کے لئے خواہ وہ کہیں بستی ہو، قوت و عزت کا سر چشمہ اور مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کے لئے ایک آہنی حصار تھی، جس کی موجودگی میں یہ مقامات و ممالک (جن سے مسلمانوں کی عزت و قسمت وابستہ تھی اور ہے) لاوارث آدمی کے مال کی طرح تقسیم نہیں کئے جاسکتے تھے، اس صدی کی ابتدا میں دولت عثمانیہ مشرق میں یمن و عسیر سے لیکر مغرب میں ایک طرف یورپ میں اورنہ والبانیہ، افریقہ میں طرابلس، تونس فزان تک، دوسری طرف جنوب میں اسوان، مصر، برقہ سے لے کر شمال میں بلگیر یہ ریاست ہائے بلقان طرابزون، اور ایڈریانوپل تک وسیع تھی، دولت عثمانیہ کے حدود میں ایشیاء کوچک کا اکثر حصہ، شام (جس میں موجودہ فلسطین، لبنان اور شرق اردن بھی شامل تھے) مصر، جزیرۃ العرب، عراق، جزیرۂ قبرص شامل تھا۔ اور یورپ پر بھی اس "**مرد بیمار**" (۲۵) کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

لیکن مسلمانوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی (جو خلافت اور ایک وسیع مسلم امپائر کی شکل میں انکو خدا نے دی تھی) سلطان عبد الحمید خاں کی ۱۹۰۹ء میں معزولی تو ایسا المناک واقعہ نہ تھا، جس سے تاریخ بدل جائے، وہ اسوقت کے سیاسی حالات یا سلطان کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ان کے بعد علی الترتیب سلطان رشاد، سلطان وحید الدین خاں اور سلطان عباد المجید تخت سلطنت اور خلافت پر متمکن ہوئے، لیکن اصل المناک واقعہ جس سے پورے عالم اسلام کو

ذلت ونکبت کا سامنا کرنا پڑا اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بیت المقدس سے ہاتھ دھونا پڑا، اور بقول مولانا شبلیؒ کے حرم کے سمت بھی صید افگنوں کی نگاہیں اٹھیں " ممالک عربیہ مصر وشام (عظیم) عراق اور افریقہ کی پوری شمالی پٹی براہ راست یابالواسطہ مغربی اقوام وممالک کے زیر حکومت یازیر انتداب آئے اور جس کی سزا کی میعاد (جہانتک مغربی ایشیاء کے عرب ممالک کا تعلق ہے) ابھی ختم نہیں ہوئی، ترکوں کے خلاف وہ اقدام، جو عربوں نے اپنے ممالک کی چالاک عیسائی اقلیت کی سازش کا شکار اور اتحادیوں کے پر فریب وعدوں پر اعتبار اور قومیت عربیہ کے سحر سامری سے مسحور ہو کر پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے موقعہ پر کیا اور جس کے قائد شریف مکہ شریف حسین تھے جنھوں نے ۱۰/ جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اسکے نتیجہ میں ۱۹۱۷ء میں شام وفلسطین ترکوں سے آزاد ہوئے، مصر، برطانوی اقتدار میں چلا گیا، ۹/ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو شریف حسین کے فرزند امیر فیصل اور جنرل النبی دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے، فرنچ جنرل گورد نے فاتح بیت المقدس اور آبروئے اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ "لو صلاح الدین ہم یہانتک آگئے اور ہم نے شام فتح کر لیا، تم کب تک سوتے رہوگے"؟ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق وعرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آچکے تھے۔

سارا عالم اسلام اس صورت حال سے بے چین تھا، اور مسلمان ذلیل، لیکن سب سے زیادہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس پر بے چینی محسوس کی اور اپنے قلبی وذہنی اضطراب کا مظاہرہ کیا، یہی زمانہ ہے جب تحریک خلافت نے (جو اس صدی

کی سب سے بڑی نیم دینی نیم سیاسی تحریک تھی) مسلمان علماء و قائدین مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی قیادت میں (جو اپنی طاقت ور شخصیت، اسلامی حمیت اور جوش خطابت میں عالم اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے) سارے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اس موقعہ پر مسلمانوں کا دل ناسور کی طرح بہا اور ملی احساس کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹا، اس زلزلہ انگیز تحریک سے نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ پورے ملک میں سیاسی شعور اور مغربی اقتدار اور تہذیب سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا، خود گاندھی جی جیسے عظیم ملکی قائد نے اس تحریک کا ساتھ دیا اور اس کے قائدین کے ساتھ ملک گیر دورے کئے۔

لیکن جب ۳ / مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا، تو ہندوستانی مسلمانوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، اور ان کو دنیا تیرہ و تار نظر آنے لگی، اقبال نے اسی موقع پر کہا تھا ؎

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ زمانہ پورے عالم اسلام کے لئے روح فرسا اور ہوش ربا تھا اور ایک طرح سے اسکو ساتویں صدی ہجری کے اس نصف اول سے مماثلت تھی، جس میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالم اسلام کے زرخیز و مردم خیز متمدن اور مرکزی ممالک پر حملہ اور پھر قبضہ کر کے اسلامی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا تھا، لیکن وہ محض ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی، جس کی متمدن و تن آسانی اسلامی دنیا تاب نہ لا سکی، اس کے ساتھ کوئی فکری فلسفہ، کوئی تازہ دم تہذیب اور نئے افکار و اقدار نہ تھے، لیکن مغربی قوموں اور ملکوں کی اس

تاخت کی جو چودھویں صدی کے پہلے ثلث اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی، نوعیت بالکل جدا تھی، اس کے ساتھ نئے فلسفے، نیا نظام تعلیم، نئے افکار واقدار، الحادو تشکیک کا نیا لشکر اور مادیت ومادہ پرستی کا نیا مذہب تھا۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب پیش آیا، جو صرف، تاریخ جغرافیہ اور سیاسی نقشہ کو ہی تبدیل کرنیوالانہ تھا اوروہ اقتصادیات وسیاسیات ہی کے حدود میں محدود نہ تھا، عقیدہ وعمل، اصول ومبادی، اخلاق ومعاشرت بلکہ حیاتِ انسانی اور شعور انسانی کی بنیادوں کو منہدم کرنیوالا اوران کے ملبہ پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنیوالا تھا، اس کی زدسب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں پر پڑنے والی تھی، جو ایک مثبت، متعین اور مختتم دین کے پیرو اور داعی تھے اور جن کے دین کی حقیقت اور فرائض میں "احتسابِ کائنات" کا فریضہ بھی شامل تھا، مگر افسوس ہے کہ ان میں بروقت اس خطرہ کو محسوس کرنیوالے اوراس کا مقابلہ کرنیوالے بہت کم تھے اور انھوں نے اس معاملہ میں اس "فراستِ مومن" کا ثبوت نہیں دیا جو اس سے پہلے اس کم درجہ کے خطرات کو بھانپ لیتی تھی، مغربی عالم اسلام میں ترکی کے سابق وزیر حربیہ اور مومن مجاہد غازی انور پاشا مرحوم نے بالشویکی خطرہ کو صحیح طور پر محسوس کیا، انھوں نے ترکستان کے باشندوں کو منظم کر کے کمیونسٹوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا، ۱۹۲۲ء کو چکن نامی گاؤں کے قریب انھوں نے ایک روسی فوج پر حملہ کیا، غنیم کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس جنگ میں انور پاشا شہید ہوئے، یہ جمعہ کا دن تھااور ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ کی غالبا ساتویں تاریخ تھی۔(۲۶)

اسی انقلاب سے نہ صرف یہ کہ وسط ایشیا کی خالص مسلم آبادی کے

مردم خیز و تاریخ ساز ممالک، روسی و چینی ترکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہاں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو نہ صرف ذہنی و تہذیبی ارتداد بلکہ اعتقادی و ایمانی ارتداد کے خطرے سے دوچار کر دیا اور وہاں اسپین کی وہ تاریخ دہرائی جانے لگی جو نویں صدی ہجری میں پیش آئی تھی بلکہ صرف اس تحتی بر اعظم کو نہیں ممالک عربیہ و مرکز اسلام کو بھی اس تحریک سے متاثر ہونے کے خطرے سے دوچار اور اس کا حلیف یا حریف بننے کا فیصلہ کر دینے پر مجبور کر دیا اور نوبت یہاں تک آئی کہ بعض عرب ممالک (۲۷) نے اس سے صرف اسلحہ، جدید مصنوعات ہی در آمد نہیں کیں، اس کی آئیڈیالوجی اور اس کا فلسفہ بھی در آمد کیا اور اس کے پرجوش حامی اور داعی بن گئے اور ماضی قریب میں اس افغانستان پر بھی اس کا فوجی تسلط ہو گیا، جو اسلامی شجاعت اور حمیت کا معدن و مخزن تھا اور جس نے ہندوستان کو ہر دور میں لائق منتظم، حاکم و قائد اور عالم و درویش مہیا کئے تھے اور جو اسکی آزادی کا پاسبان اور اس کا بیرونی قلعہ تھا اور اس طرح یہ فتنہ عالم آشوب بر صغیر کے دروازہ پر پہونچ گیا۔

لیکن چودہویں صدی کے وسط کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں جب عالم اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی، بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی اور بقول اقبال ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا ۔۔۔ سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے ۔۔۔ تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عالم اسلامی میں ایک طرف نمایاں طریقہ پر سیاسی شعور بیدار ہوا، غیر ملکی اقتدار کے خلاف جا بجا آزادی کا علم بلند کیا گیا، جس کے نتیجہ میں مصر، شام (اپنے

تمام حصوں کے ساتھ) عراق، لیبیا تونس، الجزائر، مراکش آزاد ہوئے، افریقہ میں نئی نئی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، انڈونیشیا اور ملیشیا نے آزادی حاصل کی، پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آیا، ہندوستانی مسلمان نے جنگ آزادی میں شریک ہو کر اور قربانیاں دی کر، سیاسی شعور اور حب الوطنی کا ثبوت دیا، اور بالآخر دنیا کے سیاسی نقشہ پر ۴۵ سے اوپر آزاد مسلم ممالک اور سلطنتیں نمودار ہوئیں، جن میں سے ۴۲ اقوام متحدہ کی ممبر ہیں، اور ان کے جھنڈے یونائیٹڈ نیشن کی پر شکوہ عمارت پر لہرا رہے ہیں، مسلمان اقوام متحدہ میں بھی، اور بین الاقوامی مسائل و مذاکرات میں بھی، اور دنیا کے سیاسی ترازو کے پلڑے میں بھی اپنا ایک خاص وزن رکھتے ہیں، اور اگر انکا سیاسی شعور بالغ اور ان کو اپنی سیاسی طاقت و وزن کا احساس ہو اور وہ متحد ہو جائیں، تو دنیا میں بہت سی ناانصافیوں کو روک سکتے ہیں، بہت سی کمزور اور مظلوم قوموں، اور ملکوں کی مدد کر سکتے ہیں، اگر خدا ان کو خدا ترس، مخلص قائد و سربراہ عطا فرمائے، یا اس کے قائدین اور سربراہان مملکت کو توفیق اور ہدایت نصیب فرمائے، تو وہ ان اسلامی ممالک اور اپنے دائرہ حکومت میں صحیح اسلامی حکومت قائم اور نظام شرعی کو نافذ اور جاری کر سکتے ہیں اور اپنی قلم رو اور حدود حکومت میں وہ معیاری مسلم معاشرہ اور وہ پاکیزہ بلند کردار، اطاعت شعار، ذمہ دار اخلاقی و روحانی ماحول پیدا کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں صرف تاریخ کے صفحات میں صدیوں کے فاصلہ سے نظر آتی ہیں، اور جن سے دنیا یکسر مایوس اور خود مسلمان غافل اور مستغنی ہو چکے ہیں، اور جو آج بھی ذہن انسانی کو چونکانے اور مغرب و مشرق کے بلاکوں کو مسئلہ پر غور کرنے پر مجبور اور اشاعت اسلام کیلئے ایک نیا راستہ ہموار کر سکتا ہے، اسی طرح اگر فرائض و ذمہ داریوں کا مکمل طریقہ پر احساس کریں تو وہ اس انسانیت

کو بھی تباہی سے بچا سکتے ہیں، جس کی قسمت کے مالک بہ زعم خود مغربی و مشرقی بلاک بنے ہوئے ہیں، اسی طرح ہندوستان میں بھی وہ اپنی دانشمندی، اتحاد اور اخلاقی طاقت سے نہ صرف اپنے ملی حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں، بلکہ ہندوستان کو بھی ایک نئی اخلاقی، روحانی قیادت عطا کر کے اس عام تباہی سے بچا سکتے ہیں، جو روز افزوں سیاسی انتشار اور خطرناک اخلاقی بحران کی بنا پر اس کی طرف منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی ہے۔

دوسری طرف عالم اسلام میں وہ چند وسیع و طاقتور، اصلاحی اور فکری اور انقلابی تحریکیں پیدا ہوئیں، جن کی نظیر اپنی وسعت و قوت میں ماضی قریب میں بھی ملنی مشکل ہے، ان تحریکوں کا ایک درخشاں اور امید افزا پہلو یہ ہے کہ وہاں ایک طرف خواص، ذہین (INTELLECTUL) طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور اس طبقہ کو مطمئن کرنے اور اس کا اسلام پر اعتماد بحال کرنے کیلئے واضح اور پرکشش علمی مواد فراہم کرتی ہیں، دوسری طرف ان کا دائرہ جغرافیائی حدود سے آزاد ہے، اور عالم اسلام کے ایک بڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں یہ پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان تحریکوں سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پہلی مرتبہ نہ صرف متاثر، بلکہ اپنے دیرینہ سال ہم مذہبوں کے مقابلہ میں انکا زیادہ پرجوش داعی اور مبلغ ہے، اس سلسلہ میں مصر کی عظیم و جلیل تحریک **"الاخوان المسلمون"** ترکی کی **"نوری تحریک وجماعت"** اردن و فلسطین کی تحریک **"حزب التحریر"** انڈونیشیا کی **"ماشوی پارٹی"** برصغیر کی **"عالمگیر تبلیغی دعوت"** اور **"تحریک جماعت اسلامی"** کو بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے، جن سے خواہ کسی کو کلی اتفاق نہ ہو، انکی اثر انگیزی، اور وسعت و مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ اور نوجوانوں میں اس

ایمان افروزی، ہمت آفرینی اور خود شناسی میں اقبال کے ولولہ انگیز اور خیال افروز کلام کا بھی بڑا دخل ہے، جس کی (اپنی قوت و تاثیر اور عالمگیری میں پچھلی صدیوں کے اسلامی ادب و شاعری میں مثال نہیں ملتی۔

پندرہویں صدی اب پورے عالم میں سایہ فگن ہوگئی ہے، اگر ملت اسلامیہ اور عالم اسلام اس عظیم سرمایہ اور اس اعتقادی، فکری، علمی، سیاسی، طبعی اور انسانی ثروت و صلاحیت، طاقتور تحریکوں اور کثیر التعداد آزاد ملکوں اور وسیع سلطنتوں سے بھی محروم ہوتا، جس کی طرف کچھ مختصر اشارے اوپر کئے گئے ہیں، تب بھی خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کے پاس قرآن مجید کا یہ صحیفہ اور اللہ کا آخری اور ابدی دین (اسلام) موجود ہے، جس کی وجہ سے ہر زمانہ میں ملت کے تن مردہ اور قلب افسردہ میں زندگی کی نئی روح پیدا ہوتی رہی ہے اور معجزات و عجائبات کا ظہور ہوا ہے۔

پھر مسلمان ہی اس دور میں تنہا انسانیت کی امیدوں کی پناہ گاہ، خدا کا آخری پیغام اور انسانیت کے امین و پاسبان ہیں، شاید یہ صدی ایک ایسا فیصلہ کن موڑ لائے جو پورے عالم انسانی پر اثر انداز ہو، اللہ کی رحمت سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، انسانیت کی زبوں حالی، انسانوں کی ذلت و نگوساری اپنے آخری نقطہ پر پہونچ چکی ہے، یہی وقت ہوتا ہے جب رحمت الٰہی بلکہ غیرت الٰہی کو حرکت ہوتی ہے اور دنیا میں کوئی بڑا انقلاب آتا ہے۔

"مغربی تہذیب کو پورے طور پر گھن لگ چکا ہے، وہ اب محض اپنی صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے بلکہ اسلئے کہ بد قسمتی سے کوئی دوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کے لئے تیار نہیں، اسوقت جتنی تہذیبیں یا

قیادتیں ہیں یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر اور اس کی ایک روکھی پھیکی تصویر ہیں یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں، اب اگر اسلامی ممالک اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالم انسانی میں پیدا ہوگا تو اسکو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جاسکتا ہے جو سنت اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے، اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ کیا مغرب کی دائمی حاشیہ برداری، اور کشکول گدائی مناسب ہے یا دنیا کی رہنمائی کا منصب عالی اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سر فرازی اور سر بلندی نہیں، کیا اس کے لئے ظاہری نام نمود، عہدہ و منصب، لذت و راحت اور مادی و جسمانی ترغیبات کی قربانی کوئی حقیقت رکھتی ہے، اگر اس کے لئے سو جانیں بھی قربان کی جائیں تو در حقیقت گھاٹے کا سودا اور زیاں و نقصان کا معاملہ نہیں۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں"(۲۸)

پندرھویں صدی میں عالم اسلام کے لئے دس نکاتی پروگرام

ساتویں صدی اور دسویں صدی ہجری میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے جو واقعات اور اسباب بیان کئے گئے ان سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ کو ہر دور میں ایسے ربانی، حقانی، بیدار مغز، عالی ہمت مصلحین اور داعیوں کی ضرورت ہے جو دعوت الی اللہ اور نفوس قدسیہ کی اصلاح و تقویت کا کام ناسازگار سے ناسازگار

ماحول میں انجام دیں، جب اسلامی حکومتیں زیر وزبر ہو رہی ہوں، مادیت اور خواہشات نفسانی کے سیلاب بلا میں لوگ تنکوں کی طرح بہے چلے جارہے ہوں، مال ودولت کے حصول کی ایک اندھی "ریس" جاری ہو، وہ گرتے ہوئے دلوں کو تھامنے، اللہ تعالیٰ سے انکو جوڑنے اور ان میں تازہ ایمان ویقین، محبت وخوف الہٰی اور اعتماد و توکل پیدا کرنے کے کام میں لگ جائیں وہ لوگوں کو پست اغراض سے بلند رہنے کا سبق دے رہے ہوں، دنیا کے مال ومتاع کی حقارت ان کے دلوں میں جاگزیں کر رہے ہوں، دولت وحشمت اور سلطنت وقوت کے سامنے سرنگوں اور سجدہ ریز ہونے، ضمیر وملت فروشی اور ملکوں اور قوموں کا سودا کرنے سے بیزار اور بالاتر بنائیں، اور عقیدہ واصول کے لئے قربانی اور راہ خدا میں شہادت کی آرزو سینوں میں بیدار کردیں، ناامیدیوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکال کر رحمت ونصرت الہٰی کی روشنی میں لے آئیں، زوال آمادہ اور کرم خوردہ معاشرہ کو ایسے اہل، طاقتور اور امانت دار اشخاص مہیا کریں جو حکومت کی نازک سے نازک ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور اسلام کی سرحدوں کی حفاظت ونگہداشت کرسکیں، یہ وہ ربانی، حقانی لوگ ہیں، جو اپنے اپنے معاشرہ وماحول میں وہ خدمت انجام دیتے ہیں، جو خواجہ حسن بصریؒ نے بنوامیہ کے دور میں اور حافظ ابن جوزیؒ، حجۃ الاسلام غزالیؒ اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے عباسیوں کے دور میں انجام دی تھی۔

ان ربانی اشخاص کا وجود ہر ملک اور ہر زمانہ کی بنیادی ضرورت ہے، وہ اسوقت کامیاب وبامراد ہوتے ہیں، جب حکومتیں ناکام ونامراد ہو جاتی ہیں، (۲۹) ان کا علم دولت واقبال اس وقت بلند ہوتا ہے جب حکومتوں اور طاقتوں کے فلک بوس جھنڈے سرنگوں ہو جاتے ہیں، اسلامی معاشرہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ

ہے کہ وہ ان نفوس قدسیہ سے سراسر محروم ہو جائے، بہت سے وہ اسلامی اور عرب ملک جہاں اللہ تعالیٰ نے رزق اور اپنی نعمتوں کے دہانے کھول دیئے ہیں، وہاں آج بشدت یہ "**دعوتی وروحانی خلاء**" محسوس ہوتا ہے، یہ خلا وسیع تنظیمات، عظیم علمی اداروں، سیاسی واشاعتی سرگرمیوں، فلک شگاف نعروں اور خدمت دین کے بلند بانگ دعووں سے پُر نہیں کیا جاسکتا۔

دینی دعوت اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو کوشش دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں، مختلف انداز سے اور اپنی اپنی بصیرت، تجربے اور حالات کے تقاضہ سے ہو رہی ہیں، ان کو اپنے اپنے مرتبے پر رکھتے ہوئے اور ان کی کسی نہ کسی درجہ میں افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پندرہویں صدی ہجری میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور مسلم معاشرہ کو مزید انحطاط وزوال کے خطرے سے بچانے اور نئی صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ معین نقاط (POINTS) واضح خطوط (LINES) (خواہ ان کی حیثیت اشارات اور عنوانات سے زیادہ نہ ہو) پیش کر دیئے جائیں، شاد با توفیق اور بلند حوصلہ کارکنوں اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے فکر مند جماعتوں کو ان سے کچھ روشنی یا مدد حاصل ہو:۔

ا۔ مسلم عوام میں ایمان و عقیدہ کو طاقت پہونچانے (جس کی چنگاریاں ان کے خاکستر میں بہر حال موجود ہیں) اور ان کے دینی شعور کو بیدار و متحرک بنانے کی ضرورت ہے، ان مسلم عوام کی اسلام کے کے ساتھ وابستگی اور اس کے لئے گرم جوشی (خواہ وہ بعض اوقات حالات و حوادث ہی کا نتیجہ ہو) ایک ایسی بلند مستحکم فصیل اور اسلام کا آہنی حصار ہے۔ جس کی بدولت بہت سی مسلم (یا مدعی اسلام)

قیادتوں اور حکومتوں کو کھل کر کفر کا راستہ اختیار کرنے اور اپنے ملکوں اور ماتحت مسلم قوموں کو کفر کو الحاد کی آغوش میں ڈالدینے کی ہمت نہیں ہوتی اور اسلام ان تمام سازشوں اور منظّم اور وسیع منصوبوں کے باوجود جو اس کو ان ملکوں سے بے دخل کرنے کے لئے اندرون یا بیرون ملک تیار کئے جاتے ہیں، ان ملکوں میں زندہ اور کسی نہ کسی درجہ فعال اور موئثر ہے، خدانخواستہ اگر کسی دن یہ حِصار ٹوٹ گیا اور مسلم عوام کا رشتہ اور ان کی روحانی اور جذباتی وابستگی اسلام سے ختم ہوگئی، تو پھر ان ملکوں میں اسلام کے بقا اور تحفظ کی کوئی ضمانت اور ان قیادتوں (LEADER SHIPS) اور حکومتوں کے کھیل کھیلنے اور اپنے ملکوں کو اسپین اور ترکستان بنادینے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، یہی عوام وہ نرم اور بار آور زمین ہے، جس سے ہر طرح کی قدرتی دولت حاصل کی جاسکتی ہے اور اس پر ہر طرح کے پُر ثمر باغات لگائے جاسکتے اور محل تعمیر کئے جاسکتے ہیں، یہ وہ "**خام مال**"(RAW MA-TERIAL) ہے جس سے بہترین انسانی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں اور مردم سازی اور آدم گری کا کام کیا جاسکتا ہے، صدہا خامیوں اور قابل اصلاح پہلوؤں کے باوجود یہ وہ انسانی مجموعہ ہے، جس پر پیغمبرانہ توجہات اور اہل قلوب اور اہل خلوص کی محنتیں صرف ہوئی ہیں اور وہ آج بھی اپنے خلوص قلب، اپنی محبت اور گرمجوشی اور ایثار و قربانی کے جذبہ اور صلاحیت میں دوسری انسانی جماعتوں اور مذہبی قوموں سے فائق و ممتاز ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی ضرورت ہے کہ ان مسلم عوام اور مسلم ممالک کی مسلم آبادی میں ان صفات کو بھی پیدا کرنے اور اس اسلامی سیرت کو بروئے کار لانے کے لئے بھی سخت جدوجہد کی جائے، جن کی بناء پر انسانی نفوس نصرت

آسمانی اور فتح وکامرانی کے مستحق ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے مخالفتوں اور رکاوٹوں کے پہاڑ گرد وغبار بن جاتے ہیں، مثلاً صحیح عقیدہ، توحید خالص (جو شرک کے ہر شائبہ سے محفوظ) اسلامی سیرت اور اسلامی معاشرہ (جو جاہلی رسم ورواج اور غیر مسلم اقوام کی تقلید سے پاک ہو) اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ کو اس مرض نفاق اور اس "تضاد" سے پاک کیا جائے جو عرصہ سے اس میں سرایت کئے ہوئے ہے اور جو اسلام کی اصل تعلیمات اور مثالی مسلم معاشرہ کے منافی ہے، اسی طرح ان اخلاق وعادات اور نفس امارہ اور دولت وطاقت کے ان اثرات سے بھی اس کو بچانے کی کوشش کی جائے، جن کی بنا پر انبیاء سابقین کی بہت سی امتیں مستحق عذاب اور مورد غضب الٰہی ہوئیں، اسی طرح مغربی اقوام کے ان اخلاقی "جذام" سے بھی ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے، جس میں مغربی تہذیب اور اہل مغرب مبتلا ہیں اور اب وہ چاہتے ہیں کہ مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلم ملکوں میں بھی وہ پوری طرح پھیل جائے۔

لیکن یہ اصلاحی کام ادھورا رہے گا اور اس کے صحیح نتائج ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ مسلمانوں میں صحیح دینی شعور نہ پیدا کیا جائے اور ان کی صحیح ذہنی تربیت نہ ہو، ضرورت ہے کہ ان میں حقائق اور مسائل کا صحیح فہم اور دوست دشمن میں تمیز کی صلاحیت پیدا ہو، ان کا شعور اتنا بالغ اور ان کا دینی فہم اور دوست دشمن میں تمیز کی صلاحیت پیدا ہو، ان کا شعور اتنا بالغ، اور ان کا دینی فہم اتنا عمیق ہو کہ وہ گہرے سیاسی مقاصد رکھنے والے رہبروں، سیاسی بازی گروں اور کھوکھلے نعروں سے دھوکا نہ کھائیں اور عالم اسلام میں پھر ان روح فرسا المیوں (TRADGE-DIES) کا اعادہ نہ ہو، جن میں بعض بڑی پر جوش مسلم قومیں اور ممالک، جاہلی قوم

پرستی (NATIONALISM) یا لسانی (LINGUISTIC) اور ثقافتی (CULTURAL) تعصبات کی آندھیوں میں پتوں کی طرح اڑ گئے اور آسانی کے ساتھ شاطر قیادتوں اور غیر ملکی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی سادگی اور شعور کی ناپختگی کے بھینٹ چڑھ گئے۔ (۳۰)

۲۔ دینی حقائق اور قرآنی و ایمانی اصطلاحات کو، نیز دین کے صحیح تصور اور فہم کو ہر طرح کی تحریف سے بچایا جائے اور ان کو جدید عصری و مغربی تصورات اور سیاسی و اقتصادی نظاموں کے (بے اعتدالی کے ساتھ) تابع اور مطابق بنانے اور اسلام کی خالص سیاسی تشریح و تعبیر اور اسلام کو ایک نظریۂ حیات ثابت کرنے اور عصری فلسفوں اور سیاسی نظاموں کی سطح پر لے آنے میں شدید احتیاط برتی جائے، اس لئے کہ حکومت و اقتدار، نظام و فلسفہ، تغیر و ترقی پذیر چیزیں ہیں، لیکن یہ دینی حقائق اور دین کا صحیح عقیدہ اسلام کی دائمی بنیاد اور وہ نقطہ ہے، جس سے اس کا آغاز و انجام مربوط ہے، انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانہ میں انھیں کی دعوت دی اور انھیں کے راستہ میں ان کی ساری جدوجہد اور جہاد تھا، اسی طرح ہر ایسی چیز سے احتیاط ضروری ہے، جس کی بنیاد "**ایمان بالآخر**" پر نہ ہو اور جس سے حصول رضائے الٰہی کا جذبہ کمزور اور ایمان واحتساب (۳۱) کی روح مضمحل ہوتی ہو اور تقرب الی اللہ زندگی کی اصل غایت نہ ٹھہرتی ہو، نیز جس تعلیم و تلقین اور تفہیم و تشریح سے دور جاہلیت کی بت پرستی (جو ابھی زندہ ہے) اور شرک اور اس کے عام اعمال و مظاہر کی قباحت و نفرت کم ہوتی ہو، اور اس کو دور جاہلیت کی ایسی یادگار سمجھنے کا ذہن پیدا ہو، جس کا زمانہ لد گیا اور جس کی اب اس ترقی یافتہ دور میں کوئی گنجائش نہیں، حالانکہ بقول اقبال۔ ع (۳۲)

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات ومنات

۳۔ ذات نبوی (علیہ الف الف سلام) سے مسلمان کے روحانی اور جذباتی تعلق پیدا ہونے اور برقرار رہنے کی کوشش، دل میں آپ کے لئے گہری محبت اور مسلم معاشرہ میں عشق نبوی پیدا کرنے کی کوشش جو ایک مسلمان کی نظر میں آپکو اہل وعیال، یہانتک کہ اپنی ذات سے زیادہ محبوب بنادے، جیسا کہ صحیح احادیث کے مطابق وہ ایمان کا تقاضہ اور اس کی علامت ہے اور اس بات پر ذہنی طور پر پورا اطمینان اور اعتماد کہ آپ "**ختم الرسل، مولائے کل، دانائے سبل**" ہیں، اور ایسے تمام اثرات سے احتراز جو محبت کے ان سرچشموں کو خشک وپایاب، سنت پر عمل کرنے، اسوۂ رسول کی پیروی اور سیرت کے مطالعہ کے شغف اور اس کے تأثر کو کمزور کردیں، یہی وہ وابستگی اور گرویدگی تھی جس نے عجمی قوموں کو اسلام کے رشتہ سے منسلک اور غیر اسلامی تہذیب اور قومیتوں میں تحلیل ہوجانے سے محفوظ رکھا۔

یہ پہلو اس زمانہ میں ممالک عربیہ کے لئے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے، جہاں پچھلے برسوں میں عرب قوم پرستی کی تحریکوں، عیسائی اور یہودی مصنفین کی کتابوں اور جدید عرب ادیبوں اور ان داعیوں وفضلاء نے جو محبت کے عنصر سے محروم یا مقام "محمد عربی" سے ناآشنا تھے، اس کو اس حد تک کمزور کردی ہے کہ اب اس کے دوبارہ احیاء اور تقویت اور ایک ایسے ایمان افروز وروح پرور اسلامی ادب کی ضرورت پیدا کردی ہے، جس کے پیش کرنے والے ایک عجمی عاشق رسول (اقبالؔ) کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ ؎ (۳۳)

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایت عشق

کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد ست

۴۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اور جن کے ہاتھ میں آج ممالک اسلامیہ کی فکری، تعلیمی قیادت اور ذرائع ابلاغ ہیں، اسلام کی ہر زمانہ میں رہنمائی کرنے، نئے نئے مسائل کا سامنا کرنے، نئی نئی گتھیوں کو سلجھانے اور انسانی قافلہ کو اس کی منزل مقصود پر پہونچانے اور کشتی حیات کو کنارہ لگانے کی صلاحیت پر اعتماد کی بحالی، جو غلط تعلیم اور مغربی افکار کے اثر سے یا تو ختم ہو گیا ہے یا متزلزل ہو چکا ہے، اس طبقہ نے فرض کر لیا ہے کہ اسلام ایک ایسی بیڑی یا ٹارچ ہے جس کا مسالہ ختم ہو گیا ہے یا ایک ایسی بتی ہے، جس کا تیل ختم اور اس کا فتیلہ جل چکا ہے، اس کے دل میں از سر نو یہ اعتقاد اور اعتماد پیدا کرنا کہ اسلام ایک عالمی اور جاوداں پیغام ہے، جس میں زمان و مکان کی کوئی تفریق نہیں، اس کی ہر زمانہ میں کشتی نوح کی حیثیت ہے، جو تنہا غرق ہونے سے بچا سکتی ہے۔

اس اعتماد کا اس طبقہ کے دلوں سے بالکل نکل جانا، یا اس کا کمزور پڑ جانا، اس طبقہ کا وہ اصلی مرض ہے جو اس وقت اس کے اکثر خلافِ اسلام اقدامات اور اصلاحات کا محرک اور اس ذہنی و تمدنی ارتداد کا سبب ہے، جس نے اس وقت پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس کی وجہ سے ان رہنماؤں اور اہل حکومت، اور مسلم عوام کے درمیان وہ عمیق اور عریض خلیج پیدا ہو گئی ہے جو کسی طرح سے پر نہیں ہوتی، اور جس کیوجہ سے ان ملکوں میں ایک شدید ذہنی، تہذیبی اور معاشرتی کشمکش برپا ہے، جو کبھی کبھی بغاوتوں اور انقلابات پر منتج ہوتی ہے۔

۵۔ اسلامی ممالک میں نظام و نصاب تعلیم کی بنیادی تبدیلی اور از سر نو تشکیل، جو ان مسلم اقوام و ممالک کے قدو قامت، قدر و قیمت، پیغام و فرائض اور اغراض و مقاصد سے پوری مطابقت رکھتی ہو اور جو قطعاً کسی دوسرے ملک یا

"**کیمپ**" سے در آمد نہ کی گئی ہو، بلکہ ان مسلمان ماہرین تعلیم اور ماہرین فنون کے اجتہاد و مطالعہ، اسلام کے عمیق و جامع فہم اور بصیرت و تجربہ کا نتیجہ ہو، جو قدیم وجدید اور مشرق و مغرب کے خود ساختہ حدود و خطوط سے بالاتر اور آزاد ہوں، یہ ایک ایسا ضروری کام ہے، جس میں مطلق تاخیر کی گنجائش نہیں، اس کے بغیر یہ اسلامی ممالک اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہو سکتے ہیں نہ اپنے دماغ سے سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں، نہ اپنے عزم وارادہ سے ان ممالک کا نظام چلا سکتے ہیں اور نہ ان ممالک کی دانش گاہیں، ادب و صحافت، اور ذرائع ابلاغ، اسلام کے مزاج و روح اور معاشرہ کی ضرورت کے مطابق فرض انجام دے سکتے ہیں۔ (۳۴)

۶۔ ایک ایسی طاقتور، عالمگیر، علمی و تحقیقی تحریک، جو جدید نسل کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ استوار کر سکے، اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے اور اس حقیقت کو ثابت کر سکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے، جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی اور انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصر حاضر کا وہ "تجدیدی" کام ہے جو سلامی ملکوں اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے اور مغرب زدگی و تجدد کے اس دھارے کو روک سکتا ہے، جو عالم اسلام میں اسوقت پوری طغیانی پر ہے۔

۷۔ اسلامی ممالک اور مسلم معاشرہ میں اس اسلامی تمدن کی کار فرمائی اور جلوہ نمائی کی کوشش جو اسلام کے اصول و مقاصد، طہارت و عفت، اعتدال، ذوق سلیم، قرآنی تعلیمات، اسوۂ رسول، اور قرونِ اولیٰ کی اسلامی زندگی اور اسلام کے

مثالی معاشرہ کے بہت سے محاسن کا جامع ہے، کسی ملک اور قوم کا محض عقائد و عبادات سے وابستہ رہنا اور اس تمدن سے کنارہ کشی اختیار کرلینا جو ان دینی تعلیمات اور اس کے وسیع، جامع اور لچک دار اصول کے ماتحت پروان چڑھا ہو اور کسی اجنبی تمدن کا اختیار کرلینا، دین کو عبادت گاہوں اور مذہبی رسوم (RITUALS) میں محدود، اور ان ممالک کو تہذیبی و معاشرتی ارتداد کے خطرے سے دوچار کردینے کے مرادف ہے، جہاں تک ان مسلم ممالک کا تعلق ہے جو مغربی تہذیب کے زیر اثر ہیں، ان میں دانایانِ فرنگ کی سازش پورے طور پر کامیاب ہوگئی ہے، جنھوں نے ان ممالک کو چند عبادات اور اسلامی شعائر کو چھوڑ کر بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور حکومت کے دفاتر سے لے کر قومی زندگی کے تمام شعبوں اور دائروں، سکونتی مکانات اور ہوٹلوں میں بعض اوقات یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کسی ملک میں ہیں یا کسی خالص مغربی ملک میں، ملی تشخص اور دین کے ساتھ زندہ اور طاقتور ربط کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کا پیدا کیا ہوا مخصوص تمدن اور طرز زندگی بھی ان ملکوں میں کارفرما ہو کہ تمدن اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔(۳۶)

۸۔عالم اسلام کی اس وقت ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی فکری قیادت ابھرے جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور قوت اجتہاد کے ساتھ سامنا کرے اور تہذیب جدید کے مختلف سانچوں، مکاتیب فکر، اور طبقہائے عمل کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جو تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے محفوظ، ظاہری اشکال مظاہر اور سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو، حقائق و وسائل قوت اور مغز کی طرف متوجہ ہو اور اس کے ظاہری خول میں نہ الجھے، مغربی تہذیب اور علوم کے ساتھ خام مال (RAWMATERIAL) کا سا معاملہ کرے اور اس

سے ایک نئی طاقتور تہذیب کی عمارت تعمیر اور زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدے اور اس کے اصول، اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو، یہ وہ انقلاب انگیز اور مجتہدانہ کام ہے، جس کے بغیر عالم اسلام حقیقی طور پر آزاد وخودکار نہیں ہو سکتا۔(۳۷)

۹۔ان حکومتوں کی جو مسلم اکثریت کے ممالک میں دین پسند اور اسلام دوست عناصر سے بر سر پیکار ہیں اور وہاں ایک معنوی واعتقادی نسل کشی (GENOCIDE) کی مہم جاری ہے اور اس پر اس ملک کے قائدین اور حکمرانوں کی (جو کسی فوجی انقلاب کے نتیجہ میں، یا کسی سازش کے ماتحت) حکومت واقتدار میں آگئے ہیں، بہترین توانائیاں صرف ہو رہی ہیں نیز بعض ان عرب ممالک کے سربراہوں کو جو دینی حقائق ومفاہیم اور شرعی احکام ونصوص میں ایسی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، جو ان کے سیاسی اغراض، شخصی کمزوریوں یا غیر ملکی منصوبوں کی کامیابی میں مدد کر سکیں، یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ یہ حکمت عملی بے نتیجہ قومی سالمیت اور استحکام کے لئے مضر اور انتشار انگیز کوشش ہے جو ہر مسلم ملک میں ناکام ہو چکی ہے، ان کو ان مقاصد اور کوششوں کی طرف متوجہ کرنا جو ملک کے لئے حقیقی طور پر مفید اور اس کی طاقت وحفاظت کا ذریعہ ہیں۔

اسی طرح سے ان مسلمان حکومتوں اور ان کے سربراہوں کو جن کے دل میں اسلام کی عزت ومحبت ہے، شریعت اسلامی کے نفاذ اور اسلامی قوانین کے اجراء پر اور اس مقصد کے لئے مناسب فضا اور ماحول تیار کرنے پر آمادہ کرنا اور اس بات کا یقین دلانا کہ یہ تبدیلی خدا کی طرف سے فتح ونصرت اور معاشرہ میں سعادت وبرکت پیدا ہونے کا موجب ہوگی۔

اسی کے ساتھ عالم اسلام میں ایک ایسی مرکزی قیادت کے عالم وجود میں آنے کی فکر وسعی جو "شورائیت" کے اسلامی اصول اور "تعاونوا علی البر والتقوی" کی بنیاد پر قائم ہو اور اپنی اس کوتاہی اور محرومی پر کم سے کم تأسف وندامت کہ اس وقت عالم اسلام خلافت کے اس ضروری ادارے اور اس مبارک نظام سے محروم ہے، جس کے قیام کے مسلمان مکلف بنائے گئے تھے اور جس سے محرومی کا جرمانہ وہ مختلف شکلوں میں ادا کر رہے ہیں۔

۱۰۔ جہاں تک خالص غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے، وہاں اسلام کا ایسا مؤثر اور معقول تعارف اور اس طرح اسلامی دعوت کا پیش کرنا جو اسلام کے مزاج اور اس زمانہ اور ان قوموں کی نفسیات کے مطابق ہے، اس لئے کہ ان ممالک میں (صحیح دین اور روحانی واخلاقی تعلیم کا خلا موجود ہونے اور تہذیب حاضر کی ناکامی کی وجہ سے) اسلام کے لئے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور اس کی اشاعت کا وسیع میدان پایا جاتا ہے۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے، جن میں مسلم اقلیتیں پائی جاتی ہیں، وہاں مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی دینی تعلیم کے آزاد و خود کفیل انتظام، اپنے پرسنل لا کے تحفظ، نئے نئے قوانین کے بارے میں بیدار مغزی اور خودداری کا ثبوت دینے کے ساتھ، ان ممالک کی اخلاقی قیادت کے خلا کو پُر کرنے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جس کو صرف وہی پُر کر سکتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے وہ نہ صرف اپنی افادیت وضرورت ثابت کر سکتے ہیں، بلکہ اس بر سر انحطاط معاشرہ اور ان زوال پذیر ملکوں کے نجات دہندہ اور معمار نو کر ان کے محبوب رہنما اور محترم قائد بھی بن سکتے ہیں اور اس طرح اسلام کے لئے خدمت اور ان مسلمانوں کے لئے عزت

واعتماد کا راستہ کھل سکتا ہے جو مخصوص سیاسی حالات اور گزشتہ تاریخ نے اگر بند نہیں تو سخت دشوار گزار بنا دیا ہے۔

تاریخ انسانی بلکہ درحقیقت نسل انسانی کی اس نئی صدی کے آغاز میں ایسے مردان کار کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی ہے، جو نہ صرف اسلام بلکہ عصر حاضر کی ان ضرورتوں کی تکمیل کریں اور ایسے مجتہدانہ اور جرأت مندانہ اقدامات کریں، جو تاریخ کے دھارے کو بدل دے، زمانہ کا حقیقت شناس، فراخ نظر اور کشادہ دل مورخ قلم ہاتھ میں لئے ہوئے اس انتظار میں ہے کہ وہ ان کارناموں کو سنہرے حروف سے لکھے اور ان کے انجام دینے والوں کو خراج عقیدت ادا کرے۔

حواشی:-

(۱) مثلاً عیسوی تقویم (جنتری) جو ساری دنیا میں رائج ہے حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب ہے، بکرمی جنتری کی جو ہندوستان میں رائج تھی، نسبت بکرماجیت بادشاہ کی طرف ہے، ایران میں اور زردشتیوں کے یہاں یزدگرد ثالث کے دوسنہ مستعمل تھے، ایک اسکی تخت نشینی سے شروع ہوتا تھا دوسرا اسکی موت سے، گریگورین کیلنڈر پوپ گری گوری سیزدہم کی طرف منسوب ہے جو ۱۵۸۲ء سے (باستثنائے روس و یونان) تمام یورپ میں جاری ہے۔

(۲) یہ واقعہ ۱۰ھ کا ہے، حضرت ابراہیم کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی، جب ان کا انتقال ہوا۔

(۳) کتاب الکسوف، صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۹۶۔ (۴) الکامل لابن اثیر ج ۱۲ ص ۱۴۷۔۱۴۸

(۵) گبن ۱۶ (۶) ماخوذ از "چنگیز خاں" از ہیرلڈلیمب ص ۲۶۶

(۷) دعوت اسلام ص ۲۴۰۔۲۴۱ (۸) ایضاً ۲۴۵۔۲۴۶

(۹) دعوت اسلام ص ۲۴۵۔۲۴۶ (۱۰) ایضاً

(۱۱) آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

(۱۲) البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۳ ص ۲۴۰

(۱۳) آرنلڈ کی کتاب میں اس واقعہ پر شیخ کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے "کہ اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے۔

(۱۴) مثلاً تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم

(۱۵) اس رولواری اور صلح کل تحریک میں اسلام کے ساتھ مساویانہ ومنصفانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا، قدرۃً اس مذہب اور فرقہ کا پلہ جھک گیا، جس کا دربار میں رسوخ اور بادشاہ کی طبیعت میں رجحان غالب تھا، "مختصر تاریخ ہند" کے مصنفین۔ ڈبلو۔ ایچ مور لینڈ اور اے۔ سی چٹرجی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ "اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے"۔ ص ۲۵۱

(۱۶) اس اجمال کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی اور "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانی"۔

(۱۷) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم" باب پنجم، مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔

(۱۸) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی

(۱۹) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم، اور "تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ"۔ از ابوالحسن علی ندوی

(۲۰) ان کے تفصیلی تعارف کے لئے راقم کی کتاب "ہندوستانی مسلمان، ایک تاریخی جائزہ" ملاحظہ ہو۔

(۲۱) شیخ محمد بن عبدالوہاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تقریباً ہم عمر ہیں، شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے اور شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ کی، شیخ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم وبدنام مصلح" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔

(۲۲) مشہور مجاہد و مصلح سیدی احمد الشریف السنوسی (امام سنوسی) انہیں محمد بن علی السنوسی کے پوتے تھے، جنہوں نے طرابلس اور برقہ کی جنگ میں ایطالیوں کے چھکے چھڑا دیئے، اور ۳۰ برس تک محض اپنے تربیت یافتہ رفقاء اور تلامذہ کی مدد سے یوروپ کی اس بڑی طاقت کا کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے، وہ سیف وتسبیح، اور قرآن وشمشیر کے بیک وقت حامل تھے، اور ان کا شمار اپنے وقت کے شیوخ کبار، اور اہل اللہ میں سے تھا ۱۳۵۱ھ۔ سن ۱۹۳۳ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حاضر العالم الاسلامی" از امیر شکیب ارسلان۔ ج ۲

(۲۳) پچھلے چند برسوں سے دونوں (استاذ وشاگرد) کی شخصیتیں تنقید وتحقیق کا موضوع بن گئی ہیں، اور ان کے خلاف عربی رسائل اور علمی مجالس میں مضامین اور خطبات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جن کی وجہ سے ان دونوں شخصیتوں کی عظمت اتنی مسلم نہیں رہی ـــ جتنی ربع صدی پہلے تھی، لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ پر ہے کہ ان دونوں نے نوجوانوں کا اسلام کی صلاحیت اور عقلیت پر اعتمادی حال کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے،

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش"۔

(۲۴) یہ روایت میں نے مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کی زبان سے کئی بار سنی، جو اس سلسلہ کے ایک معتبر راوی، اور ثقہ گواہ تھے۔

(۲۵) یوروپ کے مصنفین اور اہل سیاست ترکی سلطنت اور قوم کو مرد بیمار (SICK MAN) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

(۲۶) انور پاشا کے اسلامی جذبات اور ان عظیم خدمات کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو۔ امیر شکیب ارسلان کا (جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھے) وہ ولولہ انگیز مضمون جو ان کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" کے حواشی میں شامل ہے۔

(۲۷) مثلاً شام، عراق، جنوبی یمن۔

(۲۸) واوین کے درمیان کا حصہ مصنف کی کتاب "اسلامیت ومغربیت کی کشمکش" ص ۲۹۳ سے ماخوذ ہے۔

(۲۹) پروفیسر ہٹی (HITTI) نے (جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں نقل کیا ہے) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ :-

> "سیاسی اسلام" کے نازک ترین لمحات میں "مذہبی اسلام" نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں" (HISTORY OF THE AR-ABS, P. 475)

یعنی اسلام نے ایک دین اور جاوداں پیغام کی حیثیت سے کامیابی وکامرانی حاصل کی، جبکہ اسلام ایک نظام حکومت کی حیثیت سے بعض اوقات شکست وہزیمت سے دوچار ہوا، واضح رہے کہ اسلام میں دین وسیاست کی کوئی تفریق نہیں ہے، جیسا کہ ہٹی کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے۔

یہی بات ہالینڈ کے ایک فاضل مؤرخ لوکے گارڈ FREDE LOKKE GAARD نے بھی کہی ہے، وہ لکھتا ہے :-

> "گو اسلام کا سیاسی زوال تو بارہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا"۔

(۳۰) ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "انسانی وتمدنی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق" شائع کردہ "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ" (اردو عربی۔ انگریزی، بنگالی ایڈیشن)

(۳۱) کسی کام کو محض اللہ کے وعدوں پر یقین اور اسکے موعود اجر وثواب کے لالچ میں انجام دینے کو "احتساب" کہتے ہیں۔

(۳۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین"

(اردو، عربی، انگریزی)

(۳۳) ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "الطریق الی المدینہ" یا اس کا ترجمہ "کاروان مدینہ"

(۳۴) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کی اس عنوان پر مستقل تصنیف "نحو التربیۃ الاسلامیہ الحرۃ" یا اردو کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "مغربی نظام تعلیم" اور "زہر کا تریاق" ص ۲۲۰۔۲۳۴

(۳۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "قانون اسلامی کی تدوین جدید کی ضرورت، ص ۲۵۱۔۲۵۵

(۳۶) اس موضوع پر مصنف کا مستقل رسالہ ملاحظہ ہو، "اهمية الحضارة في تاريخ الديانات وحياة أصحابها" (مذاہب کی تاریخ اور انکے پیروؤں کی زندگی میں تمدن کی اہمیت) شائع کردہ دار عرفات رائے بریلی۔

(۳۷) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "عالم اسلام کا سب سے بڑا خلا" ص ۲۷۶۔۲۸۱

(۳۸) ملاحظہ ہو دینی تعلیمی کونسل اترپردیش، اور مسلم پرسنل لابورڈ (مونگیر) کی طرف سے شائع کیا ہوا لٹریچر۔

(۳۹) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "تحریک پیام انسانیت" کے بارے میں ایک اہم انٹرویو، شائع کردہ "حلقۂ **پیام انسانیت**" لکھنؤ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

قادیانیت کا ظہور

اس کا دعویٰ اور دعوت اور اس کے مؤید و سرپرست

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک شاندار تحریر، جو اس موضوع پر ایک بے بہا تحفہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قادیانیت کا ظہور

اس کا دعویٰ اور دعوت اور اس کے مؤید و سرپرست

الحمدلله رب العالمین والصلوٰة والسلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین محمد وآله وصحبه اجمعین.

ختم نبوت انعام خداوندی اور امت اسلامیہ کا امتیاز ہے

یہ عقیدہ کہ دین مکمل ہو چکا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری پیغمبر اور خاتم النبیین ہیں، اور یہ کہ اسلام خدا کا آخری پیغام اور زندگی کا مکمل نظام ہے، ایک انعامِ خداوندی اور موہبت الٰہی ہے، جس کو خدا نے اس امت کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک واضح اور صریح اعلان قرآن مجید کی حسب ذیل آیت ہے۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین(سورۂ احزاب. آیت ۴۰) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ

نہیں ہیں، البتہ اللہ کے رسول ہیں اور (سب) نبیوں کے ختم پر ہیں۔
خاتَم اور خاتِم دونوں کے معنی لغت میں آخر کے ہیں،
خاتِمهم وخاتَمهم ای آخرهم (لسان العرب)
خاتم النبيين ای آخرهم (تاج العروس فی شرح القاموس)
خاتِم البيين وخاتَم النبيين لانه ختم النبوة ای تممها بمجيئه
(مفردات راغب اصفہانی)
هوالذی ختم النبوة بمجيئه (تاج العروس)
خاتم النبيين أی آخر الانبياء (کشاف)
والمعنی أنه لانبی أحد بعده (بحر)
خاتم النبيين بفتح التاء ای آخرهم (معالم التنزیل)
هذه الأية نص فی أنه لانبی بعده، وبذلك وردت الأحاديث المتواترة
عن رسول الله عن جماعة من الصحابة . (تفسير ابن كثير)
ختم نبوت یعنی ذات محمدیؐ پر ہر قسم کی نبوت کا ختم ہو جانا امت کا اجماعی عقیدہ ہے، اور جو اجراء نبوت کا اب بھی قائل ہے، اہل تحقیق نے تصریح کردی ہے کہ وہ اجماع امت سے زندیق بلکہ مرتد ہے۔(۱)
لفظ خاتم میں دو قرأتیں ہیں، امام حسن اور عاصم کی قرأت خاتم بفتح التاء ہے، اور دوسرے ائمہ قرأت خاتم بکسر التاء پڑھتے ہیں، حاصل معنی دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی انبیاء کو ختم کرنے والے، کیونکہ خاتم خواہ بکسر التاء ہو یا بفتح التاء دونوں کے معنی آخر کے ہی آتے ہیں، اور مُہر کے معنی میں بھی یہ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں، اور نتیجہ دوسرے معنی کا بھی وہی آخر کے معنی ہوتے ہیں، کیونکہ مہر کسی چیز پر

بند کرنے کے لئے آخر ہی میں کی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا اور آپ کا آخری پیغمبر ہونا، آپ کے بعد کسی نبی کا دنیا میں مبعوث نہ ہونا اور ہر مدعیٔ نبوت کا کافر کاذب ہونا ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابۂ کرامؓ سے لے کر آج تک ہر دور کے مسلمانوں کا اجماع واتفاق رہا ہے۔ (۲)

ایک یہودی عالم نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس پر بڑے رشک اور حسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ قرآن کی ایک آیت ہے جس کو آپ لوگ پڑھتے رہتے ہیں، اگر وہ ہم یہودیوں کی کتاب میں نازل ہوئی ہوتی اور ہم سے متعلق ہوتی تو ہم اس دن کو جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اپنا قومی تہوار اور یومِ جشن بنا لیتے، اس کی مراد سورۂ مائدہ کی اس آیت،

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً. (سورة المائدة. ۳) (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین صرف اسلام کو منظور فرما کر راضی ہو چکا ہوں۔) سے تھی، جس میں ختم نبوت اور تکمیل نعمت کا اعلان کیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نعمت کی جلالت و عظمت اور اس اعلان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا، صرف اتنا فرمایا کہ ہمیں کسی نئے یومِ مسرت اور تہوار کی ضرورت نہیں، یہ آیت خود ایسے موقع پر نازل ہوئی ہے جو اسلام میں ایک عظیم الشان اجتماع اور عبادت کا دن ہے، اس موقع پر دو دو عیدیں جمع تھیں، یوم عرفہ (۹/ ذی الحجہ) اور روز جمعہ۔ (۳)

ذہنی انتشار سے حفاظت

اس عقیدہ نے اسلام کو انتشار پیدا کرنے والی اور ملت کی وحدت کو پارہ پارہ

کرنے والی ان تحریکات اور دعوتوں کا شکار ہونے سے بچایا جو تاریخ اسلام کی طویل مدت اور عالمِ اسلام کے وسیع ترین رقبہ میں وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہی ہیں، اسی عقیدہ کا فیض تھا کہ اسلام ان مدعیان نبوت اور محرفین دین کا بازیچۂ اطفال بننے سے محفوظ رہا، جو تاریخ کے مختلف وقفوں اور عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوتے رہے، "**ختمِ نبوت**" کے اسی حصار کے اندر یہ ملت ان مدعیوں کی دست برد اور یورش سے محفوظ رہی جو اس ڈھانچہ کو بدل کر ایک نیا ڈھانچہ بنانا چاہتے تھے، اور وہ ان تمام سازشوں اور خطرناک حملوں کا مقابلہ کر سکی، جن سے کسی پیغمبر کی امت اس سے پہلے محفوظ نہیں رہی، اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی دینی اور اعتقادی وحدت اور یکسانی قائم رہی، اگر یہ عقیدہ اور یہ حصار نہ ہوتا تو یہ امت واحدہ ایسی صدہا امتوں میں تقسیم ہو جاتی، جن میں سے ہر اُمت کا روحانی مرکز الگ ہوتا، علمی و تہذیبی سر چشمہ الگ ہوتا، ہر ایک کی الگ تاریخ ہوتی، ہر ایک کے الگ اسلاف اور مذہبی پیشوا اور مقتدا ہوتے، ہر ایک کا الگ ماضی ہوتا۔

ختمِ نبوت کا زندگی اور تمدن پر احسان

عقیدۂ ختم نبوت در حقیقت نوع انسانی کے لئے ایک شرف و امتیاز ہے، وہ اس بات کا اعلان ہے کہ نوع انسانی سن بلوغ کو پہونچ گئی ہے، اور اس میں یہ لیاقت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کو قبول کرے، اب انسانی معاشرہ کو کسی نئی وحی، کسی نئے آسمانی پیغام کی ضرورت نہیں، اس عقیدہ سے انسان کے اندر خود اعتمادی کی روح پیدا ہوتی ہے، اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ چکا ہے، اور اب دنیا کو اس سے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں، اب دنیا کو نئی وحی کے لئے آسمان کی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں سے فائدہ

اٹھانے اور خدا کے نازل کیے ہوئے دین واخلاق کے بنیادی اصولوں پر زندگی کی تنظیم کے لئے زمین کی طرف اور اپنی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت انسان کو پیچھے کی طرف لے جانے کے بجائے آگے کی طرف لے جاتا ہے، وہ انسان کے سامنے اپنی طاقتوں کو صرف کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، وہ انسان کو اپنی جدوجہد کا حقیقی میدان اور رُخ بتاتا ہے، اگر ختم نبوت کا عقیدہ نہ ہو تو انسان ہمیشہ تذبذب و بے اعتمادی کے عالم میں رہے گا، وہ ہمیشہ زمین کی طرف دیکھنے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھے گا، وہ ہمیشہ اپنے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن اور متشکک رہے گا، اس کو ہر مرتبہ ہر نیا شخص یہ بتلائے گا کہ گلشنِ انسانیت اور روضۂ آدم ابھی تک نا مکمل تھا، اب وہ برگ وبار سے مکمل ہوا ہے، (۴) اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ جب اس وقت تک نا مکمل رہا تو آئندہ کی کیا ضمانت ہے؟ اسی طرح وہ بجائے اس کی آبیاری اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے متمتع ہونے کے نئے باغبان کا منتظر رہے گا جو اس کو برگ وبار سے مکمل کرے۔

علامہ اقبال نے یہ حکیمانہ و مبصرانہ بات کہی ہے کہ "دین وشریعت کی بقاء تو کتاب وسنت سے ہے، لیکن امت کی بقاء ختم نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے، اور یہ امت جب ہی تک ایک امت ہے جب تک وہ محمد رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین مانتی ہے، اور یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں۔ (۵)

قادیانیت کی جسارت اور جدت

اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھیں، ان میں قادیانیت کو خاص امتیاز حاصل ہے، وہ تحریکیں یا تو اسلام کے نظام حکومت کے خلاف تھیں یا شریعت اسلامی کے خلاف، لیکن قادیانیت در حقیقت نبوت محمدی کے خلاف ایک سازش

ہے، وہ اسلام کی ابدیت اور اُمت کی وحدت کو چیلنج ہے اس نے ختم نبوت سے انکار کر کے اس سرحدی خط کو بھی عبور کر لیا، جو اس امت کو دوسری امتوں سے ممتاز و منفصل کرتا ہے، اور جو کسی مملکت کے حدود کو حاجز اور حد فاصل بنانے کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں جو ہندوستان کے مشہور اخبار اسٹیٹس مین (STATESMAN) میں شائع ہوا تھا، بڑی خوبی سے قادیانیت کی اس جسارت اور جدت کو واضح کیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

> "اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے، جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول کریمؐ کی ختم رسالت پر ایمان، دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے، اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟ مثلاً برہمو سماج والے خدا پر یقین رکھتے ہیں، اور رسول کریمؐ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، لیکن انہیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں، اور رسول کریمؐ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے، جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کرسکا، ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا

کہ وہ الگ جماعت ہے اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا، لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہون منت ہے، میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں، یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں، یا ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کرلیں، ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو، کہ انہیں سیاسی فوائد پہونچ سکیں۔"(٦)

اُمت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُراز تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ امت آخری اور عالمگیر اُمت ہے، اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس اُمت کا واسطہ رہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری اُمت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس اُمت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پُر از تغیّرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے وہ تاریخ کے کسی گزشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کی بقاء اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان وزمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ ﷺ کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ

تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت اور طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ اُمّت تاریخ عالم میں جیسی مردم خیز ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور اُمّتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت، اور زہر کو جس تریاق کی حاجت تھی وہ اس اُمّت کو عطا ہوا۔ (۷)

ادیان سابقہ میں دعویدارانِ نبوت کی کثرت

یہودی اور مسیحی تاریخ کو پڑھنے والا اس بات کو صاف طریقہ پر دیکھتا ہے، کہ مدعیان نبوت کا کثرت سے پیدا ہونا یہودی دنیا کے لئے اپنے حلقۂ اثر میں اور مسیحی دنیا کے لئے اپنے حلقۂ اثر میں ایک عظیم الشان آزمائش اور فتنہ بنا ہوا تھا، یہ ان کے لئے ایک زبردست بحران (CRISIS) اور ایک اہم مسئلہ (PROBLEM) کی حیثیت رکھتا ہے، راقم کو سب سے پہلے اس کی طرف توجہ علامہ اقبال (اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے) کی تحریر سے منعطف ہوئی، کہ انھوں نے یہ بصیرت افروز اور عمیق نکتہ لکھا ہے کہ ختم نبوت اس امت کا طرۂ امتیاز اور اس کے حق میں نعمت عظمیٰ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ عظیم الشان نعمت عطا فرمائی ہے کہ ختم

نبوت کا مختتم اعلان کر دیا، گویا انسانوں کو یہ بتایا کہ اب تمہیں بار بار وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف دیکھنا نہیں ہے، اب زمین کی طرف دیکھو، اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں زمین کو (جس میں تم خلیفۃ اللہ فی الارض) بنائے گئے ہو، آباد کرنے اور اپنی صلاحیتوں سے انسانوں کی قسمت بدلنے، سہولت بہم پہنچانے اور ان کے لئے وہ ماحول مہیا کرنے میں صرف کرو، جو ان کو نجات اخروی اور سعادتِ دُنیوی کے حصول میں معاون ہو، اب تم اپنی توانائی اس میں ضائع نہ کرو کہ ہر تھوڑے وقفہ کے بعد آسمان کی طرف دیکھا کرو کہ کوئی نیا نبی تو نہیں آرہا ہے، کوئی نیا الہام تو نہیں ہو رہا ہے؟ آسمان سے براہ راست کوئی نئی رہنمائی ہونے والی ہے؟ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ ختم نبوت ایک ایسی نعمت ہے جس نے اس امت کو انتشار ذہنی کشمکش اور جعل سازوں کی سازشوں کا شکار ہونے سے بچالیا۔ (۸)

راقم نے اسی روشنی میں یہودیت اور مسیحیت کی تاریخ براہ راست پڑھنی شروع کی تو اس نے دیکھا کہ یہودی اور مسیحی علماء سر پکڑ کر (اور اس میں مبالغہ یا غلط بیانی نہیں) رو رہے ہیں، اور اس پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں، کہ ہم کیا کریں؟ عجیب مصیبت ہے، روز ایک نیا مدعی نبوت پیدا ہوتا ہے، اس کو صادق و کاذب ثابت کرنے کے لئے کوئی پیمانہ چاہئے اور وہ بھی ایسا ہونا چاہئے کہ جو سب کی سمجھ میں آئے، ہماری طاقت اور ذہانت اسی میں صرف ہو رہی ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ فلاں جعلی مدعی نبوت ہے، فلاں دجال و کذاب ہے، صدیوں تک یہودی اور مسیحی دنیا اس آزمائش میں مبتلا رہی ہے۔

یہاں معتبر یہودی و عیسائی مآخذ کے صرف دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں، امریکی برطانی جیوش ہسٹاریکل سوسائٹی کا ایک فاضل رکن ــ ALBERT

M. SAYMSON) البرٹ ایم سائمسن انسائیکلو پیڈیا مذاہب واخلاق میں لکھتا ہے :۔

"یہودی حکومت کی آزادی سلب ہو جانے کے بعد پچھلی چند نسلوں تک بہت سے خود ساختہ مسیحاؤں کا ذکر یہود کی تاریخ میں ملتا ہے ، جلاوطنی کے تاریک ترین زمانوں میں امید اور خوشخبری کے یہ پیغام بر، خود ساختہ قائدین کی حیثیت سے یہود کو ان کے وطن (جہاں سے ان کے آباء واجداد نکال باہر کئے گئے تھے) واپس لے جانے کی امیدیں دلاتے رہتے تھے ، اکثر اوقات اور خصوصاً قدیم زمانہ میں ایسے "مسیح" ان مقامات پر اور ایسے زمانہ میں پیدا ہوتے تھے جہاں یہود پر ظلم وستم انتہا کو پہنچ جاتا تھا، اور اس کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا ہو جاتے تھے ، اس قسم کی تحریکیں عموماً سیاسی نوعیت کی حامل ہوا کرتی تھیں ، خصوصاً بعد کے زمانہ میں تو تقریباً ہر تحریک کا یہی رنگ تھا، اگرچہ یہ تحریکیں مذہبی عنصر سے کم عاری ہوا کرتی تھیں ، لیکن اکثر ان کے بانی بدعات کو فروغ دے کر اپنی سیادت کا دائرہ اور اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے ، جس کے نتیجہ میں یہودیت کی اصل تعلیمات کو بہت نقصان پہنچتا تھا، نئے نئے فرقے جنم لیتے اور پھر بالآخر عیسائیت یا اسلام میں ضم ہو جاتے تھے"۔(۹)

مدرسہ دینیات میں یونانی، رومی اور مشرقی کلیسا کی تاریخ کے پروفیسر ہارٹ فورڈ

مسیحیت کو پیش آنے والے اس ابتلاء کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"ان جھوٹے نبیوں کے ظہور نے جو ماورائی حکمت (SUPERIOR WISDOM) کے مدعی ہوتے تھے، بہت جلد بے اعتمادی پیدا کردی اور کلیساؤں اور ان کے رہنماؤں کو اس خطرہ کا احساس دلایا جو ان کی فلاح و بہبود کے گرد منڈلا رہا تھا، تاہم ابھی کوئی ایسا تادیبی طریقہ وجود میں نہیں آیا تھا جو جانا پہچانا بھی ہوتا، اور ان مکاروں کا زور بھی ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جنہیں یہ دعویٰ تھا کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے اور انکے بذریعہ وحی اپنے رازہائے سربستہ منکشف کرتا ہے، ابھی تک ایسا کوئی معیار نہیں دریافت ہو پایا تھا جس کے ذریعہ ان مدعیانِ روحانیت کی صداقت کا امتحان لیا جاسکتا، ایسے معیار کا دریافت ہونا قطعاً ضروری تھا، اور اگر یہ دریافت نہ بھی ہوتا تو بھی کلیسا اس کی تخلیق کرکے رہتا تاکہ اس کے ذریعہ مذہب کو بنیادی اصولوں میں انتشار اور زندگی کو الحاد کے راستہ پر جاپڑنے سے بچاسکے اور اس طرح خود اپنی حفاظت کا انتظام کرسکے"۔(۱۰)

قادیانیت کا وجود اور اس کا اصل محرک وسرپرست

علمی اور تاریخی حیثیت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ قادیانیت فرنگی سیاست کے بطن سے وجود میں آئی ہے، صورت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے رُبع اوّل میں ہندوستان کے مشہور و معروف مجاہد حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ۔

۱۸۳۰ء نے جو جہاد کی تحریک چلائی، اس سے مسلمانوں میں جہاد اور قربانی کی آگ بھڑک اٹھی، ان کے سینوں میں اسلامی شجاعت اور حوصلہ مندی موجزن ہونے لگی، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں سر ہتھیلیوں پر لئے ہوئے اس تحریک کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، جس کی سرگرمیاں برطانوی حکومت کے لئے پریشانی اور تشویش کا باعث تھیں۔

معتبر تاریخی روایات اور معاصر باخبر شخصیتوں کی شہادت ہے کہ سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت و توبہ کرنے والوں کی تعداد ۳۰ لاکھ تھی، اور ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہونچتی ہے، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے قائم ہونے کے خطرہ کا سب سے پہلے احساس (سلطان ٹیپو شہید ۱۲۱۳ھ۔ ۱۷۹۹ء کے بعد) انہیں کو اور ان کی جماعت کو ہوا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے (جس کو غدر سے تعبیر کیا جاتا ہے) بہت پہلے ان کو اس خطرہ کا مقابلہ کرنے اور ملک کو اس سے بچانے کی ضرورت کا احساس ہوا، انہوں نے اس وقت کے مہاراجہ گوالیار دولت راؤ سندھیا اور ان کے وزیر ہندو راؤ کو جو خط لکھا اس میں صاف طور پر تحریر فرمایا:۔

> "یہ بیگانگان، بعید الوطن، و تاجران متاع فروش ہمارے ملک پر قابض ہوتے جارہے ہیں، آیئے ہم آپ مل کر ان کا مقابلہ کریں اور ملک کو اس خطرہ سے محفوظ کریں پھر بعد میں دیکھا جائے گا کہ کون سی ذمہ داری کس کے سپرد کی جائے، اور کس کو کیا اختیار دیا جائے۔" (۱۱)

انگریزی اقتدار کا مقابلہ کرنے میں بھی بہت بڑا ہاتھ ان کی جماعت کے

مجاہدین کا تھا۔(۱۲)

واقفین جانتے ہیں کہ اس بیعت سے عقیدہ کی تصحیح، توحید خالص، اتباع سنت عمل بالشریعت اور تزکیۂ نفس کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ اور عزم بھی واضح اور طاقت ور طریقہ پر پیدا ہوتا تھا۔

اس کی ایک مثال اور ثبوت یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے افواج کے کمانڈر جرنل بخت خاں جن کے سپرد خاص طور پر انگریزی افواج سے جنگ اور مقابلہ کی ذمہ داری تھی، کہتے ہیں کہ میں جب سید صاحبؒ کے مشہور اور جلیل القدر خلیفہ مولانا کرامت علی جونپوری سے بیعت ہوا تو انہوں نے بیعت کے دوران مجھ سے یہ وعدہ بھی لیا کہ میں انگریزی افواج سے جنگ بھی کروں گا۔

ہندوستان میں نوخیز انگریزی اقتدار کے اس جماعت کے مجاہدین سے خوف وخطرہ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۲ر مئی ۱۸۶۴ء کو انبالہ عدالت میں انگریز جج ایڈورڈس نے مولانا یحیٰ علی عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی محمد جعفر تھانیسری اور مولانا عبدالرحیم صادق پوری کو حکومت انگریزی کے خلاف سازش اور جدوجہد کی بنا پر پھانسی دیئے جانے کا حکم سنایا، لیکن یہ حکم سن کر ان کے چہرے پر ایسی مسرت ظاہر ہوئی کہ مجمع دیکھ کر حیران رہ گیا، جب ایک انگریز افسر نے اس کی وجہ دریافت کی اور کہا کہ "میں نے آج تک ایسا منظر نہیں دیکھا کہ پھانسی کا حکم سنایا جائے اور پھانسی پانے والے ایسے خوش اور مطمئن ہوں"، اس پر مولوی محمد جعفر صاحب نے جواب دیا کہ ہمیں اس کی خوشی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ہمیں شہادت کی نعمت نصیب فرمائی، تم بے چاروں کو اس کا مزا کیا معلوم؟ دوسرے دونوں ملزموں نے بھی اسی مسرت کا اظہار کیا، پھانسی گھر میں بھی ان

چاروں ملزموں کے مسرت وبشاشت کا یہی حال تھا۔

انگریز ان قیدیوں کے سرور ونشاط کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے، اور ان سے پوچھتے کہ تم موت کے دروازہ پر ہو، اور کچھ دن میں تم کو پھانسی ہونے والی ہے، لیکن تمہارے اوپر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، وہ جواب دیتے کہ اس شہادت کی وجہ سے جس کے برابر کوئی نعمت وسعادت نہیں، یہ حضرات کچھ عرصہ پھانسی گھر میں رہے اور انگریز حکام کے لئے یہ مسئلہ ایک معمہ بن گیا، بالآخر ایک دن انبالہ کا حاکم ضلع (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) جیل میں آیا اور اس نے ان تینوں کو خطاب کر کے کہا:۔

"اے باغیو! چونکہ تم پھانسی کے خواہش مند ہو اور اس کو راہ خدا میں شہادت سمجھتے ہو اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم اپنی دلی مراد کو پہونچو اور خوشی سے ہمکنار ہو، اس لئے ہم پھانسی کا حکم تبدیل کر کے تم کو جزائر انڈمان میں عمر قید (حبس دوام بعبور دریائے شور) کی سزا دیتے ہیں"۔

مولانا یحییٰ علی نے چار سال کے بعد جزائر انڈمان کے پورٹ بلیر میں وفات پائی، مولوی محمد جعفر تھانیسری ۱۸ سال قید بامشقت کے بعد رہا ہوئے، مولانا احمد اللہ صاحب رہا ہو کر ہندوستان آئے۔

ادھر کچھ عرصہ کے بعد سوڈان میں شیخ احمد سوڈانی نے جہاد اور مہدویت کا نعرہ بلند کیا جس سے سوڈان میں برطانیہ کا اقتدار تزلزل میں آگیا، اس کو معلوم تھا کہ یہ چنگاری اگر بھڑک اٹھی تو پھر قابو میں نہیں آئے گی، اور پھر سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی کو اس نے پھیلتے اور مسلمانوں میں مقبول ہوتے دیکھا، انگریزی حکومت نے ان سب خطرات کو محسوس کیا، اس نے مسلمانوں کے مزاج

وطبیعت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اس کو معلوم تھا کہ ان کا مزاج دینی مزاج ہے، دین ہی انہیں گرماتا ہے، اور دین ہی انہیں ٹھنڈا کر سکتا ہے، لہٰذا مسلمانوں پر قابو پانے کی واحد شکل یہ ہے کہ ان کے عقائد پر اور ان کے دینی میلان اور نفسیات پر قابو پایا جائے، مسلمانوں کے مزاج میں درخور حاصل کرنے کے لئے دین کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔

اس مقصد کے لئے برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں ہی میں سے کسی شخص کو ایک بہت اونچے دینی منصب کے نام سے ابھارا جائے کہ مسلمان عقیدت کے ساتھ اس کے گرد جمع ہو جائیں، اور وہ انہیں حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کا ایسا سبق پڑھائے کہ پھر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہ رہے، یہ حربہ تھا جو برطانوی حکومت نے اختیار کیا کیونکہ مسلمانوں کا مزاج بدلنے کے لئے کوئی حربہ اس سے زیادہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی، جو ذہنی انتشار کے مریض تھے (۱۳) اور بڑی شدت سے اپنے دل میں یہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ ایک نئے دین کے بانی بنیں، ان کے کچھ متبعین اور موافقین ہوں، اور تاریخ میں ان کا ویسا ہی نام اور مقام ہو جیسا جناب رسول اللہ ﷺ کا ہے، انگریز کو اس کام کے لئے موزوں شخص نظر آئے اور گویا انہیں ان کی شخصیت میں ایک ایجنٹ مل گیا جو ان کے اغراض کے لئے مسلمانوں میں کام کرے، چنانچہ انہوں نے بڑی تیزی سے کام شروع کیا، پہلے منصب تجدید کا دعویٰ کیا پھر ترقی کر کے امام مہدی بن گئے، کچھ دن اور گزرے تو مسیح موعود ہونے کی شہادت دی، اور آخر کار نبوت کا تخت بچھا دیا، اور انگریز نے جو چاہا تھا وہ پورا ہو گیا۔

ان بزرگ نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا اور انگریز نے بھی اس تحریک کی سرپرستی میں کوئی کمی نہیں کی، اس کی حفاظت بھی کی، اور ہر طرح کی سہولتیں اس کام میں بہم پہونچائیں، مرزا صاحب نے بھی گورمنٹ کے ان احسانات کو فراموش نہیں کیا، اور ہمیشہ وہ اس بات کے معترف رہے کہ ان کا نمود برطانیہ عظمیٰ کا رہین منت ہے، چنانچہ اپنی ایک تحریر میں خود کو حکومت برطانیہ کا **"خود کاشتہ"** پودا قرار دیا ہے، وہ اپنی اس درخواست میں جو لفٹنٹ گورنر پنجاب کو ۲۴ر فروری ۱۸۹۸ء میں پیش کی تھی لکھتے ہیں :۔

"یہ التماس ہے کہ سرکارِ دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کے متواتر تجربہ سے، ایک وفادار، جاںنثار خاندان ثابت کر چکی اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات (۱۴) میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کی خیر خواہ اور خدمت گزار ہے، اس خود کاشتہ پودا کی نسبت نہایت حزم واحتیاط اور تحقیق وتوجہ سے کام لے، اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائیے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں"۔ (۱۵)

اور ایک جگہ اپنی وفاداریوں اور خدمت گزاریوں کو گناتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید

اور حمایت میں گزرا ہے، اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریز کی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھا کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں، میں نے ایسی کتابوں کو تمام عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچادیا ہے"۔(١٦)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہونچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں، تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیر دوں، اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال "**جہاد**" وغیرہ کو دور کردوں، جو ان کی دلی صفائی اوز مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں"۔(١٧)

اوزاسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :۔

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھتے جائیں گے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے"۔(١٨)

ایک جگہ اور کہتے ہیں کہ :۔

"میں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس

غرض سے تالیف کی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے ہرگز جہاد درست نہیں، بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے، چنانچہ میں نے یہ کتابیں بصرف زر کثیر چھاپ کر بلاد اسلام میں پہنچائی ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک (ہندوستان) پر بھی پڑا ہے، اور جو لوگ میرے ساتھ مریدی کا تعلق رکھتے ہیں، وہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جاتی ہے کہ جن کے دل اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی سے لبالب ہیں، ان کی اخلاقی حالت اعلیٰ درجہ پر ہے، اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ تمام ملک کے لئے بڑی برکت ہیں، اور گورنمنٹ کے لئے دلی جاں نثار۔" (۱۹)

مرزا غلام احمد صاحب کی اس تحریک اور ان کی اس جماعت نے انگریزی حکومت کے لئے بہترین جاسوس اور بڑے سچے دوست اور جاں نثار فراہم کئے، اس گروہ کے بعض چیدہ اشخاص نے ہند اور بیرون ہند میں انگریزی حکومت کی بیش قیمت خدمات انجام دیں اور اس سلسلہ میں جانی قربانی تک سے دریغ نہیں کیا، جیسے عبداللطیف صاحب قادیانی جو افغانستان میں مذہب قادیانی کی تبلیغ اور جہاد کی مخالفت کرتے تھے، ان کو حکومت افغانستان نے قتل کیا، کیونکہ ان کی دعوت سے اس بات کا خطرہ تھا کہ افغان قوم کا وہ جذبۂ جہاد اور حوصلۂ جنگ فنا ہو جائے، جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہے، ایسے ہی ملا عبدالحلیم قادیانی اور ملا نور علی قادیانی اسی انگریزی حکومت کے لئے افغانستان میں فنا کے گھاٹ اترے، کیونکہ ان کے پاس سے حکومت افغانستان کو کچھ ایسے خطوط اور کاغذات دستیاب ہوئے جن سے

صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں برطانوی حکومت کے ایجنٹ ہیں، اور حکومت افغانستان کے خلاف سازش میں مشغول ہیں، جیسا کہ افغانستان کے وزیر داخلہ کے ۱۹۲۵ء کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے، اور قادیانیوں کے سرکاری اخبار "**الفضل**" نے اپنی ۳/مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں اس بیان کو نقل کیا، اور اس قربانی پر بڑے فخریہ انداز میں تبصرہ کیا۔

علیٰ ہذا قادیانی جماعت اپنے دور آغاز سے اب تک برابر تمام قوم پرور وطن دوست تحریکات سے کنارہ کش رہی، ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں نہ مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں اس نے کوئی حصہ لیا، نہ ان کے بعد، اور صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں کی چودھراہٹ میں پوری قزاقوں کی ٹولی (مستعمرین) کے ہاتھوں عالم اسلام پر جو مصائب ٹوٹ رہے تھے، وہ ان کے لئے موجب غم نہیں، باعث مسرت تھے، انھیں کبھی عام زندگی سے، اسلامی مسائل سے یا ان اسلامی تحریکات سے جو اسلامی حمیت یا سیاسی شعور کا نتیجہ تھیں، کوئی دلچسپی نہیں رہی، انکا کام ہمیشہ مذہبی مباحثہ اور موشگافیاں تھیں، اور ان کی دلچسپیوں کا دائرہ صرف وفات مسیح، نزول مسیح، حیات مسیح، اور نبوت مرزا غلام احمد پر مباحثوں اور مناظروں تک محدود رہا۔

مرزا صاحب کا خاندان انگریزی حکومت سے جو پنجاب میں نئی نئی قائم ہوئی تھی، شروع سے فرماں بردارنہ مخلصانہ تعلق رکھتا تھا، اس خاندان کے متعدد افراد نے اس نئی حکومت کی ترقی، اور اس کے استحکام میں جاں بازی اور جاں نثاری سے کام لیا تھا، اور بعض نازک موقعوں پر اس کی مدد کی تھی، مرزا صاحب کتاب البریہ کے شروع میں "**اشتہار واجب الاظہار**" میں لکھتے ہیں:۔

"میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے، میرا والد مرزا مرتضیٰ گورمنٹ کی نظر میں وفادار خیر خواہ آدمی تھا، جن کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی، اور جن کا ذکر مسٹر گرائفن صاحب تاریخ رئیسان پنجاب میں ہے، اور ۱۸۵۷ء میں انھوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کو مدد دی تھی، یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیئے تھے، ان خدمات کی وجہ سے جو چھٹیات خوشنودی حکام انکو ملی تھی، مجھے افسوس ہے کہ بہت سی ان میں سے گم ہوگئیں، مگر تین چھٹیات جو مدت سے چھپی ہیں، ان کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں، میرے دادا صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا، اور جب تموں کے گزر پر مفسدوں کا سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا، تو سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا"(۲۰)

وفات

مرزا غلام احمد صاحب نے جب ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا (۲۱) پھر ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ تو علمائے اسلام نے ان کی تردید اور مخالفت شروع کی، تردید اور مخالفت کرنے والوں میں مشہور عالم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مدیر "اہل حدیث" پیش پیش اور نمایاں تھے، مرزا صاحب نے ۵/اپریل

۱۹۰۷ء میں ایک اشتہار جاری کیا جس میں مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

"اگر میں ایسا ہی کذاب و مفتری ہوں جیسا کہ اکثر اوقات آپ اپنے ہر ایک پرچہ میں مجھے یاد کرتے ہیں، تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مفسد اور کذاب کی بہت عمر نہیں ہوتی اور آخر وہ ذلت اور حسرت کے ساتھ اپنے اشد دشمنوں کی زندگی میں ہی ناکام و ہلاک ہو جاتا ہے، اور اس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہوتا ہے، تاکہ خدا کے بندوں کو تباہ نہ کرے۔"

اور اگر میں کذاب و مفتری نہیں ہوں اور خدا کے مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہوں اور مسیح موعود ہوں تو میں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ سنت اللہ کے موافق آپ مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے، پس اگر وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں سے نہیں بلکہ خدا کے ہاتھوں سے ہے یعنی طاعون، ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں وارد نہ ہوئیں تو میں خدا کی طرف سے نہیں"۔

اس اشتہار کے ایک سال بعد ۲۵۔ مئی ۱۹۰۸ء مرزا صاحب بمقام لاہور بعد عشاء اسہال میں مبتلا ہوئے، اسہال کے ساتھ استفراغ بھی تھا، رات ہی کو علاج کی تدبیر کی گئی۔ لیکن ضعف بڑھتا گیا اور حالت دگرگوں ہو گئی۔ بالآخر ۲۶ر مئی ۱۹۰۸ء سہ شنبہ کو دن چڑھے آپ نے انتقال کیا، مرزا صاحب کے خسر میر ناصر نواب صاحب کا بیان ہے:۔

حضرت مرزا صاحب جس رات کو بیمار ہوئے اس رات کو میں اپنے مقام پر جا کر سو چکا تھا۔ جب آپ کو بہت

تکلیف ہوئی تو مجھے جگایا گیا تھا، جب میں حضرت صاحب کے پاس پہنچا تو آپ نے مجھے خطاب کر کے فرمایا:۔

"میر صاحب! مجھے وبائی ہیضہ ہو گیا ہے، اس کے بعد آپ نے کوئی ایسی صاف بات میرے خیال میں نہیں فرمائی، یہاں تک کہ دوسرے دن ۱۰ بجے کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا"

جبکہ مولانا ثناء اللہ صاحب نے مرزا کی وفات کے پورے چالیس برس بعد ۱۵/ مارچ ۱۹۴۸ء میں (۸۰) اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

حواشی

(۱) تفسیر ماجدی از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، کراچی

(۲) مستفاد از "**معارف القرآن**" جلد ہفتم از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مطبوعہ ربانی بکڈپو، دہلی۔

(۳) روایت صحیح بخاری، کتب صحاح وسنن، حدیث کے الفاظ مسند امام احمد بن حنبل کے ہیں، حدیث مذکور حسب ذیل ہے، جاء رجل من اليهود إلى عمربن الخطاب رضى الله عنه فقال: ياامير المومنين انكم تقرئون اية فى كتابكم لوعلينا معشر اليهود نزلت لاتخذنا، ذلك اليوم عيداً ، قال ، واى آية ؟ فقال قوله: "اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى " فقال عمر رضى الله تعالىٰ عنه ، والله انى لأعلم اليوم الذى نزلت على رسول الله ﷺ والساعة التى نزلت فيها على رسول الله ﷺ ، عشية عرفة يوم الجمعة .

(۴) ملاحظہ ہو مرزا صاحب کا شعر۔

روضۂ آدم کہ تھا وہ نامکمل اب تلک میرے آنے سے ہوا کامل بجملہ برگ وبار

(۵) علامہ محمد اقبال کا مقالہ جواب مضمون پنڈت جواہر لال نہرو، ملاحظہ ہو۔ (ISLAM AND AH-MADISM)

(۶) حرف اقبال "**قادیانیت تحلیل وتجزیہ**"

(۷)ان محافظین دین اور مجددین و مصلحین کی نمایاں شخصیتوں، ان کے نام اور کام کو جاننے کے لئے راقم کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵ کا مطالعہ کافی ہوگا۔

(۸)تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علامہ اقبال کے مدراس کے لکچرز (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

(۹) (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS)

(۱۰)(ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS) (VOL. Xp. 383)

(۱۱)ملاحظہ ہو"سیرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲)تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سر ولیم ہنٹر کی کتاب(OUR INDIAN MUSALMANS)

(۱۳)اس شخص میں تین ایسی چیزیں بیک وقت جمع تھیں، جنہیں دیکھ کر ایک مؤرخ یہ فیصلہ نہیں کرپاتا کہ ان میں اہم ترین اور حقیقی سبب کسے قرار دیا جائے، جس نے ان سے یہ ساری حرکات سرزد کروائیں، (۱) دینی رہنمائی کے منصب پر پہنچا جائے اور نبوت کے نام سے پورے عالم اسلامی پر چھایا جائے (۲) وہ مالیخولیا جس کے بار بار تذکرہ سے ان کی ان سے متعلق اس کے ماننے والوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں (۳) مبہم اور غیر واضح قسم کے سیاسی اغراض و مفادات اور سرکار انگریزی کی خدمت گزاری اور نمک حلالی۔

(۱۴) خطوط (۱۵) تبلیغ رسالت جلد ہفتم ص ۱۹ (۱۶)"تریاق القلوب" از مرزا قادیانی

(۱۷)ضمیمہ شہادۃ القرآن از مرزا طبع ششم (۱۸)ضمیمہ شہادۃ القرآن از مرزا طبع ششم

(۱۹)عریضہ بعالی خدمت عالیہ انگریزی من جانب مرزا غلام احمد۔

(۲۰) ملاحظہ ہو حاشیہ کتاب البریہ (ص ۱۴۲۔ ص ۴۴)

(۲۱)تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو" **سیرۃ المہدی** " باب ثانی فصل دوم

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

طالبان علوم نبوت کا مقام

اور

ان کی ذمہ داریاں

یہ مضمون مارچ ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا اور بعد مین رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔اس مضمون میں دینی مدرسہ کا حقیقی منصب و مقام اور اس کے طلبہ و فضلاء کے فرائض و ذمہ داریاں بتلائی گئی ہیں، اوران کو آگاہ کیا گیا ہے کہ عصر جدید ان سے کس قسم کی توقعات رکھتا ہے، اور اس دور میں دین کی دعوت اور خدمت کے لئے ان کو کس قسم کی تیاریوں کی ضرورت ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طالبان علوم نبوت کا مقام

اور

ان کی ذمہ داریاں

رب اشرح لی صدری و یسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی.

عزیزان گرامی!

مجھے اس وقت آپ سے اس حیثیت سے گفتگو کرنی ہے کہ آپ دینی مدرسہ کے طالب علم ہیں اور میں ان کا دیرینہ خادم اور آپ کا رفیق سفر، موضوع کی اہمیت اور وقت کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ میں آپ کے سامنے اپنی زندگی کے تجربات اور اپنے محدود مطالعہ کے نتائج بے تکلف رکھ دوں اور زندگی کے سفر کی سب سے قیمتی اور عزیز سوغات آپ کے سامنے پیش کردوں، آپ نے مجھے گفتگو کا موقع دے کر عزت بخشی ہے، آپ نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے، میری خواہش

اور کوشش ہونی چاہئے کہ میں اس اعتماد کا اہل ثابت ہوں اور اس تھوڑے سے وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں، اس لئے کہ یہ وقت آپ نے بڑے قیمتی مشاغل میں سے نکالا ہے اور یہ ان لوگوں کا وقت ہے، جن کی ساعتیں اور لمحات مہینوں اور برسوں کے حساب سے تلنے چاہئیں۔

مدرسہ کیا ہے؟

دوستو! ہم کو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دینی مدرسہ کا مقام اور منصب کیا ہے؟ مدرسہ کیا ہے؟ مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان و ادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہ راست نبوت محمدی سے ہے، جو عالمگیر بھی ہے اور زندہ جاوید بھی، اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے، اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ در حقیقت قدیم و جدید کی بحثوں سے بالاتر ہے، وہ تو ایسی جگہ ہے جہاں نبوت محمدی کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔

مدرسہ کی ذمہ داری وگراں باری

حضرات! کسی مدرسہ کے لئے اس سے بڑھ کر قابل احتجاج اور قابل اعتراض لفظ نہیں ہو سکتے کہ وہ محض ایک دارالآثار یا کسی قدیم عہد کی یادگار ہے، میں اس کو مدرسہ کے حق میں ازالۂ حیثیت عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا اور حرکت و نمو سے لبریز سمجھتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا اس زندگی سے۔ جو نبوت محمدی کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوت محمدی کا دریا پایاب ہونے والا ہے، نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدی کے چشمۂ فیض سے بخل اور انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار، ادھر سے "انما انا قاسم واللہ یعطی" کی صدائے مکرر ہے، تو ادھر سے "ھل من مزید، ھل من مزید" کی فغان مسلسل، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ، متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے؟ زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار، زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی غلطیاں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟ دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے! اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو، تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم

لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے، تو مدرسہ میں جمود اور تعطل کی گنجائش کہاں ہے، اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بہکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے یا کسی منزل پر قیام کرلے یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے، تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے؟ سرودازلی اور پیغام محمدی اسے کون سنائے؟ مدرسہ کا تعطل، قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام، خودکشی کا مرادف اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کا ہم معنی ہے اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا۔

طلبہ وفضلائے مدارس کی ذمہ داریاں

دوستو! مدرسہ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ کا کام سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ عظیم ہے، میں نہیں جانتا کہ اس وقت دنیا کی کسی جماعت یا کسی گروہ کا کام اتنا نازک، وسیع اور اہم ہو، ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ آپ کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا زندگی سے، یہی آپ کے کام کی نزاکت کی وجہ اور آپ کی عظمت کی دلیل ہے، نبوتِ محمدی سے وابستگی اور اتصال جہاں ایک بہت بڑی خوش نصیبی اور سرفرازی ہے، وہاں ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے، آپ کے پاس حقائق اور عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سب سے عظیم سرمایہ ہے، اس وابستگی سے آپ پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہئے، آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہئے کہ ساری دنیا ملتی ہو تو اس کے ایک نقطہ سے بھی دستبردار ہونے کے سوال پر غور نہ کرسکیں، آپ

کے دلوں میں اس کی حمایت و نصرت کا جذبہ موجزن ہونا چاہئے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اس کی صداقت، اسکی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانہ میں صلاحیت، اس کی بلندی و برتری اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اس کے مقابل ہر چیز کو پورے اطمینان کے ساتھ جاہلیت اور جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں۔ آپ جہاں احکام خداوندی اور تعلیمات اسلامی کو سن کر "سمعنا واطعنا" کہیں وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے علمبرداروں کو مخاطب کر کے کہیں کہ "کفرنا بکم وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء ابدا حتى تومنوا با لله وحده" آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اسوۂ محمدی ہی کی روشنی میں دنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفان نوح میں سفینۂ نوح صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور امامت ہے، آپ یقین کرتے ہوں کہ افراد اور اقوام کی سرفرازی اور سربلندی کی شرط صرف رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے، اور یہ بالکل حقیقت ہے، کہ ؎

محمدؐ عربی کہ آبروئے ہر دو سر است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

آپ تعلیمات نبوت کو علم کا لب لباب اور حقیقة الحقائق سمجھتے ہوں، آپ اس کے مقابلے میں تمام دنیا کی الٰہیات اور فلسفہ مابعد الطبعیات اور قیاسات و روایات کو افسانہ و خرافات سے زیادہ وقعت دینے کیلئے تیار نہ ہوں، آپ توحید کی حقیقت سے واقف اور اس پر مصر ہوں اور شرک اور تمام دنیا کے علم الاصنام کو خواہ وہ کیسے ہی پر جلال علمی اصطلاحات اور فلسفہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہو، حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں اور "زخرف القول غرورا" سے زیادہ مرتبہ دینے کیلئے

آمادہ نہ ہوں، آپ سنت کے اتباع کے حریص اور خیرا لھدی ھدی محمد ﷺ" پر یقین رکھتے ہوں اور بدعات کے مضر اور نامقبول ہونے پر آپ کو شرح صدر ہو، غرض آپ اعتقادی، ذہنی، فکری، قلبی، ذوقی اور عملی حیثیت سے نبوت محمدی کی جامعیت اور عملیت کے قائل اور اس کی عملی تفسیر ہوں۔

طلباء وفضلاء کا امتیاز

دوستو! دنیا دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ کا امتیاز یہ ہے کہ ان حقائق پر دوسروں کا اجمالی ایمان کافی ہے مگر آپ کو اس پر پورا ذہنی اطمینان اور شرح صدر ہونا چاہئے، آپ کا صرف قائل ہونا کافی نہیں، اس کا داعی ہونا ضروری ہے، دوسروں کا یقین لازمی ہو تو کافی ہے، آپ کا یقین متعدی ہونا چاہئے جو سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو یقین سے لبریز کردے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ آپ کا یہ سرور سرخوشی وسرمستی اور بے خودی کی حد تک نہ پہنچا ہو اور آپ میں "یکرہ ان یعود الی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار" کی حقیقت نہ پائی جاتی ہو، تعلیمات نبوت سے دوسروں کی سرسری واقفیت کافی ہے، مگر آپ کے لئے علوم نبوت میں رسوخ، علوم نبوت سے عشق، علوم نبوت میں مقام فنائیت، علوم نبوت پر اصرار ضروری ہے، اس کے بغیر دعوت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، بلکہ دعوتوں اور تحریکوں کے اس طوفانی دور میں اس کے بغیر اپنی خصوصیات اور سرمایہ کی حفاظت بھی مشکل ہے۔

کیفیات باطنی

یہ بھی یاد رکھئے کہ نبوت محمدی نے جس طرح علوم واحکام کا ایک بے پایاں دفتر اور وسیع ترین ذخیرہ چھوڑا "فان الانبیاء لم یورثو ا دینا را ولا درھما

ولکن ورثو ا ھذاالعلم "یہ ذخیرہ قرآن وحدیث، فقہ واحکام کی صورت میں محفوظ ہے، اور آپ کا مدرسہ محمد اللہ اس کی خدمت واشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے، اس طرح نبوت محمدی نے کچھ اوصاف، خصوصیات اور کیفیات بھی چھوڑے، جس طرح پہلا سرمایہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اور اللہ تعالی نے ان کی حفاظت واشاعت کا انتظام کیا، اسی طرح دوسرا سرمایہ بھی برابر منتقل ہوتا رہا ہے اور اللہ تعالی نے اس کی حفاظت کا بھی انتظام فرمایا ہے، یہ اوصاف وخصوصیات کیا ہیں؟ یقین واخلاص، ایمان واحتساب، تعلق مع اللہ، انابت واجابت، خشوع وخضوع، دعاوابتہال، استغناء وتوکل، اعتماد علی اللہ، دردومحبت، خود شکنی وخودداری، علوم نبوت واحکام اور اوصاف وکیفیات دونوں کی جامع تھی "ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ" نبوت محمدی سے صرف علوم واحکام لینا اور کیفیات واوصاف کو ترک کردینا ناقص وراثت ہے، اور نامکمل نیابت، دنیا میں جن لوگوں نے نبوت کی نیابت کی اور اسلام کی امانت ہم تک پہونچائی، وہ صرف ایک حصہ کے امین نہ تھے، وہ دونوں دولتوں سے مالامال تھے، اب بھی اسلام کی دعوت، اور اسلامی انقلاب صرف پہلے حصہ سے برپا نہیں کیا جاسکتا، آپ کو جن اسلاف کی طرف نسبت کا شرف حاصل ہے، وہ بھی ان دونوں خصوصیتوں کے جامع تھے، آپ اگر حقیقی نیابت کے منصب بلند پر سرفراز ہونا چاہتے ہیں، تو آپ کو اس جامعیت کی کوشش کرنی پڑیگی، اس کے بغیر علم وفن کی صناعی کاغذی پھول ہیں، جن میں نہ خوشبو، نہ تازگی، آج دنیا کے بازار میں کاغذی اور ولایتی پھولوں کی کمی نہیں، ہم اور آپ اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کرسکتے، یہاں تو نبوت کے باغ کے شاداب پھول چاہئیں، جو

مشامِ جاں کو معطر کردیں، اور جن کے سامنے دنیا کے پھول شرما جائیں "فوقع الحق وبطل ما کانوا یعملون۔"

مدارس کا باطنی انحطاط

آپ بُرا نہ مانیں، کہنے والا بھی آپ ہی میں سے ہے، عرصہ سے ہمارے مدارس ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں، ان اوصاف میں روز افزوں انحطاط ہے، ہم کو دل پر پتھر رکھ کر سننا چاہئے، اور دیکھنا چاہئے کہ کہنے والے نے کہاں تک صحیح کہا ہے کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس کا نتیجہ یہ کہ ہمارے مدارس سے جس تعداد میں لوگ فارغ ہو کر نکلتے ہیں، کبھی اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے، لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں۔

انقلاب انگیز شخصیتیں

پہلے اسی ملک میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ یا سید علی ہمدانی کشمیریؒ جیسا ایک فقیر بے نوا آتا اور پورے کے پورے ملک کو اپنے قلب کی حرارت اور اپنے ایمان کے نور سے بھر دیتا، حضرت مجدد الف ثانی نے حکومت مغلیہ میں انقلاب برپا کردیا، انہیں کی خاموش مساعی کا نتیجہ تھا کہ ہم اکبر کے تخت پر اورنگزیب جیسے فقیہ و متشرع بادشاہ کو دیکھتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس طویل وعریض ملک کا رُجحان بدل دیا، اور پورے نظام فکر اور نظام تعلیم پر گہرا اثر ڈالا، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک عام مایوسی اور پسپائی کے دور میں اتنا بڑا اسلامی قلعہ تعمیر کردیا اور علوم شریعت کو ایک نئی زندگی بخشدی، ابھی پچھلے عرصہ میں مولانا محمد الیاسؒ نے

ایمان اور دینی جدوجہد کی ایک نئی روح پھونک دی۔ غرض ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

آج ہمارے فضلاء اس روح سے خالی، ان کیفیات سے عاری اور اس قوت سے محروم ہیں جو لوگوں کو نئے سرے سے سوچنے اور بدل جانے پر مجبور کر دیتی تھی، زمانہ بڑا حقیقت شناش ہے، وہ صرف بلندی کے سامنے جھکتا ہے، دماغ بلند دماغ کے سامنے جھکتے ہیں، اور خالی اور سرد دل معمور اور گرم دل کا لوہا مانتے ہیں، ہمارے مدارس میں دماغی انحطاط بھی روز افزوں ہے، اور قلبی افسردگی بھی روبہ ترقی، مقررین اور واعظین کی اب بھی کمی نہیں، مگر بقول حضرت جگر۔ ؎

آنکھوں میں سرور عشق نہیں، چہرہ پہ یقین کا نور نہیں

مدارس کی افسردہ فضا

مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کا مرکز تھے، اور جہاں انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا ہوتی تھیں، وہ مایوسی، افسردگی اور احساس کہتری کا شکار ہیں، آج مدارس کی تعداد میں، ان کے طلبہ کی تعداد میں، درس کی کتابوں کی تعداد میں، کتب خانے کے مندرجات کی تعداد میں، وظائف کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہے، مگر زندگی کی نبض سُست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے، کوئی حساس، درس مند کبھی کبھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ اس بحر کاہل کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ، کہ تو　　کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

لیکن اب تو مدارس کے حق میں کسی طوفان سے آشنا ہونے کی دعا کرتے

ہوئے بھی دل ڈرتا ہے، آج مدارس میں طوفان کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن یہ باہر کے طوفان کے تھپیڑے اور موجیں ہیں جو مدارس کے درودیوار سے ٹکرا رہی ہیں، یہ باہر کے ہنگاموں اور سطحی اور عوامی تحریکات کی صدائے بازگشت ہے جس میں ہمارے مدارس کے طلبہ کا مقام محض نقال یا آلۂ صوت کا ہے۔

دنیا کا امام، تقلید وپیروی کے مقام پر

یہ بڑا افسوس ناک منظر اور بڑی دل خراش حقیقت ہے کہ جو تحریکیں اور دعوتیں، جو ہنگامے اور شور، جو انتشار واضطراب، جو تنظیمیں اور طریقۂ احتجاج آج عصری درسگاہوں اور دنیاوی تعلیم گاہوں میں نامقبول ہو رہے ہیں اور پیش پا افتادہ اور کہنہ وفرسودہ سمجھے جانے لگے ہیں وہ ہمارے مدارس میں اب باریاب ہو رہے ہیں اور جن کو زمانہ کا محتسب، اپنے عصر کا امام اور خود صاحبِ دعوت اور خود صاحب مقام ہونا چاہئے تھا، وہ لادینی درسگاہوں کا متبع اور مقلد ہونے پر فخر کر رہے ہیں ؎

کرسکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

آج مدارس کا سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑا ذہنی طاعون بڑھتا ہوا احساس کمتری ہے جو گھن کی طرح اس درخت کو کھاتا چلا جارہا ہے، کسی ادارہ کو اگر یہ گھن لگ جائے تو پھر اسکی زندگی محال ہے۔

احساس کمتری کیوں؟

عزیزو! آپ احساس کمتری کا کیوں شکار ہوں؟ دوسروں کا احساس کمتری ایک نفسیاتی مرض ہے، مگر آپ کا احساس کمتری دینی کمزوری، ضعف عقیدہ اور ضعف ایمان کی دلیل ہے، جس کے نتائج بہت سنجیدہ اور دوررس ہیں، انبیا کے

نائبین اور علوم نبوت کے حاملین کو اپنی کہتری اور حقارت کا احساس ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبوت کے مقام سے ناآشنا اور یقین سے خالی ہیں ، آپ تو ان ہستیوں کے جانشین ہیں، جن کے متعلق عارف رومی نے بجا طور پر کہا تھا۔

نخو تے دارندو کبرے چو شہاں

چاکری خواہند ازاہل جہاں

اور جن کے متعلق سعدیؒ کے الفاظ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ۔

شہان بے کلہ و خسروان بے کمر اند

خودشناشی وخودداری

آپ کے پاس جو دولت ہے، اس سے دنیا کا دامن خالی ہے، آپ کے سینہ میں علوم نبوت ہیں اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں اور جن کے گم ہونے سے آج عالم میں اندھیرا ہے، اضطراب وانتشار ہے، شر وفساد ہے، آپ اپنے ان سادہ کپڑوں، ان حقیر جسموں اور اس خالی جیب ودامن پر نظر نہ کریں، آپ دیکھیں کہ آپ کا سینہ کن دولتون سے معمور اور آپ کے اندر کیسا بدر کامل مستور ہے۔

بر خود نظر کشا زتہی دامنی مرنج

در سینہ تو ماہ تمامے نہادہ اند

آپ یادرکھیں! حقارت وذلت کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے، عالم خارجی اور بیرونی دنیا سے بہت کم ہے، حقارت ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے، احساس حقارت نتیجہ ہے انسان کے شک وشبہ ، ضعف وتذبذب ،اور خود شناسی کے فقدان کا،انسان خود اپنے کو حقیر وبے مایہ سمجھتا ہے .اور اس کو دھوکہ ہوتا ہے کہ لوگ اس

کو حقیر سمجھتے ہیں اور دنیا میں وہ بے قیمت اور ذلیل ہے، حالانکہ یہ جفاوہ خود اپنے اوپر کرتا ہے، یاد رکھئے جو خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو جائے اس کو کوئی باعزت نہیں بنا سکتا، اور جو خود اپنے کو اپنی نظر سے گرادے، کسی کو اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ اس کو اپنے دل یا آنکھوں میں جگہ دے، جس کی گنجائش خود اپنے یہاں نہیں ہے، اس کی گنجائش کون و مکان میں نہیں ہے، یہ زمین بقدر دل سمٹتی اور پھیلتی ہے اور اس کی وسعت گھٹتی اور بڑھتی ہے، آدمی کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے کو اپنے دل میں کیا مقام دیا ہے اور اس کا معاملہ خود اپنی ذات کے ساتھ کیا ہے، اگر کسی نے اپنے کو ذلیل و حقیر، مجبور و بے بس، تہی دست و بے بضاعت اور دنیا کے بازار میں بے قیمت و بے ضرورت سمجھ لیا ہے، تو اس کو دنیا سے کسی انصاف اور کسی اعزاز کی توقع نہیں کرنی چاہئے، حاتم طائی نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

ونفسك اكرمها فانك ان تهن

عليك فلن تلقىٰ من الناس مكرما

"اپنی ذات کی خود عزت کرو اس لئے کہ اگر تم اپنی نگاہ میں ذلیل اور بے وزن ہو جاؤ گے تو پھر دنیا میں تمہیں کوئی بھی عزت کرنے والا نہیں ملے گا"

دوستو! مجھے یقین ہے کہ ہم حقیر نہیں ہیں، صرف احساس حقارت کے مریض ہیں اور یہ احساس حقارت ہماری خود ناشناسی اور خود فراموشی پر مبنی ہے، اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مقام سے باخبر ہو جائیں اور اپنی دولت اور سرمایہ کا صحیح جائزہ لیں، دنیا کی تبدیلی، نگاہوں کی تبدیلی، سب ہماری نگاہ کی تبدیلی کی تابع ہے، جس دن ہماری یہ نگاہ بدلی، دنیا بدل جائے گی، اور حقارت کا یہ مہیب

سایہ جو ہمارے دل ودماغ پر مسلط ہے اور ہم کو ڈرا رہا ہے، کافور ہو جائے گا، کہنے والے نے کچھ غلط نہیں کہا ؎

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس وجن، تو ہے امیر جنود

ہماری قدیم اور معاصر تاریخ مین جن اشخاص نے اپنے مقام کو پہچان لیا اور جن کو اس کا احساس ہو گیا اللہ نے ان کو کون سی دولت دی ہے اور کس منصب پر سرفراز کیا ہے، ان کو یہ سارا عالم پست نظر آنے لگا، ان کو سلطنتیں نہیں خرید سکیں، انہون نے دنیا کی بڑی سے بڑی پیش کش سن کر ہمیشہ زیر لب مسکرا کر کہا ؎

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

انسانی تاریخ کی آبرو جو ارزاں فروشیوں اور خود فراموشیوں کی داستانوں سے داغدار ہے، انہیں خود آشنا وخدا شناس انسانوں کے دم سے ہے، انسانیت کا سر انہیں کی بدولت اونچا ہے، جنھوں نے اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھا۔

زندگی کی آبرو خودداروں کے دم سے قائم ہے

عزیزانِ گرامی! اس زندگی کی بقا و تسلسل کے لئے جس طرح غذا اور لباس کی ضرورت ہوتی ہے، مادّی ساز وسامان کی ضرورت ہے اور لوگوں نے اس کا ذمہ لیا ہے، اسی طرح زندگی کے فروغ اور وقار اور انسانیت کے شرف اور اعتبار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مادہ پرست کو تاہ بیں دنیا مین وقتاً فوقتاً پیغمبرانہ خودداری اور دنیا کے پیمانوں کے انکار اور حقارت کا بھی اظہار ہوتا رہے، اور کسی کسی گوشہ سے یہ صدا آتی رہے کہ " **اتمدوننی بمال فما آتانی اللہ**

خیر مما آتاکم بل انتم بھدیّتکم تفرحون"جس روز یہ صدا بالکل بند ہو جائے گی اور ساری دنیا نیلام کی منڈی بن جائے گی، جہاں جوہر ادراک، شعلۂ ایمان اور متاعِ علم سب کسی نہ کسی دام پر ملنے لگیں گے اور انسان جمادات اور حیوانات کی طرح ارزاں اور گراں بکنے لگیں گے، اس دن یہ دنیا رہنے کے قابل نہ رہے گی' اور انسانیت اپنی آب و تاب کھو دے گی، اب اس کی ذمہ داری کہ انسانیت کی خودداری اور پیغمبروں کی سرداری کی شان قائم رہے۔ تنہا آپ کے سر ہے، اس کی توقع ان درسگاہوں سے نہیں کی جاسکتی، جنھوں نے معدہ اور پیٹ کے نصب العین سے بلند ہونے کا دعویٰ خود بھی نہیں کیا، اس کی توقع تو آپ ہی سے ہو سکتی ہے، جن کے اسلاف میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد جیسے غیور اور خود شناس امام گزرے ہیں، جن کو حکومتِ عباسیہ کسی قیمت پر خرید نہ سکی، امام غزالی جیسے عالی ہمّت، جنھوں نے حریم خلافت کے اشارہ کے باوجود نظامیہ بغداد کی صدر مدرسی جو خلافت کے بعد سب سے بڑا دینی اعزاز تھا، قبول نہیں کی، حضرت مجدد الف ثانی جیسے صاحبِ عزیمت جنھوں نے جہانگیر کے سامنے جھکنے پر گوالیار کی اسیری کو ترجیح دی، آپ کے اسلاف میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں بھی ہیں، جن کو بادشاہ دہلی نے پیغام بھیجا کہ اللہ نے اتنی بڑی سلطنت مجھے عطا کی ہے، آپ اس میں سے کچھ قبول فرمالیں، فرمایا اللہ تعالیٰ تو ھفت اقلیم کو' متاع الدنیا قلیل' فرماتا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، نواب آصف جاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا، نواب نے کہا، لیکر محتاجوں کو بانٹ دیجئے، فرمایا کہ اس کا مجھ کو

سلیقہ نہیں، یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جایئے، گھر تک پہونچتے پہونچتے تقسیم ہو جائے گا، نہ ہو تو وہاں ہو جائے گا، آپ کے اسلاف میں حضرت شاہ غلام دہلوی بھی تھے، نواب میر خاں والیِ ریاست ٹونک نے ان کے خانقاہ کے سالانہ مصارف کے لئے کچھ مقرر کرنا چاہا تو ان کو لکھ دیا گیا کہ۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

آپ کے اسلاف میں مولانا عبدالرحیم رامپوری جیسے مدرس گزرے ہیں، جنھوں نے ریاست سے دس روپیہ ماہوار کو بریلی کالج کی ڈھائی سو روپیہ کی اسامی پر اور لوجہ پڑھنے والوں کو ایک معزز پروفیسری پر یہ کہہ کر ترجیح دی کہ اگر خدا نے قیامت کے دن پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا۔ آپ کے اسلاف کرام میں دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی ذات گرامی ہے، جنھوں نے علی گڑھ کے ایک دیندار رئیس کی تنخواہ میں جو غالباً دس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھی، دو روپیہ ماہوار یہ کہہ کر کمی کرادی کے میں دو روپیہ اپنی والدہ صاحبہ کو دیا کرتا تھا، ان کے انتقال کے بعد یہ روپیہ فاضل ہے اور میں قیامت کے دن اس کے حساب سے بچنا چاہتا ہوں، آپ کے اسلافِ قریب میں وہ ایثار پیشہ مدرسین ہیں، جنھوں نے اپنے مدارس کی چھوٹی چھوٹی تنخواہوں اور اپنے اساتذہ اور شیوخ کے قرب پر بڑی بڑی درسگاہوں کی بڑی بڑی پیش کشوں کو قربان کر دیا۔ اور عسرت اور تنگی میں اپنی بسر کر دی، آپ کو یقیناً یہ شعر پڑھنے کا حق ہے کہ۔

اولئك آبائي فجئني بمثلهم ... اذا جمعتنا يا جرير المجامع

یہ راستہ معاشی حوصلہ مندیوں کا نہیں

دوستو! آپ اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ مجھے زمانہ کی تبدیلی، ضرورت کی زیادتی، ہمتوں اور قویٰ کی کمزوری، حالات کے اختلاف کا کوئی احساس نہیں اور میں آپ سے اس زمانہ میں مولانا عبدالرحیم اور مولانا محمد قاسم صاحب کے ایثار وزہد کا پورا پورا مطالبہ کررہا ہوں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کا راستہ بلاشبہ ایثار وقناعت، جدوجہد جفاکشی اور بلند ہمتی کا ہے، آپ نے جو راستہ انتخاب کیا ہے یا مرضی الٰہی نے آپ کے لئے پسند کیا ہے، وہ معاشی حوصلہ مندیوں اور دنیاوی سربلندیوں کا راستہ نہیں، اس راستے پر تو" قد کنت فينا مر جوّاً قبل هذا " کا طعنہ سُنا ہی پڑیگا، اس راستے پر تو" ولا تمدنّ عينيك الیٰ ما متّعنا به ازواجاً منهم زهرة الحياة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وابقيٰ" کا سبق پڑھنا ہی پڑے گا، لیکن اسکا انعام کیا ہے وہ بھی سن لیجئے " وجعلنا هم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا وكانوا باٰيا تنا يوقنون" مولانا روم نے اسی مقام کی خبر دی ہے کہ ؎

معدہ راہگزار سوئے دل خرام
تاکہ بے پردہ زحق آید سلام

زمانہ کی بے بضاعتی و تشنہ لبی

آپ کو جو احساس کہتری تکلیف دے رہا ہے، اس کی کچھ تو وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے مقام سے واقف نہیں، میں نے اس کو تفصیل سے عرض کردیا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ اس دنیا سے واقف نہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ زمانہ کس قدر بے بضاعت و تہی دامن اور کس قدر تشنہ

لب ہے، آپ اس زمانہ کو مرغوب اور للچائی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ اس سے ناآشنا ہیں، آپ اس کو قریب سے دیکھیں گے، تو معلوم ہوگا کہ یہ کس درجہ دیوالیہ ہے، اور اس کو اپنے دیوالیہ پن کا شدت سے احساس ہو رہا ہے، اس کے سب سکے کھوٹے نکلے، اس کے سب تیر دغا دے گئے اس کے سب چشمے سراب ثابت ہوئے، اس کے سب فلسفے اور نظام، اس کے سب اِزم ناکام رہے، اس کے سب خواب بے تعبیر رہے، آپ کے پاس نبوت محمدی کے عطا کئے ہوئے جو حقائق ہیں ان کو اپنی کم نظری سے پیش کرتے ہوئے آپ شرماتے ہیں کہ یہ زمانہ سائنس اور سیاسیات اور اقتصادیات کی ترقی کا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ آج وہ انھیں کے لئے بیتاب اور چشم براہ ہے، آج قومیں ان لوگوں کے انتظار میں ہیں، جو ان کو زندگی کا نیا راستہ بتلائیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام حیات سنائیں ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

اصل متاع علوم انبیاء

آپ جن باتوں کو معمولی سمجھتے ہیں اور جن کو آپ نے کوئی وقعت نہیں دی، میں نے بڑے بڑے فاضلوں کو ان پر سر دھنتے دیکھا ہے، جب کبھی ان کے سامنے پیغمبروں کی بتلائی ہوئی باتیں کی گئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی بلندی سے خطاب کیا جارہا ہے۔ اور اس کے کان اس سے ناآشنا تھے، آپ دنیا کے بازار میں اسی کا مال اور اسی کے مصنوعات لے جانا چاہتے ہیں، پھر اس کا کیا شکوہ کہ وہ بضاعتنا رُدّت اِلینا کہہ کر آپ کے سامنے ڈال دیتی ہے، دنیا آپ

سے امیدوار ہے کہ آپ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی اطلاعات اور بتلائے ہوئے راستے کو پیش کریں، دنیا آج بھی ان کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار ہے، اس کے دماغ اب بھی اس کے سامنے سرنگوں ہیں، جیسے چھٹی صدی مسیحی کے محدود ماحول میں سرنگوں تھے، یقیناً آپ کے پاس یونانیوں کے طبعیات وعنصریات و فلکیات پر جو چند اوراق ہیں، اس کے مقابلہ میں یورپ کے پاس سائنس اور تجربات مشاہدات کی ایک دنیا ہے،

یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ آج یورپ کو یونان کی فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلیات کی دقیقہ سنجییوں سے مرعوب نہیں کر سکتے، ان کی زندگی ختم ہو گئی ہے اور وہ اپنی طاقت کھو چکے ہیں، لیکن آپ کے پاس انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے جو علوم اور حقائق ہیں یورپ اور ایشیاء ان سے اب بھی محروم ہے، اس کے پاس آپ کے عقلی و فکری نتائج اور آپ کے علمی ذخیرے کا کچھ نہ کچھ جواب ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا جواب نہیں، آپ اپنی اصل قوت اور حقیقی دولت لے جائیں اور پورے اعتماد و یقین کے ساتھ زندگی کے میدان میں آئیں، اس میدان میں آپ کا کوئی حریف نہیں، آپ کے پاس انسانیت کے لئے جو دعوت اور پیغام ہے، آپ کے پاس علم و حقیقت کا جو سرچشمہ ہے، آپ کو جس ذات گرامی سے نسبت غلامی حاصل ہے، اس کے بعد آپ میں سے ہر شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ،

عجب کیا گر مہ وپرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جسنے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

علوم اسلامیہ کا زندگی سے ربط وتعلق اور اس کے لئے ہمارے اسلاف کی کوششیں

عزیزان گرامی قدر! میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے تعلق کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملتا ہے، اس سے آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، میں نے ابھی تک اسی کی تفصیل بیان کی ہے، اسی کے ساتھ یہ عرض کیا گیا تھا کہ آپ کا دوسرا سرا زندگی سے ملتا ہے، اب میں عرض کرونگا کہ اس کی کیا ذمہ داریاں اور تیاریاں ہیں اور آپ اس کے حقوق وفرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔!

عزیزو اور دوستو! نبوت نے ہم کو جو علوم وحقائق اور جو اصول وضوابط عطا کئے ہیں، ان میں ایک شوشہ اور ایک نقطہ کی ترمیم ممکن نہیں، آپ کے اسلاف کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے ان میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور اس ذخیرے کو ہمارے ہاتھوں تک بے کم وکاست پہونچادیا، لیکن اسی کیساتھ اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ ہمارے انھیں اسلاف نے ہر دور اور ہر عصر میں اس ذخیرے کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، انھوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اس ذخیرے کو ایک زندہ قابل عمل اور نمو پذیر ذخیرہ ثابت کیا انھوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ ان کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کر لیا، اور ان کو اپنے زمانہ، اپنی عقلی سطح اور اس ذخیرے کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا، ان میں اصل شریعت، مقاصد دین اور منصوصات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت تھی لیکن اس کی تعبیر وتشریح میں، اس کی توضیح وتفہیم میں شاخِ گل کی سی لچک اور ریشم کی سی نرمی تھی، ان کا عمل دراصل سیدنا علی مرتضی کرم اللہ

وجہ کی اس حکیمانہ ہدایت پر تھا کہ "کلموا الناس علی قدر عقو لهم اتریدون ان یکذب الله ورسوله." اس لئے انھوں نے ہر زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح وترجمانی کا فرض انجام دیا اور اس زمانہ کی نفسیات وضروریات کا لحاظ کیا، تیسری صدی میں مامون ومعتصم کی سرپرستی اور یونانی علوم کے اثرات سے معتزلہ دماغوں پر چھاگئے تھے اور عقلیت کے واحد نمائندہ تصور کئے جانے لگے تھے، اعتزال زمانہ کا فیشن اور روشن خیالی کی علامت بنتا جارہا تھا، اس وقت امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کی اس عقلی اجارہ داری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اور شریعت وسنت کی حمایت ونصرت اور عقائد اہل سنت کا اثبات اسی زبان، انھیں اصطلاحات اور اسی اسلوب میں کرنا شروع کیا، جس کے سہارے معتزلہ نے اپنا علمی تفوق اور ذہنی سیادت قائم کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں معتزلہ کا یہ عقلی طلسم ٹوٹ گیا اور سنت شریعت کے حلقوں میں جو احساس کہتری تیزی سے پھیلتا جارہا تھا وہ دفعتا رک گیا، ابوبکر بن الصیرفی کا مقولہ ہے کہ۔ "معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلہ کے لئے شیخ ابوالحسن اشعری کو پیدا کیا، انھوں نے اپنی ذہانت واستدلال سے ان کو بند کردیا۔، اسی کارنامہ کی بنا پر ابوبکر اسماعیلی جیسے مبصرین نے ان کو مجددین امت میں شمار کیا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری کے بعد ان کے مکتب خیال کے علماء نے انکے کام کو جاری رکھا، اور قاضی ابوبکر باقلانی، شیخ ابواسحٰق اسفرائینی جیسے متکلم اور علامہ ابواسحٰق شیرازی اور امام الحرمین جیسے مدرس واستاد پیدا ہوئے، جنھوں نے اہلسنت کا علمی تفوق قائم رکھا، لیکن اس عرصہ میں یونان کا علمی ذخیرہ عربی میں منتقل ہوچکا تھا اور باطنیوں اور فلاسفہ نے مل کر فلسفہ کو تقدیس وعصمت کا جامہ پہنادیا تھا،

اور وہ عقلیت وحق کا معیار بن گیا تھا، ادھر علم کلام کے حلقہ میں جس کو سب سے زیادہ زمانہ شناش اور بیدار مغز ہونا چاہئے تھا، جمود و تقلید سرایت کر گئی تھی، علماء کلام کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ اشعری وماتریدی عقائد کو تسلیم کیا جائے، بلکہ اسپر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کو ثابت کرنے کے لئے بھی وہی مقدمات و دلائل اور وہی الفاظ واصطلاحات استعمال کئے جائیں جو اشاعرہ وماتریدیہ نے استعمال کئے ہیں، حالانکہ زمانہ نئے دلائل اور نئے طرز استدلال اور نئے اجتہاد کا طالب تھا، امام ابوالحسن اشعری کا دور فلسفہ کا دور طفولیت تھا اور عالم اسلام میں اس کا نیا نیا تعارف ہوا تھا، پانچویں صدی میں وہ اپنے شباب کو پہنچ چکا تھا اور زندگی میں اپنے پنجے گڑو چکا تھا، اس وقت ایک نئی شخصیت، نئے اجتہاد، تازہ دماغ اور نئے علم کلام کی ضرورت تھی، اس کے لئے انتظام خداوندی نے امام غزالی کو تیار کیا، امام غزالیؒ نے اپنی تصنیفات میں اصول وعقائد اسلامیہ پر نئے انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے ایسے مقدمات و دلائل قائم کئے جو اس زمانہ کے لحاظ سے زیادہ موثر اور اپنے اثر کے لحاظ سے زیادہ دلنشیں ودل پذیر تھے، ان کے استدلال اور طریق بحث نے دین کا نیا وقار اور اہل سنت کا نیا اعتبار قائم کر دیا اور ہزاروں بے چین اور مضطرب دماغوں کے لئے وہ سکون وایمان کا باعث ہوئے، اگرچہ علم کلام کے حلقہ نے اس وقت ان کی اس اہم دینی خدمت کی داد نہیں دی بلکہ علم کلام کی پرانی لکیر سے ہٹنے کی بنا پر ان پر اعتراضات کئے، جن کا جواب امام صاحب نے "**فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة**" میں دیا ہے، لیکن بالآخر عالم اسلام نے ان کے اس مجددانہ کارنامہ کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فلسفہ کا جواب دینے کے لئے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ فلسفہ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کریں اور اس پر علمی تنقید

کرنے کا استحقاق پیدا کر سکیں، چنانچہ انھوں نے دو سال لگ کر (جیسا کہ "المنقذ من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں) فلاسفہ کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور باطنیہ کے عقائد و خیالات سے واقفیت پیدا کی، پھر انھوں نے اوّل "مقاصد فلسفه". پھر تِہافۃالفلاسفة لکھی، "تہافۃالفلاسفة" میں انھوں نے نیا کام یہ کیا کہ ابھی تک متکلّمین اسلام کی طرف سے مدافعت وجواب دہی کیا کرتے تھے، جو ہمیشہ سے ایک کمزور طریقہ ہے، امام غزالی نے پہلی بار فلسفہ کے شیش محل پر سنگ باری کی، انکے اس حملہ کا اثر یہ تھا کہ بقول مغربی مورخین فلسفہ سو برس تک فلسفہ کی عمارت ان کے حملہ سے متزلزل رہی، اور تقریبا نوے سال کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن رشد کی کتاب "تہافت التہافت" کی صورت میں امام غزالی کی کتاب کا جواب پیش کیا۔

امام غزالی کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی بنیادوں پر منظم حملہ ہو اور نفس فلسفہ کو اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کردیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ فلسفہ کا سارا نظام قیاس آرائی اور بادپیائی سے زیادہ نہیں، اس کے لئے فلسفہ سے بڑی گہری اور وسیع واقفیت ایک بڑے نقاد دماغ اور ایک بڑے جری اور طاقت ور قلم کی ضرورت تھی، اس کام کے لئے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ بڑھے، جو ہر طرح اس کے لئے موزوں تھے، انھوں نے اپنے مختلف رسائل بالخصوص اپنی تصنیف "الرد علی المنطقیین" میں فلسفہ اور اس کے پورے نظام فکر کو بے اعتبار ثابت کردیا، ان کی مجتہدانہ کتابیں اب بھی ذہن کو نئی غذا، قلوب کو نیا اعتماد اور فکر کو تازگی اور نشاط بخشتی ہیں۔

ادھر فلسفہ اور علم کلام دونوں نے مل کر جو ایک عقلی ظاہریت اور سطحی

تفلسف پیدا کر دیا تھا، اور عالم اسلام میں اسکے اثر سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا تھا کہ۔ صداقت ویقین حاصل کرنے کا راستہ صرف استدلال وفکر ہے، اسکے خلاف مولانا جلاالدین رومیؒ نے قلمی جہاد کیا، ان کی زندہ جاوید مثنوی در حقیقت ساتویں صدی کے عقلی بحران کے خلاف قلب وروح کی ایک دلکش صدائے احتجاج ہے، اور نہ صرف علم کلام کی ایک مجتہدانہ تصنیف ہے، بلکہ نئے علم کلام اور نئے استدلال کی بنیاد ہے، انھوں نے عقائد وحقائق اسلامیہ کے ثبوت کے لئے نئے نئے دلائل اور نئی نئی مثالیں دی ہیں، جو بیک وقت قلب ودماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں، اور دونوں کی سلوٹوں کو دور کرتی ہوئی دلنشیں وجاگزیں ہوتی چلی جاتی ہیں، اس کتاب کی تاثیر ابھی تک باقی ہے اور فلسفہ زدہ حلقوں میں اب بھی اس کے تیر بے خطا ہیں۔

مولانا رومؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے بعد فلسفہ نے نئی کروٹ لی، اب وہ تصوف واخلاق کی سرحدوں میں بھی گھس آیا اور سیاست وانتظام میں بھی دخل دینے لگا، اب اس کی تردید کے لئے تنہا الٰہیات کے مباحث اور علم کلام کی کاوش کافی نہ تھی، اب فلسفہ کے ہمہ گیر اثرات کا مقابلہ وہ کر سکتا تھا جو یونانی الٰہیات کے ساتھ یونانیوں کے علم الاخلاق، مصر کی افلاطونیت جدیدہ اور اشراق ہندوستان کے جوگ اور قرون وسطیٰ کے سیاسی تخیلات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتا ہو اور فلسفہ وتصوف، علم الاخلاق اور علم السیاست اور اسلام کے معاشی اصول اور نظام مالیات پر بھی اس کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہو، اس موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ کی شخصیت نمودار ہوتی ہے، جنھوں نے "حجۃ اللہ البالغۃ" اور "ازالۃ الخفاء" لکھ کر اسلام کی عظمت اور صداقت کا نقش قائم کر دیا، اور علمی حلقوں میں اسلام کی نئی علمی ساکھ، علوم

اسلامیہ کی زندگی کا ثبوت اور طبقۂ علماء کا وقار قائم کردیا، ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے تسلط سے نئے نئے فتنوں نے سر اٹھایا، عیسائی مبلغین نے اسلام پر اعلانیہ حملے شروع کر دئے اور علماء اسلام کو دعوت مقابلہ دی، پادریوں کا جواب دینے کے لئے اناجیل، ان کی تفاسیر اور ان کی تاریخ تدوین اور مسیحیت واسلام کے مابہ النزاع مسائل و مباحث کے براہ راست مطالعہ کی ضرورت تھی، اس موقع پر طبقۂ علماء ہی کے ایک فرد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی میدان میں آئے اور انھوں نے "اظہار الحق" اور "ازالۃ الاوہام" جیسی کتابیں لکھ کر مسیحیت کی اشاعت میں ایک سنگ گراں رکھ دیا، یہ کتابیں ہندوستان سے لے کر مصر وترکی تک اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں، اور ابھی تک لاجواب ہیں۔

دوسری طرف آریوں نے جن کو حکومت وقت کی شہ مل گئی تھی، اسلامی عقائد والہیات پر نیا حملہ شروع کر دیا اور عالم کے حدوث وقدوم، ذات وصفات، کلام الٰہی، حیات بعد الموت اور تعیین قبلہ اور حیات نبویؐ پر عقلی اعتراضات کرنے شروع کئے، ان کے جواب میں نہ تو قدیم کلامی دلائل پورے طور پر کارگر تھے، نہ قدیم مقدمات اور قدیم اسلوب موثر تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے انکے جواب کے لئے ایک نیا علم کلام تیار کردیا، انھوں نے روز مرہ کی ہلکی پھلکی زبان چھوٹی چھوٹی مثالوں اور عام فہم دلیلوں میں بڑے بڑے علمی مسائل سمجھائے اور بڑے بڑے مباحث کا فیصلہ کیا "تقریر دلپذیر" "حجۃ الاسلام"، "آب حیات" اور "قبلہ نما" ان کی ذہانت وسلامت فہم اور دقیقہ شناسی کا بہترین نمونہ ہیں، دوسری طرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں ایک فتنہ کھڑا ہوا، یہ نبوت محمدی کے خلاف ایک سوچی سمجھی بغاوت

تھی ۔اور اسلام کے پورے اعتقادی اور علمی وفکری نظام کو ڈائنا میٹ کرنے اور خدانخواستہ اس کے ملبہ پر ایک نئی نبوت اور امامت کے قصر کی تعمیر کی کوشش تھی،اس کے مقابلہ میں چند مخلص اور بالغ نظر علماء میدان میں آئے ،جن میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء اور مولانا سید انور شاہؒ کشمیری کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے۔

زندگی کی رفاقت اورزمانہ کے تقاضوں کی تکمیل

یہ ساری تفصیل اس لئے سنائی گئی کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ علماءاسلام کی ذہانت اور جذبۂ خدمت نے کبھی کسی منزل پر قیام اور کسی لکیر کا فقیر بنا گوارا نہیں کیا،انھوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا،ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض سے کبھی جدا نہیں ہوا،ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں،انھوں نے اسلام کی خدمت کے لئے جس زمانہ میں جس چیز، جس طرزاور جس اسلوب کی ضرورت سمجھی،بلا تکلف اختیار کر لیا،انھوں نے اسلام سے وفاداری اور دین کی خدمت گذاری کا عہد کیا تھا،انھوں نے کسی مدرسۂ فکر، کسی مکتب خیال اور کسی انداز فکر سے وابستگی کی قسم نہیں کھائی تھی،ہندوستان ومصر میں جب اسلام پر تمدن وتہذیب اور تاریخ ادب کی راہ سے حملے شروع ہوئے اور مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کی مستند شخصیتوں اور اسکے معیاری عہد پر اعتراضات کئے،اسلام کے خدوخال کو بگاڑ کر بد نما شکل میں پیش کیا تو طبقۂ علماء ہی میں سے ایسے اہل قلم اور ادیب ومصنف آگے بڑھے جنھوں نے ان مضامین پر ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اسلامیات بلکہ اردو ادب میں بھی یادگار ہیں اور جنھوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہزاروں کو نیا اطمینان اور دماغی سکون عطا کیا اور نہ

صرف ان کا تذبذب دور ہوا،بلکہ اسلام سے شیفتگی پیدا ہوگئی، مولانا شبلیؒ کی "الفاروق" "الجزیہ فی الاسلام"، "کتب خانہ اسکندریہ"، اس سلسلہ کی کامیاب تصنیفات ہیں۔

نصاب تعلیم کے تغیرات

خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات کا نمائندہ ہے، اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے، حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی و ذہنی تبدیلیوں کی بنا پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق و متقاضی تھا۔

دین کی نمائندگی کے لئے متنوع صلاحیتوں کی ضرورت

عزیزو! اس عہد انقلاب میں دین کی نمائندگی، تعلیمات اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف ان کی تشریح و تفہیم بلکہ ان کی بلندی و برتری کا نقش قائم کرنے کے لئے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے، آپ اسلام کے سپاہی ہیں اور زندگی کے معرکہ کے لئے تیار ہو رہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم و جدید اسلحہ اور طریق جنگ کی بحث ہے، سپاہی کے لئے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کے لئے کون سا ہتھیار کارگر ہے اور کون سا طریق جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لئے تعصب کی کوئی گنجائش

نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فن جنگ سے، اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہئے، عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا۔

کل امرئی یسعی الی یوم الھیاج بما استعدا

نئی تحریکوں سے گہری اور ناقدانہ واقفیت کی ضرورت

آپ کو نئے فتنوں سے واقف ہونا چاہئے، مگر سطحی واقفیت عدم واقفیت سے زیادہ مضر ہے، آج ہمارے مدارس میں فیشن کے طور پر بعض تحریکوں اور نظاموں کے نام لئے جاتے ہیں لیکن ان کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، ناقدانہ نظر اور محققانہ مطالعہ تو بڑی چیز ہے، ان کی اجمالی حقیقت سے بھی واقفیت نہیں، ضرورت ہے کہ ماہرین فن اور اہل نقد و نظر کی نگرانی اور رہنمائی میں ان کا مطالعہ کیا جائے اور اسلام کے نظام کی برتری ثابت کی جائے، یہ کام مشکل ہے لیکن ضروری ہے، اگر یہ مدارس کے اہتمام میں منظّم طریقہ پر نہ ہوا تو وہ غیر منظّم طریقہ پر ہوگا۔

نئے مطالعہ کی مشکلات اور ذمہ داریاں

ہمارے مدارس میں نئے مطالعہ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے، مگر مجھے اس کا اظہار کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی سنجیدگی اور گہرائی نہیں، میں عصری مطالعہ کا بڑا داعی ہوں، مگر بے تکلف کہتا ہوں کہ وہ اس قدر آسان اور سرسری کام نہیں، جتنا سمجھ لیا گیا ہے اس کے لئے کتابوں کے صحیح انتخاب و تربیت پر پوری رہنمائی اور کسی اچھے مشیر کی رفاقت کی ضرورت ہے پھر اس سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ وہ ذہن تیار ہو جائے جو اس مطالہ سے فائدہ اٹھا سکے، معلومات میں صحیح ترتیب و نظام قائم کر سکے اور ان کو صحیح طور پر استعمال کر سکے، اگر یہ ذہن

صحیح تعلیم و تربیت اور اساتذہ کی صحبت سے تیار ہو گیا تو وہ ہر طرح کی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لے گا اور معلومات کے موادِ خام سے کار آمد مصنوعات اور عظیم نتائج پیدا کرے گا۔ اور ادب، تاریخ، معلوماتِ عامہ، یہاں تک کہ بہت سی غیر متعلق چیزوں سے دین کی نصرت اور خدمت کا ایسا موثر اور حیرت انگیز کام لے گا جو بعض اوقات خالص دینی چیزوں سے نہیں لیا جا سکتا، اسوقت "من بین فرث ودم لبناً خالصاً سائغاً للشاربین" کی حقیقت کا ظہور ہوگا، اگر ایسا نہیں ہے، دین کی بنیادیں قلب و دماغ میں مستحکم نہیں ہوئی ہیں، ذہن کج اور ذوق فاسد ہے تو۔ ؎

ہرچہ گیرد علتی علت شود

کا مصداق ہوگا۔

ملک کی زبان وادب سے ربط وتعلق

اس موقع پر دو اور حقیقتوں کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک حقیقت تو یہ ہے کہ کسی ملک میں دین کی خدمت و اشاعت اور وہاں کی زندگی پر اثرانداز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو اس ملک کی زبان وادب کا صاف ستھرا ذوق ہو، اور وہ مذاق سلیم اور صحیح معیار کے مطابق اس میں اظہار خیال کرنے کی قدرت، جیتی جاگتی زبان اور شگفتہ انداز بیان میں تصنیف و تقریر کی قابلیت رکھتے ہوں، دین کی دعوت اس وقت بہت موثر ہو جاتی ہے، جب اس میں دل آویزی اور دل پذیری بھی ہو اور یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت اور امر واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تک کو اپنی قوم کو خطاب کرنے اور ان کے دل و دماغ میں نفوذ کرنے کے لئے بہترین زبان دی گئی، قرآن مجید میں کہا گیا، "انّا انزلناہ قرانا عربیًا لعلکم تعقلون" کہیں فرمایا گیا "بلسان عربی مبین"

کہیں ارشاد ہوا" وماارسلنا من رّسول الاّ بلسان قومه" اہل فکر سمجھتے ہیں کہ لسان القوم سے مراد صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ ان کی سمجھ سکتااور انکو سمجھا سکتا ہو، بلکہ اپنے زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ لسانی اور ادبی معیار پر پورا اترتا، بلکہ سب سے فائق ہو، اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ اسکے بعد ہی فرمایا "لتبین لھم" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انا افصح العرب"۔

آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیااور مسلمانوں کے خیالات ورجحانات پر گہرا اثر ڈالا، وہ عموماً زبان و قلم کی طاقت رکھتے تھے ،اور ان کی تصنیفات تقریروں میں صحیح ادبیت اور بلاغت ہے، حضرت شیخ جیلانی کے مواعظ آج بھی زور بیان خطابت کا نمونہ ہیں، امام ربانی کے مکتوبات اپنی ادبیت، زور اور طاقت، سلاست اور بے تکلفی میں ابوالفضل اور فیضی کی انشاپردازی سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی "حجۃ اللہ البلاغہ" عربی انشاء اور علمی زبان کا ایسا نمونہ ہے کہ مقدمہ ابن خلدون کے بعد سے ان صدیوں میں اس سے بہترین نمونہ نظر نہیں آتا، شاہ صاحب کی فارسی میں بھی خاص حلاوت اور سلاست ہے، "ازالۃالخفاء" کے بعض ٹکڑے ادبی شہ پارے ہیں، یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب عربی اور فارسی اس ملک میں مسلمانوں کی تصنیفی اور علمی زبان تھی، اردو کے رواج کے بعد خود شاہ صاحب کے فرزندوں نے اردو میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا، شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ دہلی کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے ،اور اپنی ادبی خوبیوں اور استناد کی بناپر اردو کے کلاسیکل ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے، مولانا محمد قاسمؒ صاحب کی اردو تصنیفات میں ایسی سلاست، سادگی اور برجستگی پائی جاتی ہے کہ دقیق علمی مضامین بھی ذوق پر بار

نہیں ہونے پاتے، اس ملک میں عرصۂ دراز تک زبان وادب کی قیادت طبقۂ علماء کے ہاتھ میں رہی اور وہی اس ملک کی ادبی رہنمائی کرتے رہے، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد دہلوی اور مولانا شبلی نعمانی ادب اردو کے معماروں میں شمار کئے جانے چاہئیں، علماء نے اپنی لطافتِ ذوق، سلامتِ طبع، سخن فہمی اور انشاء پردازی کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں، جو اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین اور مولانا سید عبد الحیؒ ناظم ندوۃ العلماء کا "تذکرۂ گلِ رعنا" اور "تاریخ یاد ایام" اردو نثر کا ایسا نمونہ ہے، جس میں تاریخی ثقاہت ومتانت اور ادبی بانکپن اور رنگینی پہلو بہ پہلو ہیں، اور یادش بخیر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تو اردو کو اپنی علمی تحقیقات اور ادبی مضامین سے گراں بار کر دیا، ان کی کتابیں اب بھی اور بہت دنوں تک نقدِ کامل عیار اور ادب وانشاء کا معیار سمجھی جائیں گی، اسی طرح مولانا ابو الکلامؒ آزاد کی تحریروں نے اردو کو ایک نئی طاقت اور نیا اسلوب بخشا "الہلال" کے سحر نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو مسحور کر لیا تھا، اب بھی ان کا ایک ایسا ادبی مقام ہے، جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے، علماء کی اس بیدار مغزی اور زمانہ شناسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء پر اس ملک کی تعمیر وترقی سے علٰحدگی اور اس کے رجحانات وجذبات سے بے خبری کا الزام نہیں لگایا جاسکا، انہوں نے اس ملک میں کبھی جزیرہ بننے کی کوشش نہیں کی، بعض دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح وہ زمانہ کے کارواں سے بچھڑے نہیں، انہوں نے اپنی دعوت اور دینی مقاصد کے لئے وہی زبان اختیار کی جو اس ملک میں رائج تھی اور جو ادبی حلقوں میں اثر رکھتی تھی، ہمیں ان روایات کو قائم رکھنا چاہئے اور اس مقدس ترکہ کی حفاظت کرنی چاہئے، ہم اگر اب بھی دین کی مؤثر خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور

اپنے عقائد وخیالات کو عوام وخواص تک پہنچانا چاہتے ہیں، تو ہمیں اپنی تصنیف و تقریر کے لئے شگفتہ و سلیس زبان اور نیا اسلوب اختیار کرنا پڑیگا اور اپنی تصنیفات ومضامین اور تقریروں کو اس ادبی معیار پر لانا ہو گا جو اس زمانہ میں قائم ہو گیا ہے، یہ نہ ثقاہت کے خلاف ہے نہ اسلاف کی روایت کے، بلکہ حکمتِ دین کے عین مطابق ہے۔

عربی زبان پر قدرت

دوسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقتور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے پورے عروج اور شباب پر ہے، وہ تصنیف و تالیف، خطابت و تقریر، سیاست وصحافت، علم و فلسفہ اور دستور و قانون کی زبان ہے، وہ پورے طور پر نکھر گئی ہے، ہمارے عربی مدارس میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ قدیم عربی زبان تفسیر وحدیث وفقہ میں محدود ہے اور وہ کہیں پائی نہیں جاتی، عربی کے نام سے بالکل ایک جدید زبان ایجاد ہو گئی ہے جس میں زیادہ تر انگریزی وفرانسیسی کے معرب یا دخیل الفاظ ہیں، اس غلط فہمی نے ہمارے بہت سے علماء اور نوجوانوں کو عربی سے متوحش اور مایوس بنادیا ہے، آپ اگر مجھ پر اعتماد کر سکیں، تو میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کروں گا کہ جدید عربی کا کہیں وجود نہیں، اس وقت جو زبان اہل علم اور اہل قلم، شرق اوسط میں استعمال کرتے ہیں، وہ قرآن وحدیث اور جاہلیت واسلام کی زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہے، نئی ضرورتوں کے لئے بھی انھوں نے عربی کے قدیم ذخیرہ اور قرآن وحدیث سے الفاظ نکال لئے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے جو کام انجام دیا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے اور قابل داد بھی، مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد سے جو مغربی الفاظ عربی زبان

میں داخل ہو گئے تھے وہ ایک ایک کر کے بے دخل کئے گئے اور انکی جگہ پر خالص عربی الفاظ رکھے گئے، اس وقت ان ملکوں کا لسانی اور ادبی معیار اتنا بلند ہو گیا ہے، اور صحافت واشاعت نے عربی کے خزانہ عامرہ کے نوادر کو ایسا وقف عام کر دیا ہے کہ اب عربی میں کام کرنے کے لئے بڑی تیاری اور جدوجہد کی ضرورت ہے، ہمارے مدارس میں جس انداز پر عربی زبان وادب کی تعلیم ہو رہی ہے، اس کے ساتھ ان ملکوں میں کوئی علمی خدمت یا دعوتی کام ناممکن ہے، اگر آپ کو عربی دنیا میں دین کی دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا ہے یا ہندوستان کی دینی و علمی تحریکات کا تعارف کرانا ہے تو اس کے لئے بڑے پیانہ پر تیاری کی ضرورت ہو گی، اب ہندوستان ان ملکوں سے الگ نہیں رہ سکتا، دنیا کی سیاست میں شرق اوسط کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ اہمیت بڑھتی جائے گی، ہر ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے وہ اب بھی عالم کا قلب اور مرکز اعصاب ہے، اگر شرق اوسط سے ربط قائم کرنے اور دین اور مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کرنے کے کام سے علماء نے گریز کیا تو یہ نہ ان کے حق میں اچھا ہو گا نہ اس ملک کے حق میں، اس لئے اس پہلو کی طرف بھی ہمارے مدارس میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، زبان وادب زندہ اور متحرک چیزیں ہیں، کچھ مدت کے لئے بھی اگر کوئی ادارہ یا فرد ان سے بچھڑ جائے تو اسکو اس کا نقصان مدتوں برداشت کرنا پڑے گا۔

عقائد صحیحہ کی حفاظت

دوستو اور بھائیو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن "لذیذ بود حکایت دراز ترگفتم۔" اب آپ سے رخصت ہونے سے پہلے میں ایک آخری چیز کہنا چاہتا ہوں، جو اگرچہ آخر میں کہی جا رہی ہے، مگر وہ اہمیت میں کسی سے کم نہیں، آپ کے

اور ہمارے اسلاف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی دینی حِس اور مذہبی غیرت کی حفاظت کی اور وقت کے کسی فتنے کے سامنے سپر نہیں ڈالی، انھوں نے بدعات رسومات اور شعائر جاہلیت کے معاملہ میں بھی مداہنت و تساہل سے کام نہیں لیا، آپ کے اسلاف میں حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیلؒ شہید اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جبل استقامت اور نقیب شریعت گذرے ہیں، جنھوں نے سب کچھ گوارہ کیا مگر کسی خلاف شریعت فعل اور کسی بدعت کے ساتھ رعایت نہیں برتی، انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جب اس ملک پر مغربی تہذیب وعادات وملحدانہ عقائد وخیالات کا سیلاب آیا تو آپ چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے، آپ کے اسلاف شریعت کے بارہ میں اتنے ذکی الحس، اتنے دوربیں اور اتنے غیور واقع ہوئے تھے کہ انھوں نے آخر وقت تک بدعات کو سند جواز نہیں دی، جو مسلمان کی زندگی کا جزو بنتی جاتی تھیں، انھوں نے محتسب اور شریعت کے بے لاگ منتظم کے فرائض انجام دئے اور ان کی نگاہ احتساب سے کوئی انحراف، کوئی بدعت بچ کر نہیں نکل سکی، انھوں نے عوام کا عتاب، لوگوں کی ملامت، تکفیر کے فتوے، مقاطعہ اور ایذارسانی سب کچھ گوارہ کیا، مگر اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا، اس کا نتیجہ یہ کہ آج لاکھوں کی تعداد میں ایک طبقہ جو زیادہ سنجیدہ، باوقار اور صاحب فکر ہے، ان بدعات سے محفوظ ہے اور یہ بدعات ابھی تک مسلمانوں کی زندگی میں مستند اور مسلم نہیں ہو سکیں، اللہ تعالیٰ ان خادمینِ شریعت اور ان محافظ دین کی تُربتیں ٹھنڈی رکھے، اور ان کو امت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے ؎

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آج ہمیں ان کی بصیرت، ان کی فراست، انکے دینی تفقہ اور ان کے رسوخ فی العلم کی قدر آتی ہے کہ انھوں نے اپنا فرض کس خوبی سے انجام دیا "من المومنین رجال صدقوا ماعا ھدوالله علیه فمنهم من قضیٰ نحبه ومنهم من ینتظر ومابدّلوا تبدیلا."

مجھے پہلے تو آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپکا بڑا عزیز اور محبوب سرمایہ ہے، انھوں نے اپنی جانوں کو حصار بنا کر اس باغ کی حفاظت کی ہے، انھوں نے اپنے خون سے اس کے درختوں کو سینچا ہے، اور ہمیں بتلادیا کہ شریعت کے باغ کی رکھوالی اس طرح کی جاتی ہے ۔

آغشته ایم ہر سرِ خارے بخون دل
قانونِ باغبانئ صحراء نوشته ایم

ہمیں اس سرمایہ کو سینہ سے لگا کر رکھنا چاہئے، اور اپنے ہر سرمایہ سے زیادہ اس سرمایہ کو عزیز رکھنا چاہئے، مجھے آپ سے دوستانہ شکایت ہے، میرے دردمند دل کو آپ سے گلہ ہے کہ آپ اس سرمایہ سے بیگانہ ہوتے جارہے ہیں، آپ کے بزرگوں کی بہترین صلاحیتیں، اور مبارک ترین اوقات ان نفوس قدسیہ کی طرف حمایت ومدافعت میں گزرے، آپ ان ہی کی بدولت ایک بڑے گروہ میں معتوب ومغضوب ہوئے، اور آپ کے ساتھ اب بھی یہ نسبت لگی ہوئی ہے، مگر اب آپ میں بہت سے ان کے نام اور کام سے بھی واقف نہیں، آپ میں سے کتنے مولانا اسماعیل شہیدؒ کے حالات اور کارناموں سے واقف ہیں؟ آپ میں سے کتنے بھائیوں نے "صراط مستقیم" اور "تقویۃ الایمان" پڑھی ہے؟ آپ میں سے کتنے بھائی توحید و

سنت کی صحیح حقیقت سے واقف ہیں، وہ بتلا سکتے ہیں کہ اہل جاہلیت کے ایمان باللہ کی حقیقت کیا تھی، اور قرآن نے کیوں ان کو مشرک کہا، توحید کے کیا مراتب ہیں، اور شرک کے کیا مظاہر ہیں، بدعت کی جامع اور مانع تعریف کیا ہے، اور اس کے کیا نقصانات ہیں، آپ کو ان سب مسائل پر تیار ہونا چاہئے تھا، اور آپ کا مطالعہ اور آپ کی بصیرت عوام سے اس بارہ میں بہت ممتاز ہونی چاہئے تھی، مگر مجھے خطرہ ہے کہ آپ میں سے بہت سے بھائی ان چیزوں سے بالکل خالی الذہن ہوں گے۔

نئے دور کے نئے فتنے

اسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ ہے کہ اب نیا دور نئے فتنے لا رہا ہے، جاہلیت نئے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے، پہلے اگر بدعات کا معاملہ تھا تو اب کھلی کھلی وثنیت اور اصنام قدیمہ کا دور دورہ ہے، پہلے اگر ہمہ اوست کا نعرہ تھا تو اب وحدتِ ادیان کا فتنہ، احیا پرستی کی دعوت، قوم پرستی' قومیت عربیہ اور کمیونزم کا دین جدید............ یہ حالات ہمارے احساس مذہبی، ہماری حمیت دینی اور ہمارے عقیدۂ توحید کو چیلنج کرتے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ جنھوں نے بدعات ورسوم مروجہ کو کبھی گوارا نہیں کیا، وہ ان مشرکانہ رسوم و مظاہر کو کس طرح گوارا کرتے ہیں، اور ان کا رویہ اس بارہ میں کیا ہوتا ہے، ہم اپنے اسلاف کے دینی تصلب اور دینی شجاعت کے معترف ہیں اور خدا اور خلق کے سامنے اسکی گواہی دینے کے لئے تیار ہیں کہ انھوں نے باطل کے سامنے گردن نہیں جھکائی اور ہتھیار نہیں ڈالے، دیکھنے کی بات ہے کہ ہمارے بعد کی نسلیں ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہیں اور ہم تاریخ میں کیسے نقوش چھوڑ کر جاتے ہیں؟

دور جدید کی ذمہ داریاں

عزیزو اور رفیقو! تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے جس دور کا انتخاب کیا ہے، اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی ہیں، لیکن اس کا انعام اور اس کی سر فرازیاں بھی بہت بڑھ چڑھ کر ہیں، ذمہ داریوں سے گریز اور زمانہ سے شکست مردوں کا کام نہیں، جو وقت باقی رہ گیا ہے، اس کو تیاری میں صرف کیجئے، خدا نے آپ کو بہترین مربی اور شفیق استاد دیئے ہیں، ایک دینی ماحول اور ایک بہت بڑا ادارہ بخشا ہے، زمانہ کی نزاکت اور اپنے کام کی عظمت سمجھئے اور اپنے کو قیمتی اور کار آمد بنایئے، تاکہ امت کے لئے قیمتی اور کار آمد ثابت ہوں ؎

غافل منشیں، نہ وقت بازیست
وقت ہنر است و کار سازیست

وماعلینا الاالبلاغ

انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار

اگست ۸۷ء میں اسلامک سنٹر آکسفورڈ میں پڑھے جانے والے ایک اہم عربی مقالہ کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ جس میں مفکرؒ اسلام نے "اسلام میں علم کا مقام اور علم کی ترویج و ترقی میں اسلام کا حصہ" جیسے عنوان کو وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار

نبوتِ محمدیؐ کا اعجاز اور انقلابی کارنامہ

حضرات! اگر کوئی واحد ہستی ایسی ہے، جس کے متعلق وثوق سے کہا جاسکے کہ اس نے حقیقتاً تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے، جس نے انسان کو جہالت کے بجائے علم، فرسودہ روایات کے بجائے تعقل، اور آباواجداد کے نقش قدم کی کورانہ پیروی کے بجائے عقل وبصیرت، اور تفکر وتدبر سے کام لینے کا عادی بنایا ہے، تو وہ ذات گرامی حضور اکرم ﷺ کی ہے، آپ تاریخ کے اس دوراہے پر نظر آتے ہیں، جہاں سے عقل واستدلال اور توہم پرستی کے راستے جدا ہوتے ہیں، آپ کی تعلیمات نے انسان کو عقل کی روشنی عطا کی اور اس کی مبصرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ محمد ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں خالقِ کائنات نے نوعِ بشری کو علم عطا کرنے کے احسان کا ذکر کیا ہے، اور اس قلم کو اس کا وسیلہ قرار دیا، جس سے علم کا تاریخی سفر وابستہ ہے، اور جس سے تصنیف وتعلیم کی عالمگیر تحریک جاری ہوئی، اور علم کی ایک فرد سے دوسرے فرد، ایک قوم

سے دوسری قوم، ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہونچتارہا، دنیا میں علم کی اشاعت اور انسانی ضرورت کے مطابق اس کی عمومیت کا فخر اسی کو حاصل ہے، اور اس کی گردش و جُنبش سے مدارس و جامعات اور علمی اداروں اور کتب خانوں کی دنیا آباد ہے۔

جہاں تک بَشَری قرائن وقیاسات کا تعلق ہے، اس بات کا کوئی تاریخی و عقلی قرینہ نہ تھا کہ پہلی وحی کے ذیل میں ''**قلم**'' کا ذکر بھی آسکتا ہے! کیونکہ یہ وحی ایک امی انسان، ایک ان پڑھ قوم کے درمیان اور ایک پسماندہ علاقہ میں نازل ہورہی تھی، جہاں وہ پارۂ چوب جس کا نام ''**قلم**'' ہے سب سے زیادہ نادر ونایاب شئ کی حیثیت رکھتا تھا، اسی لئے عربوں کا لقب ہی ''**امیین**'' پڑ گیا تھا:۔

هوالذی بعث فی الأ میین رسولاً منهم یتلو ا علیهم آیاته ویزکّیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین. (سورة الجمعة. ۲) وہی تو ہے جس نے لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے درانحالیکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ایک غیر مُتوقّع آغاز

غارِ حرا میں نبی امیؐ پر یہ پہلی وحی اترتی ہے (جبکہ تقریباً چھ سو سال (۱) کے طویل وقفہ کے بعد زمین کا آسمان سے بلکہ صحیح تر الفاظ میں آسمان کا زمین سے وحی ونبوت کے ذریعہ رابطہ قائم ہوا تھا) تو اس میں عبادت کا حکم اور اللہ کی معرفت اور اطاعت وغیرہ کوئی ایجابی، یا بتوں کے ترک کرنے یا جاہلیت اور اس کے عادات واطوار پر نکیر جیسی کوئی سلبی بات نہیں کہی گئی، اگرچہ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر اہم

تھیں، اور اپنے اپنے موقعہ پر ان کی وضاحت و تبلیغ کی گئی بلکہ کلمہ ''اِقرا'' سے وحی کا آغاز ہوا :۔

اقرأ باسم ربك الذى خلق. خلق الانسان من علق. اِقرأوربّك الاكرم . الذى علم بالقلم. علم الانسان مالم يعلم. (سورة العلق.١.٥) آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے، آپؐ (قرآن) پڑھا کیجئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے، (جس نے) انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنہیں وہ نہیں جانتے تھے۔

اس طرح یہ تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس نے مؤرخین و مفکرین کے غور و فکر کے لئے نئے اور وسیع آفاق مہیا کئے، اور یہ اس حقیقت کا بلیغ اور واضح اشارہ تھا کہ اس نبی امی ﷺ کے ذریعہ انسانیت اور مذاہب کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگا، جو وسیع و عمیق معنوں میں قرأت (خواندگی) اور پڑھنے لکھنے کا وسیع و ترقی یافتہ دور اور علم کی حکمرانی کا عہد زریں ہوگا، اور علم و دین دونوں مل کر نئی انسانیت کی تکمیل و تشکیل کریں گے۔

انفس وآفاق اور اقوام و مِلل کے ماضی پر غور وفکر کی دعوت اور اس کے فائدے

قرآن علم کے مختلف ذرائع کے تذکرہ کے ساتھ ان اشیاء کی جانب توجہ دلاتا ہے جن کا مطالعہ حصولِ علم کے لئے کیا جانا چاہئے اس سلسلہ میں اس نے انفس وآفاق اور گذشتہ اقوام کے احوال (جنہیں قرآن نے ''**ایام اللہ**'' اور ''**سنت اللہ**'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور آج جسے تاریخ کہا جاتا ہے)

کی جانب توجہ دلائی تاکہ انسان ان پر غور وخوض کر کے مفید نتائج بر آمد کر سکے، اور بڑے قیمتی اور دوررس، پُر از امکان اور انسانی مستقبل پر گہرائی سے اثر انداز ہونے والے نتائج تک پہنچ سکے۔

علامہ اقبال، عقل انسانی اور علم کے وسائل ومصادر کی اسلام کے ذریعہ وسعت ونتیجہ خیزی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مشہور خطبات (۲) میں لکھتے ہیں :۔

"لیکن مشاہداتِ باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علم انسانی کا، قرآن پاک کے نزدیک اس کے دوسر چشمے اور ہیں، ایک عالمِ فطرت، دوسرا عالمِ تاریخ، جن سے استفادہ کرنے میں عالمِ اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا ہے، قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس وقمر، یہ سالوں کا امتداد، یہ اختلافِ لیل ونہار، یہ رنگ وزبان کا فرق، اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دنوں کی آمد وشُد، حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالمِ فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے، حقیقتِ مطلقہ کی آیات ہیں، اور اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور وتفکر سے کام لے، یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اِعراض کرے، کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے، وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی، جب مسلمان رفتہ رفتہ

اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے، وہ لامتناہی ہے اور اضافہ پذیر، تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر جس کا اپنی حیاتِ ذہنی کی ابتدا میں انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا تھا۔ اتر آئے، شروع شروع میں تو انہیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی روح فلسفۂ یونان کے منافی ہے، اور اس لئے حکمتِ یونان پر اعتقاد کرتے ہوئے انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا، لیکن قرآن مجید کا زور چونکہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمتِ یونان کا حقائق کے بجائے نظریات پر، لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی، جس کے بعد اسلامی تہذیب و ثقافت کی حقیقی روح بر سر کار آئی، حتی کہ تہذیب جدید کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھئے تو ان کا ظہور بھی اسی کا مرہونِ منت ہے"۔ (۳)

وہ مزید لکھتے ہیں :۔

"قرآن پاک نے تاریخ کو "ایام اللہ" سے تعبیر کیا اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے، اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام و امم کا محاسبہ انفرادی و اجتماعی دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے، مزید یہ کہ انہیں اپنی بد اعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے، اور یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں اس نے بار بار

تاریخ سے استناد کیا"۔(۴)

علاوہ ازیں قارئین کو توجہ دلائی کہ نوع انسانی کے گذشتہ اور موجودہ احوال وشئون کے مطالعہ میں غور وفکر سے کام لیں:۔

ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا ان اخرج قومك من الظلمٰت الی النور وذکرهم بایّٰم الله . ان فی ذلك لآیٰت لکل صبارٍ شکور. (سورة ابراهیم .۵) اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ، اس میں ان لوگوں کے لئے جو صابر وشاکر ہیں (قدرتِ خدا کی) نشانیاں ہیں۔

وممن خلقنا امة یهدون بالحق وبه یعدلون والذین کذبوا بآیاتنا سنستدرجهم من حیث لایعلمون. (سورة الاعراف ۱۸۱. ۱۸۲) اور ہماری مخلوق میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔

قدخلت من قبلکم سنن فسیروافی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین. (سورة آل عمران.۱۳۷) تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گذر چکے ہیں، توتم زمین میں سیر کرکے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔

وتلك الایام نداولها بین الناس. (سورة آل عمران. ۱٤۰) اور یہ دن ہیں کہ ہم ان لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔

ولکل امة اجل. فاذا جاء اجلهم لایستاخرون ساعة ولایستقدمون.

سورۃ الاعراف ۳۴) اور ہر فرقہ کے لئے (موت کا) ایک وقت مقرر ہے
جب وہ آجاتا ہے تو نہ ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں نہ جلدی۔

علمی منتشر اکائیوں میں وحدت وربط

علم کے صحیح مقصد کی طرف رہنمائی اور اسے مثبت تعمیری و مفید اور ذریعۂ یقین بنانے کے سلسلہ میں بعثتِ محمدیؐ اور دعوت اسلامی کے رول کی اس سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت ہے جو اس نے علمی تحریک کی فعالیت و وسعت کے سلسلہ میں ادا کیا ہے۔

علم کی کڑیاں بکھری ہوئی بلکہ بسا اوقات متضاد تھیں، علم طبعیات و حکمت دین سے برسرِ پیکار تھے، حتی کہ ریاضی و طب جیسے معصوم علم کے ماہرین بھی بعض اوقات سلبی والحادی نتیجے نکالتے تھے، چنانچہ یونان کے علماء (جنھوں نے کئی صدیوں تک فلسفہ و ریاضیات میں اپنا امتیاز قائم رکھا تھا) یا تو مشرک تھے یا ملحد تھے، اور یونان کے علوم اور مدارسِ فکر، دین کے لئے خطرہ اور مُلحدین کے لئے سند اور نمونہ بنے ہوئے تھے، اس صورت حال میں یہ اسلام کا بڑا احسان تھا کہ اس نے ایسی وحدت قائم کی جو تمام علمی اکائیوں کو مربوط کر دیتی تھی اور اس کے لئے ایسا کرنا اس لئے آسان ہو سکا کہ اس کا علمی سفر صحیح نقطۂ آغاز (STARTING POINT) سے ہوا تھا، اس نے اسے اللہ پر ایمان، اس سے مدد طلبی اور اس پر اعتماد کے ذریعہ اور "اقرأ باسم ربك الذى خلق". کی تعمیل میں شروع کیا تھا اور آغاز کی صحت اکثر اوقات انجام کی صحت و خیریت کی ضمانت ہو جاتی ہے، اسلام نے قرآن و ایمان کے فیض و فضل سے ایسی وحدت کا انکشاف کیا جو تمام وحدتوں کو مربوط کر دیتی ہے، اور وہ وحدت اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت ہے جس کے بارہ میں اللہ نے اپنے

مومن بندوں کی تعریف کی ہے :۔

ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض . ربنا ماخلقت هذا باطلا. سبحٰنك فقنا عذاب النار. (سورة آل عمران. ۱۹۱) اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! تونے یہ (سب) لایعنی نہیں پیدا کیا ہے، توپاک ہے، سو محفوظ رکھ ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔

زمانۂ ماسبق میں کائناتی وحدتیں (یعنی اس کے مظاہر اور حوادث وتغیرات) انسان کو متضاد نظر آتے اور اسے حیرت واضطراب میں ڈالتے تھے، اور کبھی کفر والحاد اور خالق عالم اور مدبر کائنات کے اوپر طعن واعتراض تک پہونچادیتے تھے، اسے دیکھتے ہوئے ایمان وقرآن پر مبنی، اسلامی علم نے دنیا کو ایسی وحدت عطا کی جو کائناتی وحدتوں کو جمع کرتی ہے، اور وہ اللہ کا غالب ارادہ اور اس کی حکمتِ کاملہ ہے۔

ایک بڑے جرمن عالم ہیرالڈ ہوفڈنگ (HERALD HOFF-DING) اس وحدت کی دریافت اور انسانی زندگی اور علم واخلاق کے تاریخی سفر میں اس کے مؤثر کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"ہر مذہب کا ایمان توحید پر ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئی کی علتِ وجود ایک ہی ہے، اس فکر سے لازمی طور پر پیش آنے والی مشکلات سے قطع نظر یہ ایمان واعتقاد فطرتِ انسانی پر بڑا مفید اور اہم اثر مرتب کرتا ہے، اور اس کے ماننے والوں کے لئے یہ عقیدہ رکھنا آسان ہوجاتا ہے، (بعض اختلافات وتفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے) کہ

عالم کی تمام چیزیں ایک قانونی وحدت میں منسلک ہیں، کیونکہ
علت کی وحدت، قانون کی وحدت کا بھی تقاضا کرتی ہے۔
ازمنۂ وسطیٰ کے دینی فلسفہ نے کثرت میں وحدت کا
تصور لوگوں کے ذہنوں میں بٹھادیا جس سے غیر مہذب انسان
طبعی مظاہرہ کی کثرت کے سبب اس غافل تھا، اور اس کثرت
کے مشاہدہ میں اس لئے غلطاں و پیچاں رہتا تھا کہ اس کے ہاتھ
میں ان میں ربط ذاتی پیدا کرنے کا کوئی سر رشتہ نہ تھا"۔(۵)

مغرب کی بیداری اور علم وتہذیب کے نئے دور کے آغاز میں اسلام کا حصہ

رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) اپنی کتاب THE MAKING OF HUMANITY میں لکھتا ہے:۔

"یورپ کی ترقی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر اسلامی
تمدن کا احسان اور اس کے نمایاں آثار کی گہری چھاپ نہ ہو"۔

وہ آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"صرف طبعی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان مُسلم
ہے) یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں، بلکہ
اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف
النوع اثرات ڈالے ہیں اور اس کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی
ہے، جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی
شروع ہوئی ہیں"۔(۶)

اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ فکر یونان کے احیاء کا نتیجہ تھی، مشہور مؤرخ ایچ۔ جی ویلس (H.G. WELLS) نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ موجودہ دنیا کو قوت اور علم کی روشنی یونان سے ہی ملی ہے، لکھا ہے:۔

> "جس علم کی ابتدا کرنے کے بعد اسے یونانیوں نے خیر باد کہہ دیا تھا، اسے ایک نئے زاویہ اور نئے جوش وخروش کے ساتھ (عربی ذہن) نے نظم وترتیب کے ساتھ اپنا موضوع بنالیا، اگر یونانی، حقیقت کے سائنسی طریقہ انکشاف کے باپ تھے تو عرب اس کے مُربی تھے، جنہوں نے انتہائی صاف گوئی، آسان اور سہل تشریحات، باقاعدہ اور جچے تُلے الفاظ اور جامع تنقید سے اسے سنوارا تھا، یہ صرف عرب تھے نہ کہ لاطینی جن سے جدید دنیا کو علم اور قوت کا تحفہ حاصل ہوا ہے"۔(۷)

قدیم دنیا میں مسلمانوں کا علمی تفوق، اور مفید اور تجرباتی علوم میں ان کی قیادت

میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ مسلمانوں نے صرف عظیم الشان اور وسیع سلطنتوں کی بنیاد نہیں ڈالی، بلکہ ایک زمانہ میں وہ دنیا کی تمام اقوام پر علم وفضل میں بھی فائق تھے، مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو حصولِ علم کے شوق، اس کی بے لوث خدمت اور مختلف علوم میں بیش بہا تصنیفات کے لئے ممتاز رہے ہیں، قرنِ اول کے ائمہ، محدثین اور فقہاء

و مجتہدین سے قطع نظر (جن کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی) مسلمانوں نے دینی اور دنیاوی علوم میں ایسے مفکرین اور مصنفین پیدا کئے جن کا مقابلہ دوسری قوموں کے بڑے سے بڑے عالم سے کیا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں نے اپنے تحصیل علم کا دائرہ صرف مذہبی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انہوں نے جغرافیہ، طبیعیات، نباتات، ہندسہ، طب، کیمیا، فلسفہ، تاریخ و مذاہب و تمدن جیسے علوم کی خدمت بھی کی، ان کے اکثر علماء نے صدیوں تک مختلف علوم وفنون میں دنیا کی رہنمائی کی ہے، اور کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں، یہاں صرف چند مسلمان علماء کا تذکرہ کیا جارہا ہے، کیونکہ کسی طویل تعارف کے لئے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔

مسلمان مُوجدینِ فن اور ماہرینِ علوم

الخوارزمی (م ۸۵۰ء۔ ۲۳۶ھ) نے سب سے پہلے عالمی جغرافیہ پر کتاب لکھی اور پھر محمد بن محمد الادریسی (م ۱۱۵۳ء۔ ۵۶۰ھ) نے **"المسالک والمسالک"** میں عالم اسلام کے تجارتی راستوں کو نقشہ جات کے ساتھ وضاحت سے بیان کیا، ابن الہیثم (م ۱۰۳۹ء۔ ۴۳۱ھ) نے تقریباً دوسو کتابیں تصنیف کیں، جن میں سینتالیس علم ہندسہ پر اور اٹھاون انجینیرنگ کے موضوع پر تھیں، وہ پہلا شخص تھا جس نے اسوان ڈیم کی تعمیر کی تجویز پیش کی، اور علم بصارت (OPTICS) میں مفید انکشافات کئے، اس نے اپنی کتاب **"المناظر"** میں بصری ادراک کے سلسلہ میں یہ نظریہ پیش کیا کہ کسی شئ کی بصارت اس سے ٹکرا کر واپس آنے والی شعاعوں پر منحصر ہے، محمد بن موسیٰ

الخوارزمی (م ۸۵۰ء۔ ۲۳۶ھ) نے علم ہندسہ میں ایک سے نو تک اعداد کے بعد صفر کا اضافہ کیا اور سب سے پہلے اعداد کی حیثیت کا تعین کیا، الخوارزمی نے ہی الجبر (الجبرا) ایجاد کیا، البتانی (م ۹۲۹ء۔ ۳۱۷ھ) جسے مغرب البیٹگنی (ALBA-TEGNI) اور الباطیوس (ALBATENUS) کے نام سے یاد کرتا ہے، عظیم عرب ماہر فلکیات تھا، جس نے گہن کی کجی کا بالکل صحیح اندازہ لگایا، شمسی سال کی مدت، موسموں کی تبدیلی اور سورج کے اوسط مدار کا پتہ چلایا، اور بطلیموس کے اس نظریہ کی تردید کی کہ سورج کا مدار غیر متحرک ہے، ابوبکر محمد الرازی (م ۹۳۲ء۔ ۳۱۱ھ جسے مغرب نے ریز (RHAZES) کا نام دے رکھا ہے عہدِ وسطی کا سب سے بڑا طبیب ہونے کے ساتھ عظیم فلسفی اور ماہر کیمیا بھی تھا، اس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف کتاب "**الحاوی**" میں یونانی، مصری، قدیم عرب اور ہندوستانی طب کا جائزہ پیش کیا۔

ابن البیطار (م ۱۲۴۸ء۔ ۶۴۶ھ) اپنے زمانہ میں عظیم ترین ماہر ادویات تھا، اس نے اپنی دو مشہور تصانیف "**المغنی فی الادویۃ**" اور "**الجامع لمفردات الأدویۃ والأغذیۃ**" میں مختلف بیماریوں کی علامات بیان کئے ہیں، اور حروف تہجی کے اعتبار سے تقریباً چودہ سو حیوانات، نباتات، اور معدنیات کا تفصیلی تذکرہ خود اپنے یا دوسرے ۱۵۰ ماہرین کے مشاہدات کی بنا پر پیش کیا ہے، مشہور عالم بو علی سینا (م ۱۰۳۷ء۔ ۴۲۸ھ جسے مغربی دنیا آوی سینا (AVICEN-NA) کے نام سے جانتی ہے، نے فلسفہ کے موضوع پر "**النجاۃ، الشفاء**"، طب کے موضوع پر "**القانون فی الطب**" اور نفسیات کے موضوع پر "**احوال النفس**"، تصنیف کی، اب تک اس کی ۲۳۱ تصنیفات کا انکشاف کیا جا

چکا ہے، اور ۱۰۰ا دوسری کتابوں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی کی لکھی ہوئی ہیں، طب میں اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی کتاب منظرِ عام پر آنے کے بعد تقریباً پانچ سو برسوں تک یعنی سترہویں صدی کے اختتام تک اپنے موضوع پر سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی تھی، علم کے ان درخشندہ ستاروں میں ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء۔ ۸۰۸ھ) بھی شامل ہے، جو دنیا کا سب سے پہلا ماہر سماجیات ہے، اور جس نے انسانی سماج کو رُخ دینے والے قوانین تلاش کرنے کی جانب توجہ دلائی اور مغرب کے فلسفی (COMTE) کامٹی سے پچاس سال پہلے سماجی علوم کی جانب توجہ مبذول کرائی، دنیائے علم وفن ابو ریحان البیرونی (م ۱۰۴۸ء۔ ۴۴۰ھ) کی سعی کی بھی مشکور ہے، جسے طبیعیات، مابعد الطبیعات، علم الادویہ، کیمیا، جغرافیہ اور تاریخ پر یکساں مہارت حاصل تھی، اس نے اور دوسرے مسلمان سائنس دانوں مثلاً ابن الہیثم نے موجودہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد ڈالی تھی۔

علم کی تاریخ کا سب سے بڑا مغالطہ اور تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ!

اس مقالہ کے اختتام سے پہلے میں آپ کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہمیں یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، انسان اپنی ذات سے علم کا نہ تو مرجع ہے اور نہ مصدر، وہ صرف اللہ کی مرضی کو پورا کرنے والا نائب یا نمائندہ ہے، قرآن مجید نے حضرت آدمؑ کو "**تعلیمِ اسماء**" (جو علم کی بنیاد ہے) کا ذکر ان کے زمین میں خلافتِ الٰہی کے منصب پر سرفراز ہونے کے تذکرہ کے بعد اور اسی سیاق وسباق میں کیا ہے،

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے علم کا استعمال خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے کرنے پر مامور تھے، علم کی تاریخ بلکہ تاریخ عالم کا یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ انسان نے یہ فراموش کردیا کہ وہ خالقِ کائنات کا نائب اور خلیفہ ہے، اسے اس دنیا کی امانت سپرد کی گئی تھی، مالک اور آقا بناکر نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ زمین کے اوپر اور اس کے اندر پائے جانے والے خزانوں کو اپنے ذاتی، قومی، نسلی اور طبقاتی مفاد کے لئے یا سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے، انسانیت کی تاریخ اور علم دونوں کے لئے وہ منحوس ترین دن تھا، جب اس نے تباہی کے اس راستہ کا انتخاب کیا، صرف یہ احساس کہ انسان اس دنیا کا مالک ہونے کے بجائے خدا کا خلیفہ اور نائب ہے، اسے صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتا ہے کیونکہ اس حقیقت کا عرفان ہی اسے من مانی کاروائی کرنے میں مانع ہو سکتا ہے۔

علم کا اس کے مالک سے رشتہ منقطع ہونا واقعتاً بہت بڑا فتنہ ہے، انسان نے علم تو حاصل کرلیا لیکن اس کے ذہن نے علم کے خالق کو فراموش کردیا، آج دنیا تباہی کے دہانہ پر کھڑی ہوئی ہے، یورپ اور امریکہ کے سیاست دانوں اور عالموں اور ان تمام لوگوں سے معذرت کے ساتھ جو مغرب کی تہذیب پر نازاں ہیں، میں یہ عرض کروں گا کہ انسان کا اپنے آپکو خود مختار اور اس دنیا کا حقیقی مالک سمجھ لینا ایک بہت بڑی غلطی تھی، انسان جب اپنی ابتدا کو بھول گیا تو اسے اپنی حیات کا مقصد اور انتہا بھی فراموش ہو گئے، میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ انسان اس وقت تک اس دنیا کے حالات کو سدھارنے میں ناکام رہے گا، جب تک وہ یہ تسلیم نہ کرے گا کہ وہ صرف ایک مخلوق ہے جسے اپنے خالق کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی بھی کرنی ہے، اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اسے جتنا بھی علم حاصل

ہوا ہے وہ اس کے ایک سرے پر کھڑا ہوا ہے، اور دوسرے سرے پر علم کا خالق، اس کا آقا اور مالک موجود ہے، اگر یہ رشتہ منقطع ہو گیا تو انسان اپنی تخلیق کا مقصد بھی فراموش کر دے گا، اور ہماری دنیا ایک میدانِ جنگ اور انسانیت کے ایک ایسے مذبح میں تبدیل ہو جائے گی، جہاں غلامی کی بے شمار اقسام، بے انصافیوں اور انسانیت کی تذلیل کا دور دورہ ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

حواشی :۔

(۱) سیدنا عیسیٰ علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر ۵۷۵ سال گزرے تھے۔

(۲) RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

(۳) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۹۶۔۱۹۷ (لاہور۔ ۱۹۵۸ء)

(۴) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۹۶۔۱۹۷ (لاہور۔ ۱۹۵۸ء)

(۵) HISTORY OF MODERN PHILOSOPHY

(۶) THE MAKING OF HUMANITY

(۷) ایچ۔ جی۔ ویلس THE OUTLINE OF HISTORY لندن ۱۹۲۰ء ص ۲۷۳

مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں

یہ مفکرؒ اسلام کا ایک شاہکار مقالہ ہے۔ جس میں بڑی جامعیت کے ساتھ مسلمانان ہند کو بیدار اور ہوشیار کرنے والی صاف اور بے لاگ باتیں آگئی ہیں، جو انہیں حال کے خطرات سے آگاہ اور مستقبل کے لئے آمادۂ فکرو عمل کرتی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانانِ ہند سے
صاف صاف باتیں

الحمد لله کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں

اس وقت ساری دنیا کے مسلمانوں کے عمومی حالات نے اس بات کی شدید ضرورت پیدا کر دی ہے کہ ان سے بغیر کسی رورعایت اور بغیر کسی اشارہ کنایہ کے کچھ صاف صاف باتیں کی جائیں، یہی ان کے ساتھ سب سے بڑا خلوص اور سب سے بڑی ہمدردی ہے اور اسی میں اپنی اور تمام مسلمانوں کی حفاظت اور سلامتی کا راز مضمر ہے، یہ فریضہ ہر جگہ اور ہر زبان میں ادا ہونا چاہئے۔

ہندوستانی مسلمانوں سے

لیکن خصوصی ذمہ داری اور تعلق کی بناء پر اس وقت روئے سخن ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ہے جن کے تازہ حالات نے ان کو ایک طرف اپنے حالات کا

دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے، دوسری طرف ان میں حقائق وواقعات پر غور کرنے کی نئی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو گئی ہے، مزید بر آں خاص سیاسی و خارجی حالات نے ان کی صورت حال کچھ ایسی بنادی ہے کہ ان کے لئے دین کی کھلی راہ ختیار کرنے اور نصرت الٰہی کے سایہ کے نیچے آنے کے سواکوئی راہ نہیں ہے :۔

قرآن مجید کے معجزانہ الفاظ میں ان کی صحیح تصویر یہ ہے :۔

حتیٰ إذا ضاقت عليهم الأرض بما رحبت و ضاقت عليهم انفسهم و ظنوآ ان لا ملجأ من الله إلا إليه (التوبة ۱۱۸) یہاں تک کہ جب زمین اپنی ہی وسعتوں کے ساتھ ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی طبیعتیں گھٹنے لگیں اور وہ گمان کرنے لگے کہ اللہ سے صرف اللہ ہی کے دامن رحمت میں پناہ ہے۔

سچی حب الوطنی

ایک ذی ہوش، صاحب ضمیر، غیور اور جری قوم کی طرح ہمیں اپنے گرد و پیش کے حالت کا پورا جائزہ لینا چاہئے، اس سلسلہ میں جو غلطی ملک کی جمہوری اور نامذہبی حکومت کی طرف سے اور جو کوتاہی قومی اور ملکی اداروں سے ہو رہی ہو، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے پوری طاقت اور صفائی کے ساتھ اس پر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں کسی بد گمانی یا ریشہ دوانی سے نہیں ڈرنا چاہئے کہ یہی سچی حب الوطنی ہے، جمہوریتیں اسی طرح پنپتی اور پھلتی پھولتی ہیں، اور ملکوں کی سلامتی اور خوش حالی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

دیانت دارانہ وجرأت مندانہ جائزہ

ہمارا اللہ سے عہد ہے کہ اس سلسلہ میں ہم کسی موقعہ پرستی یا مصلحت

شناسی سے کام نہیں لیں گے اور خواہ ہماری آواز کیسی ہی صدا بصحرا ثابت ہو ہم یہ آواز بلند کرتے رہیں گے۔

لیکن کوہ صفا کی صاف گوئی کی تقلید اور رہنمائی میں جب ایک صبح دنیا کے سب سے سچے انسان کی آواز پر مکہ کی وادی کے بسنے والے اس انتظار و اضطراب میں جمع ہو گئے تھے کہ کسی بیرونی خطرہ اور حملہ آور دشمن کی اطلاع دی جائے گی، لیکن ان کو بتایا گیا کہ دشمن ان کے باہر نہیں ان کے اندر ہے اور سب سے بڑا خطرہ وہ ہے جو ان کی گمراہی اور غلط طرز زندگی کے نتیجہ میں ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے، اس کی ضرورت ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو خود اپنے حالت کا جائزہ لینے پر آمادہ اور اس خطرہ سے ہوشیار کیا جائے جو ان پر سایہ فگن ہے، اس سلسلہ میں عقائد اور اعمال و اخلاق سے لیکر ملی فرائض، اجتماعی ذمہ داریوں اور قوانین کے جائزہ کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کے لئے اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کے ارشادات کافی ہیں، یہاں کسی تفصیل کا موقع نہیں، چند باتیں جو قرآن مجید کے محدود مطالعہ کے نتیجہ میں نظر آئیں، لکھی جاتی ہیں۔

حالات کی تبدیلی اور حقیقی حفاظت اور نصرت کے لئے ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

شرک وتوحید کا فرق اور ان کے نتائج وعواقب

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی ایسی قوم جو خدا کے پیغمبر پر ایمان لا چکی ہو اور اس کو آسمانی کتاب دی جا چکی ہو، مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہو جائے تو وہ خدا کی رحمت و قدرت سے دور اور ذلت و بے عزتی کا شکار ہو جاتی

ہے، سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے صاف فرمایا گیا ہے :۔

إن الذين اتخذوا العجل سينالهم غضب من ربهم و ذلة في الحيٰوة الدنيا و كذٰلك نجزي المفترين(الاعراف ۱۵۲)جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اسی دنیوی زندگی ہی میں پڑے گی، ہم افترا پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

دوسری طرف توحید کامل پر صاف صاف عزت و سربلندی، دین کے غلبہ واستحکام اور امن و حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے :۔

وعد الله الذين آمنوا منكم و عملوا الصلحٰت ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم ، وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضىٰ لهم و ليبدلنهم من بعد خوفهم أمنا ، يعبدونني لايشركون بي شيئاً ومن كفر بعد ذلك فأو لٰئك هم الفسقون (النور ۵۵) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بامن کر دے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں، اور جو شخص اس وعدہ کے بعد ناشکری کرے گا تو یہ لوگ بے حکم ہیں۔

نزول قرآن کے بعد جن لوگوں (صحابہ کرامؓ) نے سب سے پہلے اور سب سے مکمل طریقہ پر اس شرط کو پورا کیا ان کے متعلق غیر مبہم الفاظ میں شہادت دی گئی اور تاریخ نے ادب سے سر جھکا کر اس کی تصدیق کی۔

واذكر وآ إذ أنتم قليل مستضعفون في الأرض تخافون أن يتخطفكم الناس فاوٰ كم و أيد كم بنصره و رزقكم من الطيبٰت لعلكم تشكرون (الانفال ـ ۲٦)اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم قلیل تھے زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے، اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ لوگ تم کو نوچ کھسوٹ نہ لیں، سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا کیں تا کہ تم شکر کرو۔

۱۔ بعض مشرکانہ عقائد واعمال

یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ، ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لئے نامانوس ہو مگر حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں کچھ مشرکانہ عقائد واعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کے اعتراف کے لئے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے، اگر شرک کی کوئی حقیقت ہے اور "**عنقا**" کی طرح کوئی خیالی و فرضی پرندہ نہیں، اور اگر قوموں اور ملتوں کے لئے ایک ہی میزانِ عدل اور ایک ہی پیمانہ انصاف ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان (خواہ ماحول سے متاثر ہو کر خواہ علم اور صحیح تبلیغ کی کمی کی وجہ سے) اس ذہنی گمراہی اور بے عملی؍بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں، جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے، اگر کسی کو اس میں شبہ ہو یا وہ کسی خیالی دنیا میں رہتا ہو تو کسی "مرجع خلائق" مزار پر جا کر اور کسی عرس میں شریک ہو کر دیکھ لے یا ان عقائد وخیالات کے سننے کی کوشش کرے جو بہ کثرت عوام اور کہیں کہیں خواص نے اولیائے کرام، بزرگانِ دین اور اپنے سلسلہ کے مشائخ کے متعلق قائم کر رکھے ہیں کہ "**صفتِ خلق**" (پیدا کرنے کی طاقت) "**ایجادِ عالم**"

(عالم کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت) اور مشکل سے ایک دو صفتوں کے علاوہ صفات وافعالِ الٰہی میں سے کون سی صفت اور کون سا فعل و تصرف ہے جو انھوں نے بزرگوں سے منسوب نہیں کر رکھا ہے، اور سجدہ سے لیکر دعا و استعانت تک کون سا معاملہ ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہئے انھوں نے ان ہستیوں کے ساتھ روا نہیں رکھا ہے؟ قرآن مجید ہاتھ میں لے کر کسی بڑی بستی یا خوش اعتقادی کے کسی غالی مرکز میں چلے جایئے اور اس کا امتحان کر لیجئے۔

ایسی حالت میں خالص قرآن کی روشنی میں حفاظت اور نصرت و تائید الٰہی کی کیا امید کی جاسکتی ہے اور رہنمایانِ قوم کی خارجی تدبیریں کیا کارگر ہو سکتی ہیں، جبکہ امن و حفاظت تک کے لئے اس کی شرط کی گئی ہے کہ :۔

یعبدوننی ولا یشرکون بی شیئاً (النور۔ ۵۵) بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔ اس سلسلہ میں علماء و واعظین و واقفین حال کا جو فرض ہے وہ محتاج بیان نہیں، اور اس فرض کے "فرض کفایہ" کے درجہ میں بھی باقی نہ رہنے سے جس عمومی بازپُرس اور مواخذہ کا خطرہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

۲۔ اخلاق و اعمال کا فساد اور اس کے بُرے نتائج

دنیا میں جس طرح اللہ کا قانون طبعی جاری و ساری ہے، ہزاروں برس سے آگ جلاتی ہے پانی بجھاتا ہے، سنکھیا کام کرتی ہے، تریاق زہر کے اثر کو دور کرتا ہے دوائیں، غذائیں، قوت، تعداد اسلحہ، محنت، تنظیم، اور زندگی گزارنے اور کامیابی حاصل کرنے کے آزمودہ اور معروف طریقے بحکم الٰہی اپنا اثر رکھتے ہیں، اسی طرح اس کائنات میں ایک اخلاقی قانون مکافات بھی ہے، اچھے برے اخلاق و

اعمال، افراد اور قوموں کی زندگی میں اپنا اثر اور خاصیتیں رکھتے ہیں، قرآن مجید میں اقوام سابقہ کے تذکرہ میں ان کی تاثیر اور ان کے نتائج کا واضح طریقہ پر ذکر کیا گیا ہے، اور ان افراد اور اقوام کا انجام بتایا گیا ہے جنھوں نے ان اخلاق و اعمال کا مظاہرہ کیا، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، اور قوم شعیبؑ کا حال دیکھ لینا کافی ہے، جن کے خاص امراض و احوال و اخلاق کا انجام بتایا گیا ہے، حدیث شریف میں خاص خاص اخلاق و اعمال کا انجام اور دنیاوی زندگی میں ان کے اثرات اور خاصیتوں کا بہت صاف الفاظ میں تذکرہ ہے، کسی پر بے برکتی، کسی پر امراض و پریشانیوں کی کثرت، کسی پر کثرتِ اموات، کسی پر ذلت و خواری، اور کسی پر بزدلی و مرعوبیت کا اعلان کیا گیا ہے، اس "**طب نبوی**" کا مطالعہ اس دور میں خاص طور پر بہت ضروری اور مفید ہے، اس طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کے ترک پر اطلاع دی گئی ہے کہ دعائیں تک قبول نہ ہوں گی۔ صحیح روایت میں آتا ہے۔

عن حذیفةؓ عن النبی ﷺ قال :والذی نفسی بید ہ لتأ مرن بالمعروف و لتنہون عن المنکر ، أو لیو شکن اللہ أن یبعث علیکم عقاباًمنه ثم تدعو نه فلا یستجاب لکم. (**رواہ الترمذیؒ**) حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے، پھر تم اس کو پکارو تو تمھاری دعا قبول نہ کی جائے۔

اس کے برخلاف توبہ و انابت کی عمومی فضا پر آئے ہوئے عذاب کے ٹل جانے کی خبر دی گئی ہے۔

فلو لا كانت قرية امنت فنفعها إيمانها إلا قوم يونس لما امنوا كشفنا عنهم عذاب الخزى فى الحيوة الدنيا و متّعنٰهم إلىٰ حين (سورة يونس ۹۸) کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ یقین لاتی پھر کام آیا ان کو ایمان لانا مگر یونسؑ کی قوم جب یقین لائی کھول دیا ان پر ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں اور کام چلا ان کا ایک وقت تک۔

فساد عقیدہ، فساد اعمال و اخلاق کے علاوہ مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد نفاق عملی و اخلاقی میں اور خواص و قائدین کی ایک تعداد نفاق اعتقادی تک میں مبتلا ہے ایک بڑی تعداد فرائض کی تارک حتی کہ اسلام کے رکن اعظم نماز سے غافل اور مستقل و علانیہ تارک صلوٰۃ ہے، ضرورت ہے کہ تمام سیاسی و اجتماعی تدبیر وں کے ساتھ (اور حقیقتاً ان سے پیشتر اور ان سے زیادہ) اصلاح اعمال و اخلاق اور فرائض و ارکانِ دین کی پابندی کی دعوت دی جائے اور جزاء الاعمال کے الٰہی قانون کی روشنی میں خوصیت کے ساتھ ان اخلاقی امراض و عملی فسادات سے ملت کو ڈرایا جائے جو بڑے مہیب اجتماعی و عمومی نتائج رکھتے ہیں، اور جن کے لئے قرآن مجید و حدیث میں نص صریح موجود ہے اور بد قسمتی سے بہت سے مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔

۳۔شہرت عزت کا حد سے بڑھا ہوا شوق اور رسم و رواج کی شریعت کی طرح اور اکثر اس سے زیادہ پابندی

ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بھی بڑا اثر رکھتی ہے اور ملی و اجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دور رس ہیں، وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی معاملات پر

اور اپنی دل چسپی کے دائرہ میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر وفاقہ، اضطراب واضطرار اور ان افسوس ناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، فقہ وفتاویٰ کی محتاط ومحدود زبان اور حلال وحرام کے معین حدود واحکام میں خواہ اس کے لئے حرمت کا کوئی صریح فتویٰ اور لرزہ خیز لفظ نہ ملے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی حکیم وعادل ذات اور ربوبیت ورحمت عامہ کی صفات کے لئے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول وزمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو جاں بہ لب مریض دوا اور برہنہ تن شریف عورتیں اور مرد ستر پوشی سے محروم ہوں، کہیں کسی بیوہ کے چولھے پر توا اور کہیں کسی غریب کی جھوپڑے میں دیا نہ ہو، ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں سیکڑوں اور ہزاروں روپئے بے دریغ خرچ کئے جائیں۔

اس سلسلہ کی سب سے زیادہ قابل ملامت ونفرت اور غضب الٰہی بلکہ عذاب الٰہی کو دعوت دینے والی چیز لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ جہیز کا مطالبہ اور فرمائشوں کی وہ فہرست ہے جو لڑکے یا لڑکے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، اور اس کو رشتہ کی شرط قرار دیا جاتا ہے، کہیں اس کو "**تلک**" کی رسم، کہیں "**سلامی**" اور کہیں "**گھوڑے جوڑے**" سے تعبیر کیا جاتا ہے، لڑکی کو اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دینا خلاف شرع وسنت نہیں، بلکہ وہ درحقیقت اپنی اولاد کے ساتھ حسن سلوک وصلہ رحمی ہے، جو فی نفسہ امر مباح بلکہ مستحسن ہے،

آنحضرت ﷺ نے اپنی جگر گوشہ حضرت فاطمہ زہرا ؓ کو جہیز میں روز مرہ کی ضرورت کی چیزیں دیں جس میں ایک خمیل (جھالردار چادر) ایک مشک، ایک تکیہ دیا تھا، جس میں گھانس بھری ہوئی تھی، بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کے دینے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؓ کے پاس جن سے شادی ہو رہی تھی روز مرہ کے استعمال کا سامان بھی نہ تھا، اس سے ان کے اسباب خانہ داری کی فراہمی کی بھی نیت تھی، صحابہ کرامؓ اور ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے مسلمانوں نے اپنی بیٹیوں کو ضرورت کا سامان دیا اور یہ اب بھی جائز و مستحسن ہے، لیکن اب اس کی شکل بالکل بدل گئی ہے، اب نہ ہدیہ مقصود رہا ہے، نہ صلہ رحمی بلکہ ناموری، شہرت کی طلب اور پابندئ رسم رہ گئی ہے، اور اس میں بہت سی ایسی پابندیاں شامل ہو گئی ہیں، جن کی کوئی شرعی اساس نہیں، اس رسم کو پورا کرنے کے لئے لڑکی والے کو اکثر اوقات قرض بھی لینا پڑتا ہے خواہ سود ہی دینا پڑے، یا حویلی، باغ، اور ضروری املاک فروخت کرنی پڑیں، ہندوستان سے باہر ممالک اسلامیہ میں اس کی یہ اہمیت اور اس کا یہ اہتمام نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی معاشرہ کی دین ہے یہ چیزیں جو اکثریتی فرقے اور ہندو سماج سے مسلمانوں میں پچھلے دنوں میں آئی ہے، اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ اس نے شادی کو ایک مصیبت اور دشوار ترین کام بنادیا ہے، اور اس کی وجہ سے افسوسناک واقعات پیش آئے اور آرہے ہیں، جن سے اس غیرتِ خداوندی کے حرکت میں آجانے کا خطرہ ہے جس کی بناء پر سلطنتوں، معاشرتوں اور تہذیبوں کے چراغ گل اور ملک زیروزبر کردیئے گئے ہیں۔

مسلمانوں کا جو حضور رحمۃ للعالمین ﷺ کی امت ہیں فرض تھا کہ ان کی موجودگی میں غیر مسلم معاشرہ میں بھی ظلم عظیم نہ ہوتا، جس کی پاداش میں ملک پر

قہر الٰہی کے نزول کا اندیشہ ہے، اور اپنے کو اس نبی کا وارث و نائب ثابت کرتے جس کے لئے ارشاد خداوندی ہے۔

وماكان الله ليعذبهم وأنت فيهم (سورۃ الانفال ۔ ۳۳) اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اس وقت تک عذاب نازل کرنے والا نہیں ہے، جب تک آپؐ ان میں موجود ہیں۔

ملکی معاشرہ میں یہ بیماری کس حد تک پہونچ گئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے مشہور اخبار "قومی آواز" مورخہ ۱۰۔جون ۱۹۸۴ء کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

> "نئی دہلی ۹۔جون مہلا سرکشا کمیتی کے صدر و ممبر پارلیمنٹ مسز پرمیلا ڈنڈوتے نے کل ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی راجدھانی نئی دہلی میں اب جہیز کے لئے ہر بارہ گھنٹے پر ایک دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے جب کہ اس سے قبل ایک دن میں اس طرح کی ایک موت واقع ہوتی تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ جہیز کے خاتمہ کیلئے اعلان تو بہت ہوتے ہیں، اور اقدام بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ سب کاغذی معلوم ہوتے ہیں کہ ان سے صورتِ حال میں بظاہر کوئی سدھار نہیں آیا ہے، بلکہ وہ دن بدن ابتر ہوتی جارہی ہے، جہیز کا سودا جیسے پہلے ہوتا تھا اب بھی دھڑلے سے ہو رہا ہے اور لڑکی والے جہیز کا بندوبست کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے باوجود ان کی لاڈلی اولاد کو جلا کر بھسم کر دیا

جاتا ہے"۔

ایک دوسرے اخبار "**دعوت**" دہلی کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو :۔

گزشتہ سال دہلی میں ۶۱۰ عورتیں جل کر ہلاک ہو گئیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر روز اوسطاً دو عورتیں جل کر ہلاک ہوئیں، ان میں سے صرف چالیس عورتوں کی اموات کی وجہ جہیز کے تنازعات بتائی گئی تھی، گزشتہ سال جولائی میں جہیز کے تنازعات سے ہونے والی اموات کے مقدمات کی سماعت کے لئے ایڈیشنل سشن جج مسٹر ڈے کپور کو جج مقرر کیا گیا تھا، جب سے اب تک ان کی عدالت میں جہیز کی وجہ سے اموات کے صرف گیارہ مقدمات پیش کئے گئے ہیں، ان میں سے چار کی سماعت مکمل ہو گئی ہے، اور ان مقدمات میں انھوں نے عمر قید کی سزا سنائی ہے، ایک اور ایڈیشنل سشن جج مسٹر ایس ایم اگر وال نے گزشتہ مئی میں جہیز کی وجہ سے ایک عورت کی موت کے مقدمہ میں سزائے موت کا حکم سنایا تھا، یہ یقین کرنے کی مناسب وجوہات موجود ہیں کہ جہیز کی وجہ سے اموات کی تعداد درج کئے گئے مقدمات کے مقابلہ میں زیادہ ہو گئی"۔

لیکن افسوس ہے کہ خود مسلم معاشرہ میں مرض داخل ہو گیا ہے، اور مسلمان اس کو دینداری، بلکہ انسانیت و شرافت کے بھی خلاف نہیں سمجھتے اور فہرست میں سے کسی ایک چیز کی تکمیل نہ ہونے پر مہینوں اور بعض اوقات برسوں

منکوحہ بیوی یا بہو کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ضرورت ہے کہ اس کے خلاف ایک طوفانی مہم چلائی جائے اور مسلمانوں کے دینی شعور اور جذبے کو بیدار کیا جائے اور اس رسم کا بالکلیہ استیصال اور قلع قمع ہو جائے، ورنہ اس کے نتیجہ میں کسی بلائے آسمانی، یا آفت ناگہانی کے ظاہر ہونے کا خطرہ ہے، باقی اس کے معاشرتی خاندانی اخلاقی نتائج بد ظاہر ہو رہے ہیں وہ کسی کی نظر سے مخفی نہیں۔

۴۔مسرفانہ تقریبات

شریعت کی روح، دین کے مزاج اور انسانی واخلاقی نقطۂ نظر سے کسی طرح اس کا جواز نہیں نکل سکتا کہ جب ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہو رہی ہوں، لاکھوں آدمیوں کو قوت لایموت حاصل نہ ہو رہی ہو، اور وہ جسم و جان کا رشتہ بھی قائم نہ رکھ سکتے ہوں، ملت کے لاکھوں بچے فیس اور کتابوں اور ضروری مصارف کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہوں، ہزاروں ادارے جو ملت کے لئے روح کا حکم رکھتے ہیں اور بیسیوں منصوبے جن کی تکمیل کے بغیر اس ملت کا وجود مشکوک اور اس کا مستقبل تاریک ہے، موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں، ہمارے اہل ثروت تجار اور ذی حیثیت لوگ اپنی اولاد کی شادیوں، خوشی کی تقریبوں اور رسومات کی تکمیل میں پانی کی طرح روپیہ بہائیں، زمانہ کے بہت سے تغیرات وانقلابات اور علم و ترقی کے باوجود مسرفانہ اور **"شاہانہ"** شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا، البتہ بعض جگہ انھوں نے جدید (ماڈرن) طرز اختیار کرلیا ہے اور سیاسی مصالح و مقاصد بھی کہیں کہیں ان سے وابستہ ہو گئے ہیں، آج بھی ہماری بہت سی برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائدین شہر میں تقریبات پر جو

ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا، دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں مگر انھوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے اور اس میں اچھے اچھے لوگ ان آیات کا مصداق ہیں۔

أرأيت من اتخذ إلهه هواه (سورة الفرقان ٤٣) آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔

بل قالوا إنا وجد نا ابائنآ علىٰ امة وّ إنا علىٰ اثارهم مهتدون (سورة الزخرف۔ ۲۲) بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے، اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے رستہ چل رہے ہیں۔

حقیقتاً اس سلسلہ میں سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ان فرائض و تقریبات کا تخیل و مفہوم یکسر بدلنے کی ضرورت ہے، اس کے خلاف اعلان جنگ اور اعلان بغاوت کی ضرورت ہے، اس بات کو صاف طریقہ پر واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لئے غضب الٰہی کا باعث ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحیم و حکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس جھوٹے نام و نمود اور اس عارضی رونق و زینت یا کام و دہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کی جائے جو سیکڑوں ضرورت مندوں کے کام آسکتی تھی۔

ایک مثالی واقعہ

خوش حال و سربرآوردہ مسلمانوں کے سامنے یہ واقعہ آنا چاہئے کہ مدینہ منورہ کی محدود و مختصر آبادی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نکاح کرتے ہیں اور اس ذات گرامی کو اطلاع بھی نہیں ہوتی جس کی شرکت و موجودگی ہر دم کے لئے

باعث فخر و زینت تھی، خصوصاً ایک جلیل القدر صحابی اور مہاجر کے کاشانہ کا چراغ بجا طور پر تھی، جس نے ابھی ابھی اس نئے شہر میں قدم رکھا تھا اور جس کے سارے تعلقات اسی مہاجر برادری سے قائم تھے، اور یہاں کی رونق و برکت سب اسی ذات عالی کے طفیل تھی، جس سے ازدواجی زندگی کا یہ طریقہ اور اس کے یہ احکام معلوم ہوئے تھے، آج دور دراز کے عزیزوں اور دوستوں کو یہاں تک ان ملکوں سے جہاں پاسپورٹ اور ویزا ہے مدعو کیا جاتا ہے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی شادی کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو اس وقت ہوتی ہے جب ان کے کپڑوں پر خوشبو کا نشان ملاحظہ فرمایا جاتا ہے، پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شادی کرلی ہے۔ اس وقت برکت کی دعا کی جاتی ہے اور ولیمہ کے لئے ہدایت ہوتی ہے، خواہ ایک بکری ہی ذبح کر کے ہو۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان "**حوصلہ مندیوں**" پر جن کا ان مواقع پر اظہار کیا جاتا ہے، ہمارا ذمہ دار طبقہ اپنی پوری ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرے، ان حوصلہ مند حضرات کو بھی سوچنا چاہئے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات، مسلمانوں کی معاشی پستی اور بدحالی بلکہ فلاکت اور ہلاکت کے دور میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ کوئی فرد اپنے یہاں کی کسی ایک تقریب پر اتنے مصارف کردے جس سے ایک برادری کی پرورش یا مکمل ادارہ کا انصرام ہوسکتا ہے؟ ان کو آخرت کے مؤاخذہ اور حساب سے بھی ڈرنا چاہئے، جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا، اور افراد و ملت کی شدید ضروریات کی موجودگی میں اس دریادلی کا جواز پیش کرنا ہوگا، جو اپنی ذات تک محدود تھی۔

۵۔ ملی اور اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں سے چشم پو

شی اور ملت کی حفاظت و تقویت سے غفلت

قرآن مجید سے یہ بات صاف طریقہ سے ثابت ہوتی ہے کہ امت کے ملی اور اجتماعی تقاضوں اور دین کی حفاظت و اشاعت کے مطالبہ اور اس کی ضرورتوں میں اپنا مال صرف کرنے سے آنکھیں بند کر کے افراد کا اپنے ذاتی کاروبار اور اپنی معاشی ترقی واستحکام کی فکر و کوشش میں انہماک صریح خودکشی کے مرادف ہے اور جماعت یہ غلط راستہ اختیار کرتی ہے، وہ اپنے ہاتھوں ہلاکت کے غار میں گرتی ہے اور اس شاخ پر تیشہ چلاتی ہے جس پر اس کا آشیانہ ہے بلکہ کھلے لفظوں میں وہ اپنے ہاتھوں زہرناب کا پیالہ پیتی ہے قرآن مجید کے صاف لفظ ہیں۔

و أنفقوا فی سبیل الله و لا تلقوا بأیدیکم إلی التهلكة (سورة البقرة۔ ۱۹۵) اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اس آیت کے محرم راز میزبان نبوت حضرت ابو ایوب انصاریؓ تھے، انھوں نے قسطنطنیہ کے محاصرہ میں ان لوگوں کو ٹوکا جو اس آیت سے دین کے راستہ میں قربانی اور خطرہ میں پڑنے کی مخالفت نکالتے تھے، اور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس آیت کی رو سے جو کسی دینی مقصد کے لئے اپنی جان پر کھیل جائے یا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلے وہ خودکشی کا مرتکب ہے، انھوں نے فرمایا کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جب ایک عرصہ کی مالی قربانیوں اور عملی سرفروشیوں کے بعد اسلام کے قدم مدینہ میں جم گئے، اور اسلام کے سپاہی اور مجاہد پیدا ہو گئے، تو ہم نے سوچا کہ اب کچھ روز کے لئے ہم اسلام کی نصرت اور خدمت (اور گویا اس سلسلہ کے بے پایاں مصارف سے) عارضی رخصت لے کر کچھ عرصہ کے لئے اپنے ذاتی کاروبار، باغات، زراعت اور ان تجارتوں کو سنبھالیں اور ان کی دیکھ بھال

میں ہمہ تن مشغول ہو جائیں جو ہماری تبلیغی اور مجاہدانہ سرگرمیوں اور روز شب کی مشغولیت کی وجہ سے سخت متا ثر ہوئی تھیں اور ان پر کاری ضرب پڑی تھی۔ حضرات انصار کے دل میں یہ وسوسہ بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ اسلام کی خدمت اوور اس کی قربانیوں سے مستقل طور پر سبکدوشی اور آزادی حاصل کر لیں انھوں نے محض وقتی طور پر عارضی رخصت اور اجازت لینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ان صریح اور ڈرادینے والے لفظوں میں ان کی تنبیہ کی گئی اور بتلایا گیا کہ دین وملت کی مدد سے (عارضی) دست کشی اور انفرادی سرسبزی اور بہبود کا خیالی منصوبہ بھی کھلی خودکشی کا مرادف ہے، اس سے غیر مشتبہ طریقہ پر یہ ثابت ہو گیا کہ افراد کا وجود ملت سے ہے، اور ملت ہی کی حفاظت اور استحکام میں ان کی حفاظت اور استحکام کا راز مضمر ہے، جس طرح پتوں کی سرسبزی وشادابی درخت سے جدا ہونے کے بعد کسی خارجی کوشش اور کسی بڑی سے بڑی ذہانت اور صنعت سے بھی ان کو سرسبز وشاداب نہیں رکھا جاسکتا، اسی طرح ملت کے افراد کی زندگی اور اس کا نمو وارتقاء بھی ملت ہی سے مربوط ہے، اور ہر دور میں ان کے لئے پیام ازلی اور قانون زندگی یہی ہے کہ ؎

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

افراد موج ہیں اور ملت ایک رواں دریا، دریا کے بغیر موجوں کا تصور ممکن نہیں ؎

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اسی طرح ملت اسلامیہ کے افراد کسی ملک میں ملت سے کٹ کر اور اس کے ملی اور اجتماعی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض انفرادی خوش حالی، معاشی ترقی، ذاتی سرمایہ اور تمول، ذاتی منصب واعزاز و شخصی حفاظت وضمانت پر کبھی زندہ محفوظ وباعزت وباوقار نہیں رہ سکتے، ملت کے کھلے ہوئے اجتماعی تقاضوں اور

ضرورتوں کی تکمیل سے افراد کا پہلو تہی کرنا اور ان کے بارے میں تغافل سے کام لینا اور اپنے کاروبار کی ترقی اور اپنے محدود خاندانوں کی بہبود و آسائش پر اپنی توجہ مرکوز کر لینا اور اپنی خیالی جنت میں مست رہنا اور اسی کو حقیقی مسرت و کامیابی سمجھنا اپنے حق میں کانٹے بونا اور پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے ممالک اسلامیہ کی پوری تاریخ اور مسلمانوں کا سابق طرز عمل اس اعلان کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے، جس نسل یا ملک کے مسلمانوں سے یہ غلطی ہوئی اور انھوں نے اس کو تاہ نظری اور کوتاہ اندیشی سے کام لیا وہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے گئے اور ان کی زندگی کا تار پود بکھر کر رہ گیا، اندلس، بخارا اور سمرقند کی تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔

دانش مندانہ جدوجہد کی ضرورت

ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایک فیصلہ کن مرحلہ سے گزر رہے ہیں، یہاں ملت اسلامیہ ہندیہ کی بقا کے لئے بڑی پُر عزم لیکن دانشمندانہ جدوجہد کی ضرورت ہے، یہاں مسلمانوں کے ملی وجود ان کی اجتماعی شخصیت و انفرادیت کی بقا کے لئے کچھ کاموں کی تکمیل ضروری ہے، وہ اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت سے رہیں، محفوظ ہوں، باعزت ہوں، موثر اور فیصلہ کن ہوں، حالات وواقعات سے عہدہ بر آ ہو سکیں، زمانہ اور ایک ترقی کرنے والے ملک کے قافلہ کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں بلکہ ضرورت ہو تو ان کی رہنمائی اور کارواں سالاری کا فرض بھی انجام دے سکیں، قیادت کی ذمہ داریاں بھی سنبھال سکیں اور اس ملک کو مہیب خطرہ اور مہلک زوال سے بچا سکیں، اس کے لئے چند تعلیمی و تعمیری کوششوں اور تحریکوں اور عظیم اداروں اور فکری مرکزوں کی ضرورت ہے، ان تحریکوں اور اداروں کا وجود اور ان کا استحکام و ترقی اس ملت کے وجود کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے

جو ہوا اور پانی ایک زندہ انسان کے لئے، اگر یہ تحریکیں اور ادارے سرسبز، توانا اور روبہ ترقی ہیں تو ملت کا وجود محفوظ، اس کا مستقبل روشن اور ملک میں اس کا مقام معین ہے، کسی اکثریت یا فرقہ کا تعصب و تنگ نظری یا حکومت کی کمزوری و جانب داری اس کے وجود کو ختم یا اس کے مستقبل کو تاریک نہیں بنا سکتی، اور کوئی بڑے سے بڑا فرقہ وارانہ فساد اس کی قسمت پر مہر نہیں لگا سکتا۔

مفلس کا چراغ

لیکن اگر اس ملت کے افراد اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر میں ہمہ تن مشغول و منہمک ہیں، اس کے متمول اور با استطاعت افراد ملی تقاضوں اور ضرورتوں سے غافل ہیں وہ اپنی "خواہشات" اور "حوصلہ مندیوں" پر تو بے دریغ اور شاہانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ روپیہ صرف کر سکتے ہیں، لیکن احیاء و بقاء ملت کی تحریکیں اور ادارے سرمایہ کی کمی کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں یا وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کا حال وہ ہے جو شاعر نے اپنے دردمند دل کے متعلق لکھا ہے ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

تو پھر یہ افراد (خواہ سرمایہ کے لحاظ سے قارون وقت ہوں) ہر وقت خطرہ سے دوچار ہیں، اللہ کی نگاہ میں ان کی پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں، حالات کی کوئی خفیف سی تبدیلی اور واقعات کی کوئی ہلکی سی لہر بھی ان کے ان چھوٹے چھوٹے مصنوعی حصاروں کو ریت کی دیواروں کی طرح بہا کر لے جائے گی، اور کسی دن جب آنکھ کھلے گی تو ان کو نظر آئے گا کہ وہ دفعتاً ہر چیز سے محروم ہو گئے ہیں، اور ایک تن آسان اور خدا فراموش اور فرض ناآشنا قوم کی طرح ان کا حال بھی یہی ہو گا:۔

فأتٰهم الله من حيث لم يحتسبوا و قذف في قلوبهم الرعب(الحشر ۔ ۲)
توان پر آیا اللہ کا عذاب ایسی جگہ سے کہ ان کو گمان بھی نہ تھا، اور اللہ نے ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب۔

۶۔تعمیری و تعلیمی اداروں اور مرکزوں کی زبوں حالی اور حفاظت و اشاعت اسلام کی کوششوں کی کس مپرسی

ہندوستان کی یہی صورت حال ان لوگوں کو (جن کی سنت اللہ اور آئین الٰہی پر ذرا بھی نظر ہے) لرزہ بر اندام کئے ہوئے ہے، ہندوستانی مسلمان ساری سیاسی تبدیلیوں اور معاشی انقلاب کے باوجود اب بھی اتنے سرمایہ کے مالک ہیں کہ یہاں احیاء وبقائے اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کی ہر تحریک اور یہاں کے مرکزی دینی و تعلیمی ادارے بخوبی چل سکتے ہیں، اور ایک لمحہ کے لئے ان کو مالی بحران سے دوچار ہونے، دوسرے ملکوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، نہ اپنے اصلاحی و تعمیری پروگرام میں اختصار یا التواء کی ضرورت ہے لیکن کتنی تحریکیں ہیں جن کی کامیابی کے بغیر مسلمانو کا تعلیمی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، کتنے ادارے ہیں، جن کے بغیر مستقبل میں مسلمانوں کے متعلق یہ کہنا ممکن نہ ہوگا کہ ؎

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

کتنے مرکز ہیں جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نوجوانوں کو ذہنی، تہذیبی ارتداد سے (جو سیلاب کی طرح آرہا ہے) بچانے میں مدد دے سکتے ہیں، نوجوانوں کے ذہن میں اسلام اور اس مستقبل پر اعتماد (جس کو مغربی تعلیم و افکار نے متزلزل کردیا ہے) بحال کرسکتے ہیں، مستشرقین مغرب کے پھیلائے ہوئے زہر کیلئے (جو ان سب دماغوں کو مسموم کررہا ہے، جن کے ہاتھ میں مسلم ممالک کی قیادت ہے)

تریاق مہیا کر سکتے ہیں، اور ان کا علمی محاسبہ کر کے ان کو بے اثر بنا سکتے ہیں، کتنے مرکز ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اسلام کے ابدی قانون اور زندگی کے رواں دواں قافلہ کے درمیان رفاقت و مطابقت پیدا کر سکتے ہیں، اور اس طبقہ کو جو واقعات و حقائق سے دوچار ہے نئی رہنمائی، نیا اعتماد اور نیا ایمان عطا کر سکتے ہیں، اور اس کام کو دوبارہ جاری کر سکتے ہیں جو متکلمین اسلام نے اپنے اپنے وقت میں انجام دیا، کتنے افراد و ادارے ہیں جو مغربی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی بولیوں میں اسلام اور قرآن و سیرت نبوی کا تعارف کرا سکتے ہیں، اور ان سب سعید روحوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں جو حق کی جویا اور جمالِ جہاں آرا نبوی کی نادیدہ عاشق ہیں، زیر تعلیم مسلمان نوجوانوں کی حفاظت و تربیت کے لئے کتنے منصوبے ہیں جو ان کو الحاد و فساد کا لقمۂ تر بننے سے بچا سکتے ہیں اور ان کے اندر ایمان کی چنگاری کی حفاظت کر سکتے ہیں، لیکن یہ سب تحریکیں اور ادارے یا تو وسائل کے فقدان کی وجہ سے ایک خواب شیریں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے یا اگر کہیں وجود میں آگئے ہیں تو جیسا کہ عرض کیا گیا مفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

۷۔ انگریزی اور ہندی پریس کی غیر موجودگی

دنیا میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کسی ملک میں پندرہ کروڑ کی ایک اقلیت پائی جاتی ہو، جن میں لاکھوں کی تعداد میں بڑے سرمایہ دار اور لاکھوں کی تعداد میں بڑے تعلیم یافتہ حضرات موجود ہوں، سیاسی حالات اور پچھلی تاریخ نے اس کے گرد تعصبات اور غلط فہمیوں کا جال پھیلا دیا ہو، سیاسی جماعتوں کی مصلحتوں اور تنگ نظر فرقہ پرستی نے اس کو کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہو، ہر وقت اس کے متعلق بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کا امکان ہو، وہ اگر مظلوم و معصوم ہو تو

اس کو ظالم و خونخوار ثابت کرنا، وہ اگر اپنی حفاظت خود اختیاری کا فرض بھی انجام نہ دے تب بھی اس کو دست درازی اور لشکر کشی کا مجرم ٹھہرانا، وہ اگر مقتول ہو تو اس کو قاتل گردانا آسان ہو، اس کا مخالف پریس ہر وقت رائی کو پربت اور افسانہ کو حقیقت بنا سکے، لیکن اس سب کے باوجود اس ملت کے پاس کوئی طاقتور پریس نہ ہو، اس برعظیم کے طول و عرض میں اس کا ایک بھی انگریزی روزنامہ نہ ہو، ہندی میں اس کی آواز پہونچانی مشکل ہو، ملک کے ذمہ دار صاحب اختیار حلقہ اور ارباب حکومت تک (انکی مانوس زبان میں) حرف شکایت تک پہونچانا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا بھی ممکن نہ ہو، لیکن ہر طریقہ سے اس ملت کی خوش حالی کا اظہار ہوتا اور معاشی منصوبوں سے لے کر دینی شعبوں اور خیراتی کاموں تک وہ اپنی زندگی اور اولعزمی کا ثبوت دیتی رہتی ہو، دینی جذبہ اور سیاسی شعور سے **قطع نظر اس ملت کی** عقل عام (COMMON SENSE) کے متعلق کہا جائے گا ؂

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

پھر اس ملت کو کسی دوسرے فرقہ، کسی دوسری جماعت یا حکومت کی شکایت کرنے کا کیا حق ہے اور کسی بڑے سے بڑے واقعہ پر چیں بہ جبیں ہونے کا کیا موقعہ ہے؟ ملک کے کسی گوشہ میں فرقہ وارانہ فساد کا ہو جانا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اس پر جتنی توجہ کی جائے کم ہے، مظلوم و متاثر مسلمانوں کی ہر قسم کی امداد نہ صرف دینی بلکہ اخلاقی فرض ہے، مسلمان اپنا پیٹ کاٹ کر اور اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی اگر اس فساد زدہ علاقہ کی مدد کریں تو بے جا نہیں، فساد زدہ علاقوں کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ ادائے فرض اور احساس فرض کی

معمولی مثال ہے جس پر کوئی تعجب ہونا نہیں چاہئے، جو کچھ ہوا وہ کم ہے اس سے بھی زیادہ حمیت دینی اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، لیکن یہ بات اس وقت خواہ کیسی بھی سمجھی جائے بہر حال حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں، اندیشہ ہے کہ فساد زدہ علاقوں کی مدد کہیں خدانخواستہ ایک "**سالانہ عرس**" نہ بن جائے، جس میں مسلمانوں کی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں مصروف ہو کر رہ جائیں۔

مسلسل عمل جراحی اور مسلسل مرہم گری، زندہ قوم کے شایان شان نہیں

ہمیں اس صورت حال کو کسی حال میں گوارا نہ کرنا چاہئے، اور اس کو روایت نہیں بننے دینا چاہئے، وہ ملت بڑی قابل رحم اور بڑی بد قسمت ہے جو ایک طرف مجروح و مظلوم ہو اور دوسری طرف ملت کے سارے وسائل اس کی چارہ سازی میں صرف ہوں، ایک طرف زخم لگے اور دوسری طرف مرہم لاکر رکھا جائے، یہ ملت ہر گز اس مسلسل عمل جراحی اور مسلسل مرہم گری کے لئے پیدا نہیں ہوئی، فسادات کے سلسلہ کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے لئے، ملت کے حالات میں تبدیلی کی ضرورت ہے ان ناکوں کے بند کرنے کی ضرورت ہے جن سے یہ فسادات ملت کے حصار میں داخل ہوتے ہیں، یہ ناکے بیرونی سے زیادہ اندرونی ہیں، ایسی فضا اور صورت حال کے پیدا کرنے کے لئے کہ فسادات کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، احیاء وبقاء اسلام اور حفاظت مسلمین کی ٹھوس تعمیری، انقلاب انگیز اور مستقل اور مسلسل تحریکوں اور اداروں کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تحریکیں فروغ نہیں پائیں گی اور اتنی طاقتور و موثر نہ بن جائیں کہ سپر کا کام دے سکیں اس وقت تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔

قریبی واقعات نے پھر ایک بار اس کا موقعہ پیدا کر دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان پوری صورت حال کا دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں موجودہ واقعات کے حقیقی اسباب تلاش کریں اور ان کے مستقل انسداد و ازالہ کے طریقوں پر غور کریں اور سطحی و وقتی و جذباتی طریقوں کے بجائے اللہ کی کتاب سے رہنمائی حاصل کر کے صحیح طریق علاج اختیار کریں، مسلمانوں کا طریق فکر و نظر عام اقوام عالم کی طرح نہیں ہو سکتا، نہ ان کی بیماریاں اور مصائب و پریشانیاں عام ملل و اقوام کی طرح محض تکوینی و طبعی ہیں، نہ ان کا علاج محض تکوینی و طبعی ہے، اس ملت کے بگاڑ کا سبب اور اس کی پریشانیوں کا سرچشمہ بھی الگ ہے، اور اس کے انسداد کے طریقے بھی الگ!

۹۔حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور جوش خطابت

ہندوستانی مسلمانوں کی ان کمزوریوں میں جو اس اخیر دور میں (اور کہا جاسکتا ہے کہ تحریک خلافت کے بعد سے جس کا بلا شبہ ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری میں بڑا حصہ ہے) ان کا قومی مزاج بن گئی ہیں، ان کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور جوش خطابت ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ حوادث اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اور نازک و اہم ذمہ داریوں اور آزمائشوں سے عزت کے ساتھ عہدہ بر آ ہونے کے لئے عزم راسخ جذبۂ قوی، مہم جوئی و خطر پسندی کا بڑا دخل ہے اور قوموں اور ملتوں کی تاریخ میں اس کی کھلی شہادتیں ملتی ہیں، لیکن دانشمندی اور فرزانہ قیادتوں کو اس جذباتیت، قلبی جوش و تاثر اور اس کے لئے مؤثر اور شعلہ نوا خطابت سے بڑے احتیاط و تناسب کے ساتھ کام لینے کی ضرورت ہے، ورنہ کچھ دنوں کے بعد یہ جذباتی ہیجان اور یہ آتش نوائی اپنا اثر کھو دیتی ہے اور

"بھیڑیا آیا بھیڑیا آیا!" کی قدیم کہانی دہرائی جاتی ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہئے کہ الفاظ کا بھی ایک درجۂ حرارت وبرودت اور خاص (TEMPERATURE) ہوتا ہے، اگر معمولی حرارت کے موقعہ پر آخری درجۂ حرارت کے الفاظ استعمال کر لئے جائیں، تو وہ الفاظ کا غلط استعمال، محل ومقام سے صرف نظر اور سامعین کے ساتھ ایک طرح کا دھوکہ ہو گا، حقیقت پسندی اور تعمیری ذہن رکھنے والی با مقصد قومیں اور ملتیں اور ان کے قائد ورہنما اس بارے میں بڑے محتاط وحساس ہوتے ہیں، جس طرح زرومال کے معاملہ میں اسراف، فضول خرچی اور حد سے تجاوز مذموم ہے، ایسے ہی الفاظ کے معاملہ میں، خصوصاً جب وہ قوموں اور ملتوں کی زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا کریں، اور ان کو بعض اوقات ایسے واقعات ونتائج رونما ہوں جن کی تلافی ممکن نہ ہو سکے زرومال سے زیادہ (جن کا اثر افراد اور خاندانوں تک محدود رہتا ہے) الفاظ کے استعمال اور سامعین کو جوش دلانے کے بارے میں زیادہ احتیاط واعتدال کی ضرورت ہے۔

جوش انگیز تحریکوں کے بعد سے دیکھا جارہا ہے کہ ایسے جلسوں میں بھی جن کا مقصد اصلاحی وتعمیری یا اپنے ملی مسائل اور شکایات کا پیش کرنا ہوتا ہے، جلسہ کے مقررین کے درمیان سامعین کے جذبات کو برانگیختہ کرنے اور خطابت کا جوہر دکھانے کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، اور جو الفاظ انتہائی ضرورت کے موقعہ پر بعض اوقات کبھی سالہا سال کے بعد استعمال کئے جانے چاہئیں وہ بے تکلف روزمرہ کے جلسوں میں استعمال کئے جاتے ہیں، اور ایک مقرر کے بعد جب دوسرا مقرر آتا ہے تو وہ پہلے کو اپنی آتش نوائی اور سحر انگیزی سے بھلا دینا چاہتا ہے، اگر ایک کہتا ہے کہ "ہم سروں کا قطب مینار کھڑا کر دیں گے" دوسرا کہتا ہے کہ "ہم خون کا بحر احمر

جاری کر دیں گے" علی ھذا القیاس پھر جب ان آخری لفظوں کے بعد بھی کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا تو سننے والوں پر یہ الفاظ بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں، اور ان کی قوت عمل کو نقصان پہونچانے کے سوا ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

خاص طور پر جس ملک میں مختلف فرقے اور قومیں آباد ہیں اور جہاں حالات کی تبدیلی کے لئے جمہوری طریقے بھی مؤثر و مفید ہوں وہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، بعض وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان قوم پیدائشی خطیب اور مقرر ہے، اور اس کا ہر فرد پورے جوش و خروش کے ساتھ تقریر کر سکتا ہے، اس کے بالمقابل ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں نے بڑے بڑے سیاسی معرکے سر کئے اور مخالف طاقتوں کو اپنے سامنے جھکا لیا، انھوں نے اس سے کم جوش خطابت اور الفاظ کی بازیگری سے کام لیا اور وہ اب بھی متوازن و بقدر ضرورت خطابت سے بڑے بڑے مسائل حل کر رہی ہیں، لیکن ہماری قومی مجالس اور ان کی "دھواں دھار" تقریروں کے نتیجہ میں خود مسلمانوں کا مذاق اس گرم مسالہ اور تیز مرچ کھانے والے کا ہو گیا ہے، جس کو اس سے کم پر تسکین نہیں ہوتی اور وہ ہر وقت ھل من مزید کا نعرہ لگاتا رہتا ہے،

قوموں اور ملتوں کی زندگی میں جن کو اپنی باعزت ملّی زندگی کے لئے ایک لمبی مسافت طے کرنی ہے، بے ضرورت اور حد سے بڑھی ہوئی تیز روی جو تھوڑی مسافت میں تھکا کر بے دم کر دے، کوئی دانش مندانہ عمل اور حقیقت پسندانہ مشورہ نہیں، اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کے داعیانہ و مصلحانہ مزاج و مقام سے بھی ہم آہنگ نہیں۔

۹۔ طویل المیعاد اور صبر آزما جد و جہد سے عدم مناسبت

اس حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور جوش خطابت کا ایک قدرتی و نفسیاتی

نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایسے کاموں سے مناسبت ختم یا کم ہوتی جا رہی ہے جو صبر واستقلال، مسلسل جد جہد، اور ایک طویل المیعاد سعی و عمل کے محتاج ہیں، جن کے فوری نتائج نکلنے کا بہت کم امکان ہے، اور جو بعض اوقات پہاڑ تراش کر جوئے شیر لانے کے مرادف ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں ان کو سر کٹا دینا اور گھر لٹا دینا آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن زیادہ دن کسی تکلیف کو برداشت کرنا اور کسی کام میں محنت کرنا ان کے ملی مزاج کے خلاف ہو گیا ہے۔

یہ افتاد طبع اور ایک بڑے پیمانہ پر یہ صورت حال بڑی تشویشناک ہے، اس لئے کہ قوموں اور ملتوں کو عزت کا مقام حاصل کرنے اور ملی مسائل کو حل کرنے اور اپنے ملی تشخصات کی حفاظت اور ایک باعظمت صاحب دعوت، اور حامل پیغام ملت کی طرح زندگی گزارنے کے لئے فوری قربانیوں اور جوش و جذبات کے مظاہرہ سے زیادہ خاموش، مسلسل جد جہد اور صبر واستقلال کی ضرورت ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت اور عالم گیر صداقت ہے کہ اقلیت کو عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے اکثریت کے مقابلہ میں سو گونہ بلکہ چہار گونہ محنت اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی اصول پر (ناگواری اور مجبوری کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) یہودیوں نے امریکہ میں، اور بیشتر مغربی ممالک میں اپنی زندگی، صلاحیت اور مشکل پسندی کا ثبوت دیا، اور اس نے ملک و حکومت میں وہ اثر و نفوذ حاصل کر لیا جس کا اس عددی تناسب کے ساتھ کوئی میل نہ تھا۔ لیکن ہندوستان واحد ملک ہے جہاں مسلمان اقلیت اکثریت کے مقابلہ میں دو گونہ اور سہ گونہ محنت کے بجائے برابر کی محنت بھی نہیں کرتی، اور اس کا نتیجہ ہے کہ وہ مقابلہ کے امتحان میں امتیاز حاصل کرنے اور بڑے اور ذمہ دارانہ عہدوں میں حصہ پانے سے محروم ہوتی جا رہی

ہے، اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی پسماندہ اور اچھوت اقوام کی صف میں آجائے یا اس سے بھی پچھڑ جائے، جو بڑی تشویش اور فکر کی بات ہے۔

یہ قومی مزاج جو بہت کچھ انداز خطابت اور اپنی کوششوں کے جلد سے جلد نتائج حاصل کر لینے کے شوق کا نتیجہ ہے، ہندوستان کی جیسی پیچیدہ صورت حال میں مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش کا سبب بن گیا ہے، ان کے لئے کسی ادارہ کا زیادہ دن تک چلانا کسی محاذ پر زیادہ دیر تک کوشش کرنا مشکل ہو گیا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ جو ادارے انھوں نے ایک صدی یا نصف صدی پہلے قائم کئے تھے، ان میں سے اکثر اسی حالت میں باقی ہیں یا انتشار و بے توجہی کا شکار ہیں، اس کے مقابلہ میں اکثریت کے بالعموم اور متعدد اقلیتی فرقوں کے تعلیمی ادارے اس سے بہت قلیل عرصہ میں کہیں سے کہیں پہونچ گئے ہیں، اور اپنے معیار تعلیم، عمارتوں کی تکمیل اور اتحاد و تعاون کے ساتھ کام کرنے میں دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں، یہ اس ذہنی کیفیت اور ملّی مزاج کا فرق اور اس قیادت و جوش خطابت کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کا شعار اور مایۂ افتخار بن گیا ہے۔

۱۰۔ تعاون اور اعتماد کی کمی، اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کی ترجیح اور کردار کُشی

قومی زوال کی علامتوں میں ایک تشویشناک علامت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعی و ملی کاموں کو باہم دگر تعاون اور جذبۂ اعتماد کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت روز بروز مفقود ہوتی جارہی ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کے عظیم سے عظیم تر ادارے (خواہ وہ تعلیمی ادارے ہوں یا رفاہی تنظیمات) موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ان کی کشتی طوفان سے ہر وقت اس طرح دوچار رہتی ہے کہ

معلوم ہوتا ہے اب ڈوبی تب ڈوبی، اس کا بڑا سبب (اکثریتی فرقے کے برخلاف) ان اداروں کے سربراہوں کی دیانت و خلوص اور انتظامی صلاحیت پر اعتماد کی کمی ہے، اور ان کے ہر اقدام اور فیصلہ کو شک شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کی عادت اور اس اسکی توقع اور مطالبہ ہے کہ ہر ایک کو مطمئن اور راضی کریں، اور سرپرستوں، سیاسی رہنماؤں اور بااثر افراد کی خواہش و مفادات پر ادارہ کے مصالح اور مفادات کو بے تکلف قربان کردیں۔

بعض اوقات ان بااثر لوگوں میں سے اگر کسی کی ادنٰی خواہش کی تکمیل نہیں کی جاتی تو وہ اس ادارہ کی اینٹ سے اینٹ بجادینے اور ملت کو بڑے سے بڑے بیش قیمت اثاثہ سے بھی محروم کردینے سے بھی احتراز نہیں کرتا، قومی زوال کی ابتدائی وواضح علامتوں میں سے ایک علامت ملّی اداروں کے چلانے کی صلاحیت کا فقدان ہے، جس میں سب سے زیادہ اعتماد باہمی، جذبۂ تعاون اور کسی حد تک ایثار و قربانی اور تحمل و ضبط نفس کی ضرورت ہے، اگر کسی ادارہ کو خوش قسمتی سے کوئی مخلص کارگزار و کارکن مل گیا، لیکن وہ تمام قومی نمائندوں، طلبہ کے سرپرستوں اور کمیٹی کے ارکان کو بیک وقت مطمئن نہیں کرسکا اور اس کو ادارہ کے مفاد میں کچھ اصلاحی قدم اٹھانے پڑے تو اس کی تمام خوبیوں، خلوص و دیانت پر پانی پھیر دیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جاتی۔

نہ صرف ادارہ کے ذمہ داروں بلکہ ملت کے عام قائدین اور خدمت گزاروں کے بارے میں ملت کا دہرا معیار ہے، اپنے لئے ہر طرح کی گنجائش، ہر چیز کا جواز اور توسع، لیکن ذمہ داروں، قائدین سے حضرت فاروق اعظمؓ کا نہیں تو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے زہد و ورع اور طرز زندگی کا مطالبہ۔ ایک اردو محاورہ

کے مطابق اپنے لئے "**بخشش سوسو**" اور خادمین ملت کے معاملہ میں "**حساب جوجو**" اس طرز فکر اور طرز عمل نے اداروں اور تعمیری کوششوں کو بھی ہر وقت خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے اور ملت کی خدمت کے آرزومندوں کو بھی کسی ذمہ داری کے قبول کرنے کے بارے میں سو مرتبہ غور کرنے اور تمام عواقب و نتائج اور پچھلے کارکنوں کے انجام کو دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

بات صرف بے اعتمادی، خوردہ گیری اور احتساب کی شدت تک محدود نہیں ہے، افتراء، اتہام اور کردار کشی (CHARACTER ASSASINA-TION) تک پہونچ گئی ہے، کسی ملی رہنما، سیاسی قائد اور دینی شخصیت کے بارے میں راہ چلتے بھی سن لیا جائے تو بات کا بتنگڑ، اور رائی کا پربت بنا لیا جاتا ہے، اور کڑی سے کڑی ملا کر ایک داستان وضع کر لی جاتی ہے، جس کی ساری بنیاد قیاس آرائی، سیاسی مقصد بر آری یا صحافتی گرمی محفل پر ہوتی ہے، اس کا سلسلہ تحریک خلافت کے محبوب و جانباز رہنماؤں سے شروع ہو کر جنھوں نے اپنی پوری زندگی ملت کے لئے قربان کر دی، علاقائی رہنماؤں، سماجی کارکنوں اور دینی شخصیتوں تک مسلسل چلا آرہا ہے، اور اس صورت حال پر سوداؔ کا شعر صادق آتا ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

لیکن اکثریتی فرقہ کا اپنے رہنماؤں اور قومی کارکنوں کے بارے میں طرز عمل واضح طور پر اس سے مختلف ہے، اپنی دوسری کمزوریوں کے باوجود اس بارے میں وہ نمایاں طور پر محتاط، فراخ دل، وسیع النظر اور نتائج کا انتظار کرنے والے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کے قومی رہنماؤں اور سماجی کارکنوں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل

کا پورا موقعہ ملتا ہے، اور وہ ان کو بام عروج تک پہونچاتے ہیں، اور ان کی قوم ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتی اور ان کی شکر گزار ہوتی ہے، سیاسی تحریکات کے رہنماؤں سے لیکر قومی یونیورسیٹیوں کے بانیوں اور اصلاحی مرکزوں، آشرموں کے بانیوں سے لے کر فرقہ پرست جماعتوں احیائیت (REVIALISM) کے داعیوں تک یہ کلیہ عام ہے، اس قومی تفاوت پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

دیکھ مسجد میں شکستہ رشتۂ تسبیح شیخ   بت کدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

۱۱۔ ماحول کو مانوس و متاثر اور ہم وطنوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متعارف کرنے کی کوشش کا فقدان

مسلمانانِ ہند کی ایک بڑی کمزوری، کوتاہ اندیشی اور عواقب سے چشم پوشی یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول کو (جس کا غالب عنصر نہ صرف ان سے مذہبی اختلاف رکھتا ہے بلکہ بہت سے تاریخی اور سیاسی اسباب کی بنا پر بدگمانی اور خوف میں مبتلا ہے) اپنے سے مانوس اور اپنے دین کے اصولوں اور بنیادوں، اپنے دینی پیشوا کی سیرت اور اپنی تاریخ کی عظیم شخصیتوں سے روشناس کرنے اور اس ملک میں آنے کے بعد انھوں نے جو تعمیری و انتظامی کردار ادا کیا، اس ملک و معاشرہ کو جو تحائف دیئے، اور اب بھی ان کا وجود ملکی سطح پر جو کردار ادا کر سکتا ہے اس کے واقف کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی کہ وہ اپنی دینی تعلیمات کی بنا پر اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اب بھی سیرت و اخلاق کے کون سے امتیازی پہلو رکھتے ہیں، اور ان سے کام لے کر ملک کے تیزی کے ساتھ گرتے ہوئے سماج کو مہیب زوال سے بچایا جا سکتا ہے، ان کے اخلاق اور سیرت کی خوشبو عام معاشرہ میں نہیں پہونچی، غیر مسلم بھائیوں نے مسلمانوں کو سیاسی میدان میں دیکھا یا انتخابی معرکہ (الیکشن) کے موقعہ پر

یاباز اروں، دفتروں میں اور وہاں ان کو کوئی بڑا امتیاز نظر نہیں آیا، عام طور پر غیر مسلم اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں، اور اس کا ثبوت برابر ملتا رہتا ہے، وہ مسلمانوں سے متعلق اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان ختنہ کراتا ہے، گائے کا گوشت کھانا ضروری سمجھتا ہے، اور کچھ بات ہو جائے تو اسے بڑی جلدی غصہ آجاتا ہے، مسجد کے سامنے دوسروں کا باجہ نہیں سن سکتا، چاہے خود بجائے، ہم ابھی تک انھیں اذان کا مطلب تک نہیں سمجھا سکے جو پانچوں وقت (اکثر جگہ لاوڈاسپیکر سے) ہوتی ہے۔

اس بے خبری اور منافرت میں (جو ملک کے لئے بھی سخت مضر ہے) ہماری ہم وطنوں کی غفلت اور احساس برتری کا بھی دخل ہے، فرقہ پرست رہنماؤں کا بھی قصور ہے، سیاسی الیکشنی نظام کا بھی عیب ہے، تعلیمی نصاب اور کورس کی کتابوں کی بھی ذمہ داری ہے لیکن اس وقت ہمارے مخاطب مسلمان ہیں، ہم نے اپنے ہم وطنوں کو اپنے سے مانوس اور اسلام سے متعارف نہیں کرایا، ایسا طرز زندگی ہم عمومی طور پر سامنے نہیں لائے جس میں کشش ہو اور جو اس دین اور اس انقلاب کے سرچشمہ سے واقفیت کا تجسّس (CURIOSITY) پیدا کرے، مطالعہ کا شوق یا کم سے کم پوچھنے اور غور کرنے پر آمادہ کرے۔

ماحول کو مانوس اور قریب کرنے کا عمل، اصول اور کردار کی کسی قربانی اپنے کسی شعار اور امتیاز سے دست برداری، سیاسی سودے بازی، اور ضمیر فروشی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، اس کے لئے صرف عملی نمونوں، اخلاقی پختگی و بلندی، تھوڑے سے ایثار و قربانی گہری اور عاقلانہ حب الوطنی، دانشمندانہ اور خود دارانہ اختلاط، باہم آمیزی سماجی و رفاہی کاموں میں نہ صرف شرکت بلکہ قائدانہ کردار ادا کرنے کی

سعی اور اس ملک کو اس مہیب اخلاقی زوال سے بچانے کی مخلصانہ کوشش کی ضرورت ہے جو بظاہر بالکل قریب آگیا ہے۔ اور جس سے صرف وہی ملت بچا سکتی ہے جو دولت کو مقصود حیات، اس زندگی ہی کو حقیقی زندگی، ذاتی مفاد ہی کو مقصود اصلی نہیں سمجھتی اور جس کے پاس ہزار خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود آسمانی تعلیمات کا سرمایہ، نبوت کا فیض اور ایمان کی رمق موجود ہے۔

یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے جس کے سمجھنے کے لئے بڑی ذہانت اور جس کے دیکھنے کے لئے کسی خاص بصیرت کی ضرورت نہیں کہ ملی استحکام کی ساری کوششوں، اعلیٰ تعلیمی اداروں، قومی سرمایوں، تصنیفی و تحقیقی سرگرمیوں اور ذہین ترین، فاضل ترین بلکہ ولی صفت انسانوں کی بکثرت موجودگی کے باوجود، اگر ماحول ناآشنا بلکہ متنفر و متوحش ہے تو فرقہ وارانہ تعصب کے جنون کی ایک لہر، نفرت کی ایک آندھی اور ہسٹریا کا ایک حملہ، گھنٹوں میں اس ساری صورت حال کو تبدیل کر سکتا ہے، اور سیکڑوں برس کی تعمیری کوششوں کو آن کی آن میں معدوم کر سکتا ہے، اور مختلف مقامات پر محدود پیمانہ پر ہونے والے فسادات نے اس کو بدیہی حقیقت بنا کر دکھا دیا ہے۔

اس لئے اس وقت سارے دینی اداروں، تعلیمی و دعوتی سرگرمیوں، کتب خانوں بلکہ مساجد و مدارس کی حفاظت اور عزت و ناموس کے تحفظ کی ضمانت وہ وسیع بیرونی آہنی حصار ہے، جس کے اندر یہ سب دینی مرکز، ملی اثاثہ اور عزت و ناموس محفوظ ہو، ماحول کا ضروری حد تک مانوس و آشنا ہونا، اس سارے اثاثہ کو قیمتی سمجھنا جو ملک ہی کا سرمایہ ہے۔ اور ملت اسلامیہ کی افادیت و ضرورت کا اعتراف ضروری ہے۔

پھر ان ساری کوششوں اور مشغولیتوں کے جاری رہنے اور پایۂ تکمیل کو

پہونچنے، کسی ادارہ کو قائم کرنے اس کو ترقی دینے، اپنی بات دوسروں تک پہونچانے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ملک میں معتدل و پر سکون (NORMAL) حالات ہوں، بات کرنے، اپنی بات سنانے اور سننے والے اس کو اطمنان کے ساتھ سننے اور سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے موڈ میں ہوں اگر بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، اور موسلادھار بارش، کسی پر سکون محفل یا پُر مسرت تقریب کو درہم برہم کر سکتی ہے اور کسی جلسہ میں جہاں سحر انگیز مقرر تقریر کر رہے ہیں کسی سانپ کا نکل آنا، یا کسی دیوانہ کتے کا آجانا (محبوب و محترم قائدین اور قابو یافتہ منتظمین کی ہزار کوششوں کے باوجود) جلسہ کی بساط الٹ دے اور کسی طرح لوگوں کو بیٹھنے پر آمادہ نہ کر سکے تو ایک مطعون اقلیت اس انتشار انگیز فضا میں اور طویل المیعاد تعمیری کوششیں ایک ہیجانی اور طوفانی فضا میں کیسے باقی رہ سکتی ہیں۔

۱۲۔ملک کے حالات کے جائزہ اور حقائق پر گہری نظر کی ضرورت

پھر صرف ماحول کا مانوس اور متعارف ہونا کافی نہیں، ضرورت ہے کہ خود مسلمان بھی زندگی کے حقائق، ملک کے حالات اور ماحول کے تقاضوں سے باخبر و روشناس رہیں، مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں مسلمانوں نے سب کچھ کیا لیکن زندگی کے حقائق سے روشناس نہیں ہوئے، اور اس ماحول میں اپنے قائدانہ فرائض انجام دینے کی کوشش نہیں کی، انھوں نے ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے، اور ان کو اگل کر باہر پھینک دیا، اس لئے کہ انھوں نے اپنی

جگہ نہیں بنائی تھی، اگر مسلمانوں نے زندگی کے حقائق سے آنکھیں بند رکھیں، ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، بدلتے ہوئے نظام تعلیم، زبان ورسم الخط، عوام کے دل ودماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات، ذرائع لبلاغ اور ملکی پریس کی طرف سے روزانہ دی جانے والی خوراک سے انھوں نے آنکھیں بند رکھیں تو قیادت الگ رہی (جو خیر امت کا فرض منصبی ہے) ملی وجود کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی، اور ان کی آئندہ نسل ذہنی ارتدار وانتشار کا نہیں بلکہ (خاکم بدہن) اعتقادی ودینی ارتداد کا بھی لقمۂ تر بننے سے محفوظ نہیں رہے گی۔

آخری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت طریقہ پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں، اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کریں، جو عرصۂ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے، اور اب اس حد کو پہونچ گیا ہے کہ اس کی کشتی حیات ڈانواڈول ہو رہی ہے، کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت وضرورت اور بے لاگ وبے غرض دعوت وقیادت کے بغیر عزت واطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، اقبال نے صحیح کہا ہے ؎

زندگی جہد است استحقاق نیست

اور سب سے بڑھ کر قرآن مجید کا واضح اعلان ہے جس کی تصدیق پوری تاریخ انسانی کرتی ہے :۔

فأما الزبد فيذهب جفاء ، واما ما ينفع الناس فيمكث فى الأرض، كذالك يضرب الله الأمثال (سورۃالرعد ۔۱۷) سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے وہ (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہونچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے، اس طرح خدا (صحیح اور غلط کی) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ سمجھو)

(إن من البيان لسحرا)

خطباتِ مفکرِ اسلام

﴿حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ علی ندوی﴾

(متعدد جلدوں میں)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ علی ندوی نے دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی خطابت کے جوہر دکھائے ہیں، حضرت کی تقریریں وقتاً فوقتاً رسائل، جرائد، اخبارات اور پمفلٹ کی شکل میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں، اور امت کے افراد اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں، ان خطبات کی افادیت میں اضافہ اور ان کو عام کرنے کی غرض سے **مولانا محمد کاظم صاحب ندوی** نے مرتب کرکے متعدد جلدوں میں شائع کرالیا ہے۔

عمدہ کاغذ، کمپیوٹر کی کتابت، اور خوبصورت سرورق۔ آج ہی "**خطباتِ مفکرؒ اسلام**" کی ساری جلدیں طلب کریں : تاجروں اور عام خریداروں کو رعایت دی جاتی ہے۔

ملنے کا پتہ: ۔ مکتبہ ایوب کاکوری لکھنؤ ۲۲۶۰۱۷

(إن من البيان لسحرا)

خطباتِ ابرار

﴿محی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دام مجدہ ہردوئی﴾

محی السنۃ عارف باللہ حضرت **مولانا ابرارالحق** صاحب (اطال اللہ بقاءہ طول حیاتی) نے بھی ہندوستان کے متعدد مقامات پر اپنی خطابت کے جوہر دکھائے ہیں، اور اپنی شیریں بیانی، اور پندو نصیحت کے ذریعہ لوگوں کے دل جیت لئے ہیں۔

حضرت کی ان متعدد مقامات پر کی گئی تقریروں کو **مولانا محمد کاظم** صاحب ندوی نے جمع کر کے ایک وقیع کتابی شکل میں شائع کرایا ہے۔

عمدہ کاغذ، کمپیوٹر کی کتابت اور خوبصورت گردوپوش، تاجروں اور عام خریداروں کے لئے رعایت کی جائے گی۔

ملنے کا پتہ:۔

مکتبہ ایوب کاکوری لکھنؤ ۲۲۷۱۰۷

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

☆ خطباتِ مفکر اسلام اول، دوم، سوم، چہارم
☆ مقالاتِ مفکر اسلام اول، دوم
☆ خطبات مدراس (معیاری ایڈیشن)
☆ مشاہیر کی شاہکار تحریریں
☆ خطباتِ ابرار (مولانا ابرار الحق صاحب)
☆ تقریر کیسے کریں؟ اول، دوم
سوم، چہارم، پنجم
☆ آسان تقریریں اول، دوم، سوم، چہارم
☆ جدید دینی تقریریں اول، دوم
☆ تبلیغی واصلاحی تقریریں
☆ بے نظیر تقریریں
☆ سیرت حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی
☆ عورت اسلام سے پہلے اور اسلام میں
(ایک تقابلی مطالعہ)
☆ اسلام کے چار رکن
☆ حقوق والدین (پانچواں ایڈیشن زیر طبع)
☆ حقوق زوجین
☆ پڑوسی کے حقوق
☆ دس جنتی
☆ رسول اکرم ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد

☆ آداب السلام
☆ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی شرعی حیثیت
☆ داڑھی کی حقیقت
☆ مساجد اور اسلام
☆ نماز کیسے پڑھیں؟ (اردو کتابی سائز)
☆ " (ہندی پاکٹ سائز)
☆ مولانا محمد علی جوہر کی آخری تقریر
☆ تجارت اور اسلام
☆ یہ تھیں امت مسلمہ کی مائیں
☆ فردوس، زمزمہ نعت، عقیدت کے پھول (نعتیہ مجموعے)

عربی تقریر کی کتب

☆ کیف تکون خطیبا؟ اول، دوم
☆ الخطب الدینیۃ اول، دوم
☆ کن خطیبا! اول، دوم

سوانح مفکرِ اسلام
حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی
ہم سے طلب کریں۔
Rs. 130/=

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ایوب کاکوری لکھنؤ ۲۲۷۱۰۷